فقہی مسائل معاصر علماء کی تحقیق میں

سید کلیم اللہ حرمزئی

مدرس : دارالعلوم حرمزی

انتساب

اپنے محترم والدین اور

اساتذہ کرام کے نام جن کے

آغوش میں بندہ علمی سفر کی

طرف گامزن ہوا ہے۔

فہرست مقالات

- ❖ صحت کی خاطر میچ کھیلنا
- ❖ دماغی راحت اور تفریح کی خاطر میچ دیکھنا
- ❖ انٹرفیس کا شرعی حکم
- ❖ جیتنے والی ٹیم کو ٹرافی دینا
- ❖ میچ کی جیت کے لیے نفل نماز یا دعا پڑھنا
- ❖ میچ کی جیت کو اسلام کی عزت سمجھنا
- ❖ ذھنی (غیر جسمانی) کھیل کھیلنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کھیل صحت کے لیے ایک بہترین ورزش ہے اور ڈاکٹرز حضرات ورزش کی ہدایت دیتے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے: کہ کھیلوں سے پیار منشیات سے انکار۔ اب پوچھنا یہ ہے:

- صحت کی خاطر میچ کھیلنا کیسا ہے؟
- ذھنی تفریح کے لیے میچ دیکھنا کیسا ہے؟
- انٹر فیس کا کیا حکم ہے؟
- جیتنے والی ٹیم (winner team) کو انعام دینا اور ہارنے والی ٹیم (Runner team) کو ٹرافی نہ دینے کا حکم۔
- میچ جیتنے اور ہارنے پر شرط لگانا۔
- اپنے ملک کی ٹیم کی جیت کے لیے نفل نماز پڑھنا اور یا دعا کرنا کیسا ہے؟
- اس جیت کو اسلام کے لیے عزت قرار دینا کیسا ہے؟
- ایسا کھیل کھیلنا کیسا ہے، جس میں صرف ذہن اور دماغ استعمال ہوتا ہو؟

الجواب حامداومصلیا

ورزش صحت کے لیے بہترین علاج ہے، اس سے جسم کی نشونما ہوتی ہے، اس سے چہرہ نکھر جاتا ہے، خون کی لطافت اور صفائی حاصل ہوتی ہے، فاضل رطوبات بدن سے خارج ہونے لگتی ہیں، بسا اوقات وہ فاسد رطوبات منجمد ہو کر کینسر جیسے خطرناک اور مہلک مرض کا پیشہ خیمہ ثابت ہوتی ہیں، صحت ایک بڑی نعمت ہے، اس کو برقرار رکھنے کے لیے ورزش جز لازم ہے۔ الغرض ورزش کے بغیر جسم مرجھا ہوا ہوتا ہے۔ شریعت نے کھانے کے بعد چھل قدمی کا جو حکم دیا ہے، یہ بھی ورزش کی ایک نوع ہے۔ ورزش کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ پیدل دوڑ، گھوڑدوڑ، نشانہ بازی، تیراندازی، فٹبال، والی بال، ٹیبل ٹینس کراٹے، باکسنگ، تیراکی اور کرکٹ وغیرہ شریعت میں ہر وہ ورزش ممدوح ہے، جس سے بدن کے اعضاء استعمال ہوتے ہوں۔

جسمانی کھیل چاہیے جو بھی ہو، اس میں حصہ لینا، دیکھنا ممنوع نہیں ہے۔ بشرطیکہ :

- ✓ کھیل میں دینی یا دینوی منفعت ہو۔
- ✓ نماز کا اہتمام ہو۔
- ✓ ستر کھلا ہوا نہ ہو۔

- ✓ دوران کھیل گانے، نغمے اور سرود نہ ہو۔
- ✓ کھیل میں اتنا غلو نہ جس سے شرعی امور میں غفلت اور کوتاہی پیدا ہوں۔
- ✓ حقوق العباد میں کوتاہی واقع نہ ہوتی ہوں۔
- ✓ انٹر فیس اس شرط پر نہ ہو کہ جیت کی صورت میں سب رقم تمہیں ملے گی۔
- ✓ کھیل جسمانی ہو، ایسا گیم نہ ہو، جس میں محض دماغی تھکاوٹ ہو۔
- ✓ محض کھیل کو مقصد حیات نہ بنائے۔

مسئولہ صورتوں کے جوابات:

- ایسی حالات میں خود کھیلنا اور تفریح کی خاطر دیکھنا دونوں درست ہے۔
- انتظامی امور کی خاطر فیس لینا درست ہے، مثلا: منتظمہ کمیٹی کی طرف سے انٹر فیس لازمی ہو اور وہ ان فیسوں کو انتظامی امور پر خرچ کرتی ہوں۔ مثلا: میدان کی صفائی، کھلاڑیوں کو کھلانا اور پلانا وغیرہ۔ اسی طرح انتظامیہ کا اپنی طرف سے جیتنے والی ٹیم کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کوئی انعام یا ٹرافی دینا۔

یاد رہے:

انتظامیہ کی طرف سے یہ صاف کہہ دیا گیا ہو، کہ ٹرافی ہماری طرف سے اعزازی ہے، چاہیے ہم آپ کی فیسوں سے خرید کر دیدیں، یا کسی مہمان خصوصی کی طرف سے دی ہوئی رقم سے تمہیں ٹرافی خرید کر دیدیں اور کھلاڑیوں کی طرف سے باقاعدہ کمیٹی والے فیسوں کے مالک بنے اور یا یہ مشہور ہو کہ انٹر فیس کمیٹی کے حوالہ ہے، جیتنے یا ہارنے والی ٹیم اس میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتی ہے۔ ورنہ اگر یہ طے ہوا: کہ انٹر فیس انتظامیہ کمیٹی کے حوالہ ہے، وہ ان فیسوں سے کچھ رقم انتظامی امور (میدان کی صفائی، مہمانوں اور کھلاڑیوں کی خدمت وغیرہ) میں صرف کرے گی اور بقایا رقم انعام یا ٹرافی کی صورت میں جیتنے والی ٹیم کو دے گی، تو یہ بہر حال جوا اور قمار ہے، چاہے کمیٹی والے ساری جمع رقم جیتنے والی ٹیم کو دیدے اور یا کچھ کم کرے، کیونکہ اپنی ہی رقم جمع کرنے کی صورت میں زیادہ ملنا، یہ نہ ملنا اور یا کم ملنا ہی جوا ہے۔

- البتہ یہ شرط لگانا کہ: انٹر فیس ہر ٹیم آدا کرے گی اور جیتنے کی صورت میں انعام کی مد میں وہ رقم ملے گی۔ یہ قمار اور جوا ہے۔
- اسی طرح جیت اور ہار پر شرط لگانا بھی قمار اور جوا ہے۔

- آج کل مذکورہ بالاشرائط کا وجود ممتنع نہیں ،تو مشکل ضرور ہیں ، کھلاڑی نمازوں کا اہتمام نہیں کرتے ہیں ،غیر شرعی شکل اور لباس اپناتے ہیں ،سیلفی بنانے میں تصویر کشی کا ارتکاب کرتے ہیں ، میچ دیکھنے میں مرد وزن کا اختلاط ہوتا ہے ،ان کے جیتنے پر ناچ گانے ہوتے ہیں ،لوگ سڑکوں پر نکل کر ہوائی فائرنگ کرتے ہیں ،جس سے بسا اوقات انسانی جانوں کا ضیاع بھی ہوتا ہے ،کچھ کھلاڑی سٹہ بازی میں ملوث ہوتے ہیں ،جن کو باقاعدہ عدالتوں نے سزائیں سنائی ہیں۔
- دعا تو عبادت کا مغز ہے ،کوئی چیز عبادت ہو ،تو اس کی قبولیت کی دعا کرنی چاہیے۔
- اور اگر تمام شرائط شرعیہ کے ساتھ کوئی کھیل ہو ،تب بھی دعا مناسب نہیں ہے ،کیونکہ دعا صحت کے لیے تو ثابت ہے ،مگر کھیل کے لیے نہیں۔
- اور یہ کہنا کہ اس سے اسلام کو عزت ملے گی۔ بالکل بے جا ہے ، یہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ مقولہ چسپاں کرنا بہتر ہے ،جس میں انہوں نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جوابا فرمایا :

''نحن قوم اعزنا الله بالاسلام ،فمهما ابتغينا العزة فى غيره اذلنا الله۔''

دماغی (ذہنی) گیم کھیلنا :

کھیل جسمانی ہو ایسا ذہنی گیم نہ ہو ،جس سے دماغی تھکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔

یاد رہے :

یہ شرط اس لیے لکھی گئی ،تاکہ کھیل کا اصل مقصد واضح ہو کہ اس سے جسم تندرست ہو ،صحت برقرار ہو ،تاکہ دینی امور کی آدائیگی دلچسپی اور شوق کے ساتھ ہو۔اب اگر محض ذہن سے تعلق رکھنے والا گیم ہو ،تو اس کی دو صورتیں بنتی ہیں

- ❖ جس سے ذہنی تھکاوٹ پیدا ہو۔ جیسے : لڈو کھیلنا۔اس گیم میں ذہن استعمال کرنا پڑتا ہے ،بسا اوقات انسان اس میں اتنا منہمک اور متوجہ ہوتا ہے ،کہ اس سے دماغی بوجھ اور پریشر پیدا ہوتا ہے۔اس وقت کوئی بھی ایسا کھیل کھیلنا مکروہ تحریمی ہے ،جس سے دماغ بوجھل ہوتا ہو ،اس کو دوسری طرف دہیان ہی نہ ہو ،بلکہ ساری دماغی توجہ کھیل پر مرکوز ہو۔اور شرط مقرر کرنے کی صورت میں حرام ہوتا ہے۔
- ❖ ایسا دماغی کھیل کہ اس میں ذہن زیادہ استعمال نہ ہوتا ہو ،تو اس کے کھیلنے کی گنجائش مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ہے۔

مثلا : یہی لڈو ہے اس کے کناروں پر دیا ہوا ایک کھیل جو چھوٹے ڈبوں کی شکل میں ہے ،جس میں سوتک گنتی لکھی ہوئی ہے ،اسے دماغ زیادہ نہیں تھکتاہے ،بلکہ ایک گونہ تفریح ہوتی ہے ،کیونکہ وہاں سو (100)تک پہونچنا ہوتاہے۔
اسی طرح لڈو کی دوسری طرف بھی ایک کھیل ہے ،جس میں صرف سبقت اور پہل مقصود ہوتاہے ،وہاں بھی گنتی لکھی ہوئی ہے اوراس میں سیڑھیوں کے نشان لگاکرایک پیچ دیاگیاہے کہ یہاں پہنچنے پرآپ ایک دم ترقی کرسکیں گے۔البتہ وہاں سانپ کی تصویر ذی روح ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔
حضرت شیخ الہندؒ کا معمول :
خود تولہوولعب میں مصروف نہیں ہوئے ،بلکہ اگر کوئی اور شخص بھی لہوولعب میں مصروف ہوتو اس سے بھی اعراض کرتے۔

(ماخوذ از فتاوی مفتی محمود : باب الحظر والاباحہ)

’’فالضابط فی ھذا۔۔ان اللھوالمجرد الذی لاطائل تحتہ ،ولیس لہ غرض صحیح مفیدفی المعاش ولاالمعاد حرام ،او مکروہ تحریما۔۔وماکان فیہ غرض ومصلحۃ دینیۃ اودنیویۃ فان ورد النہی عنہ من الکتاب اوالسنۃ ۔۔۔کان حراما اومکرھاتحریما۔۔واما مالم یرد فیہ النہی عن الشارع،وفیہ فائدۃ ومصلحۃ للناس فہوبالنظر الفقہی علی نوعین :
الاول :ماشہدت التجربۃ بان ضررہ اعظم من نفعہ ومفاسدہ اغلب علی منافعہ او انہ من اشتغل بہ الھاہ عن ذکراللہ وحدہ وعن الصلاۃ والمساجد،التحق ذلک بالمنہی عنہ ؛لاشتراک العلۃ ،فکان حراما اومکروھاوالثانی:مالیس کذالک ،فہوایضا ان اشتغل بہ لتحصیل تلک المنفعۃ وبنیۃ استجلاب المنفعۃ فہومباح ،بل قدیرتقی الی درجۃ الاستحباب ،او اعظم منہ ۔۔وعلی ھذا الاصل:فالالعاب التی یقصدبھا ریاضۃ الابدان والاذھان جائزۃ فی نفسھامالم یشمل علیٰ معصیۃ اخری ،ومالم یودالانہماک فیھا الی الاخلال بواجب الانسان فی دینہ ودنیاہ ۔‘‘

(تکملۃ فتح الملہم :ج ۴ ،ص ۴۳۵ ،ط: دارالعلوم کراچی)

’’۔۔۔لانہ نوع لعب یصدعن ذکراللہ،وعن الجمع والجماعات،فیکون حراما؛لقولہ علیہ السلام:ماالھاک عن ذکراللہ فھومیسر۔ثم ان قامربہ تسقط عدالتہ،وان لم یقامر،لاتسقط؛لانہ متاول فیہ۔‘‘

(الھدایۃ:ج۴،ص ۳۷۸ ،ط:اسلامی کتب خانہ کراچی)

’’وکرہ تحریما اللعب بالنرد ،وکذاالشطرنج۔۔۔وھذا اذالم یقامر،ولم یداوم،ولم یخل بواجب ،والافحرام بالاجماع۔‘‘

(الفتاوی الشامیۃ:ج۶،ص۳۹۴ ،ط:ایچ ایم سعید)

<u>**خلاصہ کے طورپر :**</u> جن کھیلوں سے شریعت میں صریح طورممانعت آئی ہوں،ان کا کھیلنادرست نہیں ہے۔ جیسے : نردشیر۔حدیث کے مفہوم کے مطابق جس نے نردشیر کھیلا،اس نے گویا اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اورخون سے آلودہ کیا۔اور جن کھیلوں کی ممانعت نص سے ثابت نہ ہو،اس میں جسمانی اورذھنی ورزش ہو،تو درست ہے ،بلکہ بسا اوقات ایساورزش نیکیوں کا ذریعہ بن کر باعث اجر اور ثواب بنتاہے۔اوراگر محض ذھنی تھکاوٹ ہو،تومکروہ

تحریمی ہے اور اگر تھکاوٹ پیدا نہ ہوتی ہوں'تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ جائز ہے 'البتہ لایعنی کام ہونے کی وجہ سے خلاف اولیٰ ضرور ہے۔

یادرہے:

اسی بنیاد پر (جن کھیلوں کا شریعت میں ممانعت مذکورہوں) بعض علمائے کرام نے کیرم بورڈ اور سنوکر وغیرہ کو نرد شیر سے مشابہت کی وجہ سے مطلقا مکروہ کہاہیں۔'ان کا کہناہے کہ نرد کا عربی زبان میں معنی ''لعبۃ الطاولۃ ''ہے ۔یعنی وہ کھیل جو لکڑی کے تختے پر کھیلا جائے۔

(واللہ اعلم بالصواب۔)

والحجۃ علیٰ ماقلناہ:

''تجوز المسابقة على الأقدام والخيل والبغال والحمير والإبل وبالرمي، فإن شرط فيه جعل من أحد الجانبين أو من ثالث لأسبقهما فهو جائز، وإن شرط من الجانبين فهو قمار إلا أن يكون بينهما محلل بفرس كفؤلفرسيهما يتوهم سبقه لهما إن سبقهما أخذ منهما، وإن سبقاه لم يعطهما، وفيما بينهما أيهما سبق أخذ من صاحبه، وعلى هذا التفصيل إذا اختلف فقيهان في مسألة وأرادا الرجوع إلى شيخ وجعلا على ذلك جعلاً.''

(الاختيارلتعليل المختار:فصل :فی الكسب:ج1،ص 49)

''قال لجماعة من الفرسان أو لاثنين من سبق منكم فله كذا أو إن سبق فلا شيء عليه فمن سبق جعل له خطر وكذا إذا قال لجماعة من الرماة إلى الهدف من أصاب منكم الهدف فله كذا لأن هذا تحريض لهم على فعل هو سبب الجهاد في الجملة ----
والثاني أن يسابق رجلان أو يسابق جماعة في السهام أو في الفرس أو المشي بالقدم وقال لصاحبه إن سبقتني فلك كذا وإن سبقتك فلا شيء عليك فهذا مباح لأن الخطر فيه من أحد الجانبين
والثالث إن كان الخطر من الاثنين أو من الجماعة ومعهم محلل يأخذ خطرهم إن سبق ولا يغرم وإنه سبق فهذا جائز۔
الرابع أن يكون الخطر من كل واحد على أنه إن سبق فله الخطر وإن سبق فيغرم لصاحبه مثله فهذا لا يجوز لأن هذا من باب القمار وإن حرام ۔''

(تحفة الفقهاء،كتاب السبق:ج3،ص 348)

''قال محمد: إذا جعل السبق واحدًا، وقال: إن سبقتني فلك كذا، ولم يقل: إن سبقتُك فعليك كذا: فلا بأس.
فالمكروه من ذلك أن يقول: إن سبقتُك فعليك كذا، وإن سبقتني فعلي كذا.
قال محمد: وإن كان الذي يجعل السبق رجل سوى المتسابقين، فيقول: أيكما يسبق فله كذا، كنحو ما يصنع الأمراء، فلا بأس به.وإن كان بينهما محلِّلٌ يسبق، ويُسبق: فلا بأس.
قال محمد: والمحلِّل أن يُدخلا معهما ثالثًا، إن سبق أخذ، وإن لم يسبق لم يغرم شيئًا.

قال أحمد: الأصل في ذلك أنه متى كان شرط المتسابقين: أنه إن سبق أخذ، وإن سبق أعطى، وليس معهما غيرهما: فهذا قمارٌ لا يجوز.وإن كان فيما بينهما: من إن سبق أخذ، وإن سُبق لم يُعط: فهذا جائز، ليس بقمار. ووجه ثالث: وهو أن يكون المسبق غيرهما، ويكون الغرم عليه خاصة دون المتسابقين، فهذا جائز.
والدليل على صحة هذا الأصل: ما روى سفيان بن حسين وسعيد بن بشير عن الزهري عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة عن النبي عليه الصلاة والسلام قال: "من أدخل فرسًا بين فرسين، وهو لا يؤمن أن يُسبق: فليس بقمار، ومن أدخل فرسًا بين فرسين، وقد أَمِنَ أن يُسبق: فهو قمار".
فاستفدنا من هذا الحديث أنَّ المتسابقين متى شرطا الغُرْمَ على كل واحد منهما، ولم يكن فيما بينهما من لا غرُم عليه: فهو قمار.وأنه متى كان بينهما من لا يَغرم شيئًا إذا سُبِق، ويأخذ إذا سَبَق: جاز السبق بينهم جميعًا على الشرط، ولم يكن بقمار؛ لأنه قال عليه الصلاة والسلام: "إن دخل بينهما من قد أمن أن يُسبق: فهو قمار".
ولأن من لا يسبق بحال، فوجوده وعدمه سواء، فسقط حكمه، كأنه لم يدخل، فيحصل حينئذ السبق على الآخرين، وكل واحد منهما مشروط عليه الغرم، فهو قمار، كما قال عليه الصلاة والسلام.وأما إذا كان المسبق غيرهما فهو جائز؛ لأنه لا غرم على واحد من المتسابقين.''

(شرح مختصر الطحاوی للجصاص،کتاب السبق:ج7،ص371)

عربی عبارتوں سے یہ بات واضح ہوگئی :

- کہ کسی ادارے کا اپنی طرف سے دلجوئی اور حوصلہ افزائی کی خاطر انعام دینے کا اعلان کرنا درست ہے۔
- دو گروپوں نے مقابلہ میں حصہ لیا اور طے یہ پایا : اگرایک نے جیتا' توانعام ملے گا اور دوسرے کے جیتنے پر کوئی انعام نہ ہوگا۔

یعنی ایک طرف سے انعام دینااور دوسری طرف سے انعام نہ لینے کی شرط درست ہے۔

- دو گروپوں کے درمیان ایک تیسرے گروپ نے اس شرط پر مقابلہ میں حصہ لیا' کہ اگرہم جیتے 'توانعام لیں گے 'تم میں سے جو بھی جیتے انہیں ہماری طرف سے انعام نہیں ملے گا البتہ تم دونوں جماعتیں آپس میں مقرر کیا ہوا انعام ایک دوسری سے لے سکتی ہوں۔ یہ صورت بھی درست ہے۔
- دو گروپوں نے دونوں طرف سے شرط لگائی 'کہ جو بھی جیتا' رقم انہیں ملے گی۔ یہ جوا اور قمار ہے۔

واضح رہے :

عام طور عربی کتابوں میں جن کھیلوں میں مسابقت کا ذکر ہے 'ان میں فٹبال وغیرہ نہیں ہیں 'البتہ معاصر علمائے کرام نے ہر جسمانی کھیل کو ان مخصوص کھیلوں پر قیاس کیا ہیں ۔اسی طرح نرد شیر کے متعلق بھی سوال ہوسکتاہے 'کہ اگر یہ کھیل تمام مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ ہو'توکیا پھر بھی ممانعت ہوگی ؟اس حوالے سے اتنا کہاجاسکتاہے کہ احادیث مبارکہ میں جس کھیل کی ممانعت اپنے مخصوص نام کے ساتھ ہو 'وہاں تمام شرائط موجود ہونے کے باوجود بھی ظاہر حدیث پر عمل کرنا چاہیے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- سفیر کا کمیشن پر اجرت لینا
- حیلہ تملیک
- حیلہ تملیک کا مطلب
- مسجد کی زینت وارائش کا شرعی حکم
- سرمایہ دار محلّہ میں تملیک شدہ رقم
- مروجہ حیلہ تملیک کا متبادل
- ڈسٹری بیوٹر کی ایک صورت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علماء کرام مسائل ذیل کے بارے میں کیافرماتے ہیں:

- مداراس ومساجد یا مجاہدین کے سفراء کا چندہ کی رقم سے کھاناپینا، یااپنی فیصدی رقم اوریا تنخواہ وغیرہ لیناجائزہے، یانہیں ؟
- صدقات واجبہ کی تملیک کے بعدہر جگہ استعمال کرنادرست ہے، یاتملیک کے بعد بھی ضرورت کے مواقع کودیکھناضروری ہے؟نیزہر مسجد کے لیے حیلہ تملیک کرناجائزہے۔(مثلا: وہ مسجد جس کی ضروریات پوری ہوں، صرف تزئین وغیرہ کے لیے رقم درکار ہو، یاوہ مسجد جس کا اپنامحلّہ ،اپنی قوم ہواوران پر مسجد کی تعمیرلازم ہو) توایسی مساجد کے لیے صدقات واجبہ کی تملیک جائزہے ،یانہیں ؟

الجواب حامداومصليا

- سفیر طلباء کی طرف سے وکیل اورامین ہوگا۔
- سفیراور مہتمم طلباء اورزکوۃ دہندگان دونوں کی طرف سے وکیل ہوں گے، جمع شدہ رقم کی حیثیت بیت المال کی ہوگی۔

طلباء کی وکالت کرتے ہوئے زکوۃ دہندگان کی زکوۃ آداہوگی۔اگرچہ طلباء کو باقاعدہ نہ دیا جائے ،تب بھی مکمل قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے مالک کااختیار سلب شمار ہوگا۔معطین (صدقات دہندگان) کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں طلبہ اورآخذین کی طرف سے وکلاء ہیں۔لہٰذانہ اس پرزکوۃ واجب ہوگی اورنہ ہی معطیین زکوۃ واپس لے سکتے ہیں۔ طلبہ نے مہتمم کے اہتمام وانتظام اور قوانین کو تسلیم کرکے داخلہ لیاہے، گویایوں کہ دیاہے کہ آپ میرے وکیل ہے۔

(تفصیل کے لیے فتاوی خلیلیہ : ص ۳۱۹، بحوالہ فتاوی قاسمیہ : ج۱۱، ص۹۱)

(تفصیل کے لیے فتاویٰ محمودیہ۵۱۴/۹، بحوالہ فتاوی قاسمیہ : ج۱۱، ص۹۱)

(تفصیل کے لیے فتاوی خلیلیہ : ص ۱۵۴، بحوالہ فتاویٰ بینات : ج۲، ص۶۷۹)

(حضرت سہارنپوریؒ ، فتاویٰ خلیلیہ)

(کذا فی تذکرۃ الرشید : ص ۱۶۴، بحوالہ فتاوی قاسمیہ :۱۱/۱۹)

(تفصیل کے لیے فتاویٰ بینات : ج۲، ص۶۶۹)

سفیر کا کمیشن پر اجرت لینا:

کمیشن پر چندہ کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں :

* **اجرت من العمل:** اپنے نفس کے عمل پر اجرت لینا (قفیز الطحان کی طرح) درست نہیں ہے۔
* **عجز عن العمل:** یعنی جب تک دوسرا چندہ نہ دے گا، یہ خود حصول کرنے پر قادر نہیں ہے۔
* **جہالۃ الرقم:** کل چندہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اجرت فاسدہ ہے۔

(تفصیل کے لیے مسائل رفعت قاسمی : مسائل زکوۃ :)

(تفصیل کے لیے فتاوی مفتی محمود : ص۳۵۱، کتاب الزکوۃ)

(تفصیل کے لیے جامع الفتاوی : ج٦، ص۴۱۰)

"إذا وقع عقد الإجارة صحيحا على مدة أو مسافة وجب تسليم ما وقع عليه العقد دائما مدة الإجارة. كذا في المحيط.وتسليم المعقود عليه في الإجارة هو التمكين من الانتفاع به وذلك بتسليم المحل إليه بحيث لا مانع من الانتفاع به-----"

(الفتاوى الهندية:الباب الثانى عشرفى صفةتسليم الاجاره:ج۴)

(كذافى فتاوى محموديه:ج۱۶،باب اجرة الدلال والسمسار)

- تنخواہ مقرر کی جائے۔ اگر یوں کہا جائے : ایک لاکھ چندہ کیا، تو تنخواہ سے علاوہ ایک ہزار مزید رقم ملے گی، تو بھی حرج نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے فتاویٰ محمودیہ : ماخوذ از جامع الفتاویٰ ، مذکورہ بالا حوالہ)

<u>کھانے وغیرہ کی ضرورت ہو، ذاتی رقم ساتھ نہ ہو، کسی سے قرض لے، یا غیر واجب التملیک رقم سے اپنی ضرورت پوری کرے، اس صورت میں مہتمم سے باقاعدہ اجازت ضروری ہے۔ مہتمم سفیر کو اپنی طرف سے وکیل بالتصرف (امدادی فنڈ میں) بنا سکتا ہے، یا استقراض (کسی اور سے قرض لینا) کی اجازت دیدے اور یا ایڈوانس تنخواہ (عمل سے پہلے اجرت) دیدے۔</u>

(تفصیل کے لیے : فتاوی قاسمیہ :۲۰۹/۱۱)

مہتمم مدرسہ چندہ کی معیار کو بہتر بنانے کے لیے سفیر کی تنخواہ مقرر کرنے ساتھ، زیادہ محنت پر کچھ انعام امدادی فنڈ سے دیدے، زکوۃ کی رقم سے نہ دے۔

(تفصیل کے لیے فتاویٰ نوازل : ج۱۴، ص۱۶۴)

(کذافی فتاویٰ محمودیہ: ج۴، ص۲۷۴)

(ھکذافی فتاویٰ احیاء العلوم: ج۱، ص۳۳۴، بحوالہ نوازل: ج۱۴، ص۱۶۴)

(تفصیل کے لیے خیرالفتاویٰ: احکام المدارس، ج۶)

(کذافی احسن الفتاوی: ج۷، ص۲۷۷، بحوالہ خیرالفتاویٰ: احکام المدارس، ج۶)

حیلہ تملیک:

مقصود حق کی رضاہو، توحیلہ باعث ثواب ہے۔ دورحاضر میں ایک طرف زن، زر کی محبت ہے، لوگوں نے مدارس ومساجد پس پشت ڈال رکھے ہیں، مال کی محبت نے لوگوں کو کار خیر سے کوسوں دور کردیا ہے، عطیات اور صدقات نافلہ سے ان شعائر کو باقی رکھنا اب جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگیاہیں۔ اس لیے علماء نے اس مجبوری کے پیش نظر حیلہ کو مستحسن اوراچھاقرار دیاہے۔

چنانچہ فتاوی تاتارخانیہ میں رقمطراز ہے:

"کل حیلۃ یحتال بھاالرجل لیتخلص بھا عن حرام ،أویتوصل بھاالی حلال فھی حسنۃ..."

(۱۰/۳۱۱،بحوالہ فتاوی قاسمیہ:۱۱/۱۳۴)

(کذافی المحیط البرھانی،کتاب الحیل ،الفصل الاول :جوازالحیل وعدمھا:۲۱/۶۷)

حیلہ تملیک کی اجازت کہاں تک؟

حیلہ تملیک ہر دینی کام کے لیے جائز نہیں ،بلکہ ایسادینی کام جس کے بغیر اسلامی معاشرہ خطرہ میں پڑسکتا ہواور زکوۃ کا پیسہ اس میں خرچ کیے بغیر چلنا ممکن نہ ہو، تب حیلہ تملیک کرکے اس میں رقم صرف کرنے کی گنجائش ہے۔

لیکن یادرہے: رقم صرف کرنے کی گنجائش تین شرطوں کے ساتھ ہے: ۱۔۔۔ضرورت فوری (فی الفور) ہو، منتظرنہ ہو۔ ۲۔۔۔ موجودہ کے دفع کرنے کا کوئی دوسرا وسیلہ نہ ہو۔ ۳۔۔۔ ضرورت بھی ضرورت کی حدتک ہو۔

(الموسوعۃ الفقہیۃ:۲۸/۱۹۴)

"لیس من أخلاق المؤمنین الفرار من أحکام اللہ بالحیل الموصلۃ الی ایصال الحق...."

(عمدۃ القاری:۲۴/۱۰۹)

(بحوالہ فتاویٰ قاسمیہ:۱۰/۵۲۶)

یادرہے: صدقات نافلہ بھی مدرسہ میں جمع ہونے کے بعدمدرسہ کی ملک بن جاتی ہیں۔ اس کو بھی مدرسہ کے قواعد کے مطابق صرف کیاجاناچاہیے۔

(امدادالاحکام: ۲/۹۱)

حیلہ تملیک کا مطلب :

غیر مصارف زکوۃ کو زکوۃ کی رقم دینا، چونکہ فرض کی محل میں تبدیلی محض ضرورت کی بناپر کی جاتی ہے، لہٰذا تملیک کے بعد بھی وہاں رقم خرچ کی جائے، جہاں ضرورت ہو۔ (مثلاً: مدارس ومساجد کی تعمیر اور اساتذہ کی تنخواہیں وغیرہ)

"والحيلة لمن أراد ذلك أن يتصدق بمقدار زكاته على فقير، ثم يأمره بعد ذلك بالصرف إلى هذه الوجوه، فيكون لصاحب المال ثواب الصدقة، ولذلك الفقير ثواب هذه القُرَب---"

(المحيط البرهانی:جلد ۳،ص:۴۹۳)

"وَقَدْ بَيَّنَّاهُ مِنْ قَبْلُ وَالْحِيلَةُ فِي هَذِهِ الْأَشْيَاءِ أَنْ يَتَصَدَّقَ بِهَا عَلَى الْفَقِيرِ ثُمَّ يَأْمُرَهُ أَنْ يَفْعَلَ هَذِهِ الْأَشْيَاءَ فَيَحْصُلَ لَهُ ثَوَابُ الصَّدَقَةِ وَيَحْصُلَ لِلْفَقِيرِ ثَوَابُ هَذِهِ الْقُرَبِ----"

(تبين الحقائق:باب المصرف:ج۱،ص۳۰۱)

"ذهب الفقهاء إلى أنه لا يجوز دفع الزكاة إلى أصله وإن علا ولا إلى فرعه وإن سفل وإن كانا معسرين والحيلة عند الحنفية في جواز ذلك مع الكراهة أن يتصدق بها على الفقير ثم يصرفها الفقير إليهما---"

(الموسوعة الفقہیة:فی مصرف الزكاة،جلد۳۶)

واضح رہے: دینی شعائر کی بقا کے لیے یہ حیلہ کیا جاتا ہے، اس کو فقہاء نے ایک پسندیدہ عمل کہا ہے۔

مسجد کی زیب وزینت اور آرائش :

حیلہ چونکہ ضرورت کی بناپر کیا جاتا ہے، اس لیے تملیک شدہ رقم سے مسجد کا نقش ونگار درست نہیں اور نہ ہی کوئی غیر ضروری کام میں صرف کرنا جائز ہے، جس کی ضرورت شدیدہ نہ ہو۔

علم فقہ کے دو مشہور ضابطے :

الضرورات تبيح المحظورات۔

ماابيح للضرورة يقدربقدرها۔

(تفصيل كےليے الاشباه والنظائر)

مسجد کی نقش ونگار میں وقف کا مال لگانے سے متولی ضامن ہوگا۔

(جامع الفتاویٰ: ج۹، ص۸۷)

اپنا مال لگانا بھی صرف جائز ہے مسنون یا مستحب نہیں ہے۔ مساکین پر صرف کرنا زیادہ بہتر ہے۔

تفصیل کے لیے: (احسن الفتاویٰ: ج۶، ص۴۵۹، بحوالہ جامع الفتاویٰ: ج۹، ص۸۷)

حیلہ سے تملیک شدہ رقم کا مسجد کی زینت کے لیے درست نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے فتاویٰ محمودیہ: ج۱۵، ص۲۵٦)

(کذافی فتاویٰ نوازل: ج۱۳)

"لا بأس بنقش المسجد بالجص والساج وماء الذهب، والصرف إلى الفقراء أفضل، كذا في السراجية. وعليه الفتوى، كذا في المضمرات. وهكذا في المحيط."

(الفتاویٰ الهندیہ:الباب الخامس فی آداب المسجد والقبلة:ج۴،ص۳۱۹)

"ولا بأس بنقش المسجد بالجص والساج وماء الذهب لأن تزيين المسجد من باب تعظيمه لكن مع هذا تركه أفضل لأن صرف المال إلى الفقراء أولى وإليه أشار عمر بن عبد العزيز - رضي الله عنهما - حين رأى مالا ينقل إلى المسجد الحرام فقال المساكين أحوج من الأسا طين وكان لمسجد رسول الله - ﷺ - جريد النخل وهذا إذا نقش من مال نفسه فأما من مال المسجد فلا ينبغي أن يفعل ولو فعل القيم من مال المسجد قيل إنه يضمن."

(بدائع الصنائع:كتاب الاستحسان:ج۵،ص۱۲۷)

تاہم اگر مسجد کی آمدنی زیادہ ہو،اس کی ضیاع کا اشد خطرہ ہو، تو مسجد کی زیبائش اور خوبصورتی میں صرف کرنا درست ہے۔

قال فی "البحرالرائق":

"فان اجتمعت أموال المساجد ،وخاف الضياع بطمع الظلمة فيها،لابأس به حينئذ..."

(كتاب الصلوٰة :باب مايفسدالصلوٰة ومايكره)

(تفصیل کے لیے: فتاویٰ محمودیہ: ۲۵۸/۱۵)

سرمایہ دار محلّہ میں تملیک شدہ رقم:

اسی طرح کسی محلّہ میں مال دار لوگ ہو، وہ اپنی ذاتی رقم سے مسجد کی تعمیر کریں، تملیک شدہ رقم کو تعمیر میں استعمال نہ کریں۔اگر وہ دینے پر راضی نہ ہو، تو دیگر ذرائع سے عطیات وصول کر کے تعمیر پر خرچ کریں، بصورت دیگر (تعمیر کی کوئی صورت عطیات و نفلی صدقات کی شکل میں ممکن نہ ہو) حیلہ تملیک کی رقم صرف کریں۔

(تفصیل کے لیے زکوۃ کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا: ص۴۴۲)

واضح رہے: اہل محلّہ پر مسجد بنانا فرض کفایہ ہے، اگر مسجد نہ بنائی گئی، تو تمام اہل محلّہ گناہ میں برابر شریک ہوں گے۔

(الموسوعۃ الفقہیۃ: ج۳۷، ص۱۹۵)

(کذافی زکوۃ کے مسائل کا انسائیکلوپیڈیا: ص۴۴۲)

مروجہ حیلہ تملیک کا متبادل :

- فیس اورزکوۃ کے علاوہ دیگر آمدنی سے مدرسہ چلایاجائے،اگرچہ کم پیمانہ پر مدارس کیوں نہ ہو۔
(فتاویٰ رشیدیہ)
- کسی فقیر سے یہ کہے: کہ آپ فلان ہاشمی کومثلا: دس ہزار نفلی صدقہ دو،تو میں آپ کے ساتھ تعاون کروں گا۔پھراس فقیر کو مثلا: پچیس ہزار رقم زکوۃ کی مد میں دیدے۔اس سے ہاشمی کو بغیرزکوۃاور حیلہ کے نفلی صدقہ کی صورت میں رقم ملی اور فقیر کو مستحق زکوۃ ہونے کی وجہ سے زکوۃ کی مد میں رقم ملی۔
- مدرسہ کی سالانہ آمدن کا اندازہ لگالیں،اسی کے بقدر طلباء پر فیس مقرر کی جائے۔اورزکوۃ کی رقوم اسی کے مطابق صرف کریں۔یادرہے: حضرت تھانویؒ کویہی رائے پسند ہے۔(فتاوی قاسمیہ :۱۱/۱۴۸)
- کسی غریب سے کہاجائے: توقرض (مثلا: دس لاکھ) لے کرمدرسہ کو عطیہ دیں اورزکوۃ کی رقم اسے دی جائے۔
- زکوۃ کی رقم کسی فقیر کو دیاجائے،اس کو مدرسہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی جائے۔
- داخلہ فارم پر طلبااس جملہ کے تحت دستخط کرے: کہ میں منتظمین مدرسہ کواپنی طرف سے زکوۃ دہندگان کا وکیل بالقبض بناکر پھرانہیں ہر قسم کے مصرف میں خرچ کرنے کے لیے عطیہ دیتاہوں۔

سید کلیم اللہ

واللہ اعلم بالصواب۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

علماء کرام مسائل ذیل کے بارے میں کیافرماتے ہیں:

- ❖ مداراس ومساجد یا مجاہدین کے سفراء کا چندہ کی رقم سے کھاناپینا' یااپنی فیصدی رقم اوریا تنخواہ وغیرہ لیناجائزہے' یانہیں؟
- ❖ صدقات واجبہ کی تملیک کے بعدہرجگہ استعمال کرنادرست ہے' یاتملیک کے بعدبھی ضرورت کے مواقع کودیکھناضروری ہے؟نیزہرمسجد کے لیے حیلہ تملیک کرناجائزہے۔(مثلا: وہ مسجد جس کی ضروریات پوری ہوں'صرف تزئین وغیرہ کے لیے رقم درکار ہو' یاوہ مسجد جس کا اپنامحلّہ 'اپنی قوم ہواوران پر مسجد کی تعمیرلازم ہو) توایسی مساجد کے لیے صدقات واجبہ کی تملیک جائزہے' یانہیں؟

الجواب حامداومصليا

سب سے پہلے یہ دیکھناضروری ہے'کہ سفیر کی شرعی حیثیت کیاہے'کیاوہ صرف زکوۃدہندگان کی طرف سے وکیل ہے'یامدرسہ کے طلباء کا وکیل ہےاوریادونوں کا وکیل ہے؟اورکیاسفیر بمنزلہ عامل ہے؟
اس نکتہ کی وضاحت سے قبل صورت مسئولہ کی بے غبار تشریح نہیں ہوسکتی ہے۔

واضح رہے:

اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی عبارتیں درجہ ذیل ہیں:

- بقول حضرت حضرت مفتی رشیداحمد گنگوہی رحمہ اللہ: یہ طلباء مجہول الکمیت والذات ہونے کے باوجود بھی مہتمم حضرات ان کے وکیل ہیں۔

لہٰذامہتمم قبضہ کرنے کے بعد امین ہوگا'ان رقوم کو صرف اسی مد میں استعمال کرے گا'جو مصارف زکوۃ کی مد میں استعمال کرے گا'تاہم غیر مصارف میں (مثلا: اساتذہ کی تنخواہ وغیرہ)استعمال کرنے کے لیے حیلہ تملیک کرے گا۔

(تفصیل کے لیے فتاوی خلیلیہ: ص۱۵۴'بحوالہ فتاویٰ بینات: ج۲'ص۶۷۹)

- معطیین کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں' طلبہ اورآخذین کی طرف سے وکلاء ہیں۔لہٰذانہ اس پرزکوۃ واجب ہوگی اورنہ ہی معطیین واپس لے سکتے ہیں۔

(حضرت سہارنپوریؒ 'فتاویٰ خلیلیہ)

(کذا فی تذکرۃ الرشید: ص۱۶۴'بحوالہ فتاوی قاسمیہ: ۹۱/۱۱)

(تفصیل کے لیے فتاویٰ بینات : ج۲،ص۶۶۹)

تاہم مفتی کفایت اللہؒ کی رائے عامل کی ہے،جس کو اکابرین نے تفردات پر محمل کیا ہیں۔

(تفصیل کے لیے کفایت المفتی : ج۴،ص۲۸۶)

عامل اور سفیر میں فرق :

- ✓ عامل حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے، سفیر صرف ایک ادارہ کا نمائندہ ہوتا ہے۔
- ✓ عامل ہر کسی سے پوری زکوۃ وصول کر سکتا ہے، سفیر کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے۔
- ✓ عامل کو قوت عسکری حاصل ہے، سفیر کو نہیں۔
- ✓ عامل ہر صاحب نصاب سے زکوۃ وصول کرتا ہے، سفیر نہیں کر سکتا ہے۔
- ✓ عامل کے پاس صحیح طریقہ سے نظام حکومت کے تحت پہلے سے بیت المال موجود ہوتا ہے، سفیر کے پاس نہیں ہوتا ہے۔
- ✓ عامل کی رقم کا استعمال نظام حکومت کے تحت ہوتا ہے، سفیر کے پاس یہ نظام نہیں ہے۔
- ✓ عامل کی رقم بیت المال کے مخصوص حصہ (عشر وزکوۃ) میں جمع ہوتا ہے،جب کہ سفیر کے پاس بیت المال کے مخصوص حصے نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے فتاویٰ قاسمیہ : ج۱۱،ص۱۹)

مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر سفیر عامل نہیں ہو سکتا ہے۔

❖ **کیا مہتمم کو امیر المومنین کا درجہ حاصل ہے؟**

امیر المومنین کو ولایت عامہ اور قوت عسکری دونوں حاصل ہیں،جب کہ مہتمم اور ذمہ دار کو قوت ارادی حاصل ہوتی ہے۔صرف قوت ارادی پر کسی کو امیر المومنین نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا عبارات کا خلاصہ یوں ہوگا :

- ❖ سفیر طلباء کی طرف سے وکیل اور امین ہوگا۔
- ❖ سفیر یا مہتمم طلباء اور زکوۃ دہندگان دونوں کی طرف سے وکیل ہوگا،جمع شدہ رقم کی حیثیت بیت المال کی ہوگی۔

طلباء کی وکالت کرتے ہوئے زکوۃ دہندگان کی زکوۃ آدا ہوگی۔اگرچہ طلباء کو باقاعدہ نہ دیا جائے،تب بھی مکمل قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے مالک کا اختیار سلب شمار ہوگا۔معطیین کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں طلبہ

اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں۔ لہٰذا نہ اس پر زکوۃ واجب ہوگی اور نہ ہی معطین زکوۃ واپس لے سکتے ہیں۔ طلبہ نے مہتمم کے اہتمام وانتظام اور قوانین کو تسلیم کر کے داخلہ لیا ہے' گویا یوں کہ دیا ہے کہ آپ میرے وکیل ہے۔

(تفصیل کے لیے فتاوی خلیلیہ : ص ۳۱۹' بحوالہ فتاوی قاسمیہ : ج۱۱' ص۹۱)

(تفصیل کے لیے فتاویٰ محمودیہ ۹/ ۵۱۴' بحوالہ فتاوی قاسمیہ : ج۱۱' ص۹۱)

جہاں یہ سوال کیا گیا ہے' کہ طلبہ مجہول ہیں' مدارس کے چندے اکثر شعبان اور رمضان میں ہوتے ہیں' جب کہ اس وقت طلباء نہیں ہوتے ہیں؟

تو اس کا جواب یہ ہے :

- ✓ طلبہ مجہول نہیں ہے' کیونکہ بعض مدارس میں ان کا نیا داخلہ نہیں ہوتا ہے۔
- ✓ جب کہ بعض مدارس میں قدیم طلبہ کے عنوان سے ان کو داخلہ فارم دیا جاتا ہے' جو تعین پر دلالت کرتا ہے۔
- ✓ مہتمم یا سفیر سے دوران چندہ پوچھا جائے' کہ طلباء کی تعداد کیا ہے؟ تو جواب میں وہ حفاظ کے علاوہ درجہ کتب کے طلباء بھی بتاتے ہیں۔اس لیے سال کے آخر میں بھی مہتمم کا کہنا ہوتا ہے : کہ ہمارے مدرسے میں چھ سو طلباء (مثلا) زیر تعلیم ہیں۔
- ✓ جن طلبہ کا اخراج منظور ہو' تو سال کے آخر میں نوٹس بورڈ پر آویزاں کیا جاتا ہے : کہ آئندہ سال جامعہ ہذا میں فلاں طلبہ کا داخلہ نہیں ہوگا۔ جو اس بات کی دلیل ہے' کہ طلبا مجہول نہیں ہیں۔اور فی الحال حاضر نہ ہونے کے باوجود بھی ان کو مدرسہ ہی کے طلبہ کہا جائے گا۔

لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ طلبہ مجہول نہیں ہیں۔

<u>دوسرا سوال یہ ہوگا :</u>

کہ طلباء کی طرف سے توکیل اجباری ہے' کیونکہ طالب العلم چاہے' یا نہ چاہے' مہتمم کو وکیل بنانا پڑے گا؟

اس کا جواب یہ ہے' کہ خلیفہ وقت کو دو قسم کے اختیارات حاصل ہیں : قوت نافذہ۔۔۔۔ جس سے وہ حدود وقصاص وغیرہ نافذ کرتے ہیں' قوت نظم امور عامہ۔۔۔۔۔ جس سے وہ عوام اور رعیت میں خیر وبھلائی کا نظم سنبھالتا ہے۔ تو جیسا خلیفہ وقت کسی کو عامل بنائے' چو چاہے' یا نہ چاہے' امیر کو یہ اختیار حاصل ہے' بنا بر ایں مہتمم کو نظم عامہ (تمام طلباء کا انتظام وانصرام) کی قوت حاصل ہے' اس بناپر توکیل اجباری نہ کہا جائے گا۔

سفیر کی شرعی حیثیت :

- مدرسہ کا سفیر عامل کے حکم میں نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو زکوۃ کی مد سے تنخواہ دینے سے زکوۃ آدا نہ ہو گی۔

اور اسی طرح چندہ سے کمیشن بھی درست نہیں ہے' کیونکہ کل رقم مجہول ہونے کی وجہ سے اجارہ فاسدہ ہوگا۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ ان کی تنخواہ مقرر کی جائے۔

(تفصیل کے لیے فتاوی مفتی محمود : ص۳۵۱' کتاب الزکوۃ)

- کمیشن پر سفیر کو اجرت دینے میں دو شرعی قباحتیں ہیں :

کل چندہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اجرت فاسدہ ہے ۔۔۔۔۔۔ اجیر کو اجرت اس کے عمل سے دینا درست نہین ۔

(تفصیل کے لیے جامع الفتاوی : ج۶' ص۴۱۰)

- کمیشن پر چندہ کرنا درست نہیں ہے :

* **اجرت من العمل :** اپنے نفس کے عمل پر اجرت لینا (قفیز الطحان کی طرح) درست نہیں ہے۔
* **عجز عن العمل :** یعنی جب تک دوسرا چندہ نہ دے گا' یہ خود حصول کرنے پر قادر نہیں ہے۔

- سفیر کو زکوۃ کی رقم اجرت میں دینا درست نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے مسائل رفعت قاسمی : مسائل زکوۃ :)

"إذا وقع عقد الإجارة صحيحا على مدة أو مسافة وجب تسليم ما وقع عليه العقد دائما مدة الإجارة. كذا في المحيط.وتسليم المعقود عليه في الإجارة هو التمكين من الانتفاع به وذلك بتسليم المحل إليه بحيث لا مانع من الانتفاع به-----"

(الفتاوى الهندية:الباب الثانى عشرفى صفةتسليم الاجاره:ج۴)

(كذافى فتاوى محموديه:ج۱۶،باب اجرة الدلال والسمسار)

- تنخواہ مقرر کی جائے۔ اگر یوں کہا جائے : ایک لاکھ چندہ کیا' تو تنخواہ سے علاوہ ایک ہزار مزید رقم ملے گی' تو بھی حرج نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے فتاویٰ محمودیہ : ماخوذ از جامع الفتاویٰ' مذکورہ بالا حوالہ)

کھانے وغیرہ کی ضرورت ہو'ذاتی رقم ساتھ نہ ہو'کسی سے قرض لے'یاغیرواجب التملیک رقم سے اپنی ضرورت پوری کرے'اس صورت میں مہتمم سے باقاعدہ اجازت ضروری ہے۔مہتمم سفیر کو اپنی طرف سے وکیل بالتصرف (امدادی فنڈ میں) بناسکتاہے'یااستقراض (کسی اور سے قرض لینا) کی اجازت دیدے اور یاایڈوانس تنخواہ (عمل سے پہلے اجرت) دیدے۔

(تفصیل کے لیے: فتاوی قاسمیہ: ۲۰۹/۱۱)

سوال: صرف تنخواہ ایک خرابی لازم آئے گی؟

وہ یہ کام کرنے میں کوتاہی کرے گا'کیونکہ اس کی مدنظر مخصوص تنخواہ ہوگی'مدرسہ کی افادیت کا اس سے زیادہ سروکار نہ ہوگا۔اسی چیز مدکو نظر رکھتے ہوئے جائز صورت یہ ہے کہ سفیر کی تنخواہ مقرر کرے'زیادہ محنت پر کچھ انعام دیا کرے۔لیکن یادرہے: انعام امدادی فنڈ سے دیا جائے'زکوۃ کی رقم سے نہ دے۔

(تفصیل کے لیے فتاویٰ نوازل: ج۱۴'ص۱۶۴)

(کذافی فتاویٰ محمودیہ: ج۴'ص۲۷۴)

(ھکذافی فتاویٰ احیاء العلوم: ج۱'ص۴۳۳'بحوالہ نوازل: ج۱۴'ص۱۶۴)

(تفصیل کے لیے خیرالفتاویٰ: احکام المدارس'ج۶)

(کذافی احسن الفتاوی: ج۷'ص۲۷۷'بحوالہ خیرالفتاویٰ: احکام المدارس'ج۶)

حیلہ تملیک:

مقصود حق کی رضاہو'توحیلہ باعث ثواب ہے۔دورحاضر میں ایک طرف زن'زر کی محبت ہے'لوگوں نےمدارس ومساجد پس پشت ڈال رکھے ہیں'مال کی محبت نے لوگوں کو کارخیر سے کوسوں دور کردیا ہے'عطیات اور صدقات نافلہ سے ان شعائر کو باقی رکھنا اب جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگیاہے۔اس لیے علماء نے اس مجبوری کے پیش نظر حیلہ کو مستحسن اوراچھاقرار دیاہے۔

چنانچہ فتاوی تاتارخانیہ میں رقمطراز ہے:

"كل حيلة يحتال بهاالرجل ليتخلص بها عن حرام ،أويتوصل بهاالى حلال فهى حسنة..."

(۳۱۱/۱۰'بحوالہ فتاوی قاسمیہ: ۱۳۴/۱۱)

(کذافی المحیط البرھانی'کتاب الحیل'الفصل الاول: جوازالحیل وعدمھا: ۶۷/۲۱)

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

عرض یہ ہے کہ میں کراچی کی ایک پیمپر کمپنی کے ساتھ ڈسٹری بیوٹر کے طور پر کام کرتا ہوں، کمپنی مال دے کر میں رقم حوالہ کرتا ہوں، کمپنی نے مجھے ایک ٹیم (عملہ) دی ہے، جو ایک ایریا منیجر کوئٹہ شہر کے لیے، چار آرڈر بوکر اور آوٹ اسٹیشن کے لیے دو آرڈر بوکر پر مشتمل ہیں۔ان سب کے اخراجات کمپنی آدا کرتی ہے، کمپنی بل میں مجھے نو فیصد (9%) کاٹ کر دیتی ہے اور وہ کہتی ہے، کہ کوئٹہ شہر کے ریٹلر کو تین فیصد (3%) منافع دے کر فروخت کرو۔اس سے مجھے چھ فیصد (6%) منافع ملتا ہے۔ہول سیلر کو چار فیصد (4%) منافع دے کر فروخت کرو۔اس سے مجھے پانچ فیصد (5%) منافع ملتا ہے۔اور آوٹ اسٹیشن کو ساڑھے سات فیصد (7.5%) منافع دینا ہے، جس سے مجھے ڈیڑھ فیصد (1.5%) منافع ملتا ہے۔اس طرح کرنے میں کمپنی کا فائدہ نہیں ہے، صرف دوکاندار کو خوش کرنے کے لیے اور اپنا سیل بڑھانے کے لیے وہ ایسا کرتی ہے۔آوٹ اسٹیشن مال کرایہ آوٹ اسٹیشن ڈسٹری بیوٹر آدا کرتا ہے۔باقی کوئٹہ شہر کے تمام سپلائی کے اخراجات اور دفتر کے اخراجات میں آدا کر رہا ہوں نو فیصد (9%) سے اخراجات منہا کر جو باقی بچتا ہے، وہ میرا منافع ہے۔لہٰذا کیا از روئے شریعت کمپنی کے ساتھ میرا یہ معاہدہ اور کاروبار درست ہے؟

جب کمپنی ریٹ بڑھاتی ہے، تو میرے پاس ہفتہ یا پانچ دن کا پڑا ہوا مال پر بھی نیا ریٹ لاگو کر دیتی ہے، یہ بڑھائے گئے پیسے کمپنی ڈیبیٹ نوٹ کی صورت میں ہم سے وصول کرتی ہے اور جب قیمت کم ہوتی ہے تو میرے پاس ہفتہ یا پانچ دن کا پہلے سے پڑے ہوئے مال کا ریٹ بھی کم کر دیتی ہے۔اور یہ کٹے ہوئے پیسے ہمیں کریڈٹ نوٹ کی صورت میں واپس کرتی ہے۔کیا شریعت کی نگاہ میں ایسا کرنا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا

ڈسٹری بیوٹر کا کمپنی کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کی پاسداری ضروری ہے۔لیکن یاد رہے :

ہر وہ شرط جائز ہے، جس سے خرید وفروخت کو مزید تقویت اور فروغ ملے، کوئی بھی ایسی شرط لگانا جائز نہیں، جس سے ڈسٹری بیوٹر یا کمپنی کو فائدہ پہنچے۔

پوچھے گئے سوال میں کچھ شرائط درست ہیں، جب کہ بعض شرطوں کی تصحیح لازمی ہے، ورنہ بیع درست نہ ہو گی۔

کمپنی کی طرف سے یہ شرط لگانا کہ کوئٹہ شہر کے ریٹیلر کو تین فیصد (3%) اور ہول سیلر کو چار فیصد (4%) دینا ہے اور آوٹ اسٹیشن کو ساڑھے سات فیصد (7.5%) دینا ہے۔

مذکورہ بالا شرط بوجہ عرف اور کمپنی اسٹاک کی زیادہ فروخت ہونے (سائل کے قول کے مطابق) کی وجہ سے درست ہے۔

البیع بشرط متعارف یعنی الشرط المرعی فی عرف البلدۃ صحیح والشرط معتبر۔ای وان کان لایقتضیہ العقد ولایلایمہ،وافادت ھذہ الجملۃ انہ یعتبرالعرف الخاص الحادث ،قال فی ردالمحتار:ومقتضی ھذا انہ لوحدث عرف فی شرط غیرالشرط فی النعل،والثوب والقبقاب ان یکون معتبرا اذا لم یؤدالی المنازعۃ ......وحاصل ماحققہ فی تلک الرسالۃ ان العرف الخاص معتبر وان خالف المنصوص علیہ فی کتب المذھب مالم یخالف النص الشرعی یعنی الکتاب والسنۃ والاجماع وان العرف الخاص یشمل القدیم والحادث ،وان حکم العرف یثبت علی اھلہ خاصا اوعاما...ومن ھنایعلم حکم ماتعورف فی بلدتناحمص وھوان احدالفلاحین من جمیع القری یأتی بالۃ حراثتہ الحدیدیۃ المسماۃ عندھم بالسکۃ لعندالحداد،فیشتری منہ رطل حدید مثلا بضعفی قیمتہ علی ان یحمیہ فی النار ویمزجہ فی سکتہ التی اتی بھا،وھذالشرط قدتعارفہ الفلاحون جمیعھم مع اھل تلک الصنعۃ حتی صاربینہم عرفا مستفیضا۔

(شرح المجلۃ :64/1،ط:رشیدیۃ)

کمپنی کا آوٹ اسٹیشن ڈسٹری بیوٹر کو باہر کے کرایہ کا پابند بنانا اوریااندرون شہر کا کرایہ اندرون شہرڈسٹری بیوٹرپر لازم کرنابوجہ عرف کے درست ہے۔اورہرایسی شرط لگانا درست ہے جس سے جھگڑے کی نوبت نہ آئیں اورعرف میں وہ مشہور بھی ہو۔اوریہاں بظاہر شرط میں جھگڑے کی نوبت نہیں آتی ہے،کیونکہ ڈسٹری بیوٹر نے اپنے مخصوص نفع کو مدنظر رکھ کر شرط منظور کی ہے۔اوراس پر مزید یہ ہے،کہ ایسی شرط میں تقریبا کمپنی اور کسٹمر دونوں کا نفع ہے،کیونکہ سیل زیادہ ہونے پرخریدار کا نفع بھی زیادہ بن جاتا ہے۔

(حوالہ : مذکورہ بالا)

2۔۔۔ڈسٹری بیوٹرکا سامان پر قبضہ کرنے کے بعد کمپنی کادوبارہ قیمت بڑھانا،یا گھٹانااز روئے شرع درست نہیں ہے۔

واضح رہے:سامان پر قبضہ کے بعد کمپنی (بائع)کافروخت شدہ مال خریدار کاہے، کمپنی کااس میں مداخلت کی اجازت نہیں ہےاورنہ ہی سامان کے جل جانے،یاچوری ہونے کا ذمہ دار کمپنی ہے۔اس لیے مال مہنگا،یاسستاہونے سے ڈسٹری بیوٹرکے پاس موجودمال کومہنگایاسستاشمار کرناشرط فاسدہے۔

چنانچہ فتاوی دارالعلوم دیوبند میں ہے:

بیع تام ہوجانے کے بعد قیمت کی کمی کاعذر قابل سماعت نہیں۔

(343/14)

اوردوسرایہ ہے کہ اس میں دھوکہ بھی ہے،کیونکہ یہ معلوم نہیں ہے ،کہ سامان مہنگاہوا،یاسستاہوگا اوریا یہی قیمت برقراررہے گی۔

''الشرط الثانی من الشرط الفاسدماکان فیہ غرر۔۔''

(دررالحکام:ج ۱، ۱۶۳م:الطارق،افغانستان)

البتہ اگرعقدکے بعد اسی مجلس میں خریدار اپنی مرضی سے زیادہ رقم دینے پرراضی ہو اوربائع نے قبول کیا،تو پھرزائد رقم دیناضروری ہے۔

فاذاقبل البائع تلک الزیادۃ فی ذلک المجلس ،کان لہ حق المطالبۃ بھا،ولاتفیدندامۃ المشتری ۔اما لوقبل بعدذلک المجلس فلایعتبرقبولہ حینئذ۔مثلا:لوبیع حیوان بالف قرش ثم بعدالعقدقال المشتری للبائع:زدتک مأتیی قرش ،وقبل البائع فی ذلک المجلس اخذالمشتری الحیوان المبتاع بالف ومأتیی قرش،اما لولم یقبل البائع فی ذلک المجلس بل قبل بعدہ ،فلایجبر المشتری علی دفع المأتیی قرش التی زادھا۔

(شرح المجلۃ:۱۸۱،ج ۲)

فی بیان التزیید والتنزیل فی الثمن والمبیع بعدالعقد۔۔۔ثم ان قیام المبیع شرط فی صحۃ الزیادۃ فی المبیع بعدھلاک المبیع۔

(شرح المجلۃ:ص ۱۷۸،ج ۲)

اسی طرح اگربائع نے رقم کم کردی اورخریدارنے اسی مجلس میں قبول کیا،توکم قیمت دینی ہوگی۔

فالمشتری اذا قبل فی المجلس الزیادۃ کان لہ حق المطالبۃ بتلک الزیادۃ ،ولاتفیدندامۃ البائع۔واما اذالم یقبل فی مجلس الزیادۃ ،وقبل بعدہ فلاعبرۃ بقبولہ۔

(شرح المجلۃ:ص ۱۷۹،ج ۲)

البتہ بہتر صورت یہ ہوسکتی ہے،کہ ڈسٹری بیوٹرسپلائربنے ۔اب کمپنی کی مرضی چاہے جوبھی شرط لاگوکریں،یامال مہنگااورسستاکریں ،کیونکہ کمپنی کا یہ تصرف اپنےمال میں ہے۔اور اس سے سپلائرکا نقصان بھی نہ ہوگا۔وہ مال فروخت کرکے اپنامتعین فیصدی نفع اٹھائے اوربس۔۔۔

نوٹ : اس تجویز سے کمپنی کا ڈھانچہ وہی کا وہی ہوگا، نفع بھی برقراراورمال کی سپلائی بھی بروقت ہوگی۔اسی طرح ڈسٹری بیوٹر کو بھی وہی نو فیصد(معاہدہ کے مطابق) منافع ملے گا۔البتہ صرف اتنافرق ہواکہ وہ خریدارنہیں ہے اورنہ ہی مال کے گم اوریاچوری ہونے کی وجہ سے ذمہ دارہوگا۔بشرطیکہ وہ خود خیانت کرکے مال میں لاپرواہی نہ کریں۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

* ضرورت اور حاجت کی تعریفیں

* ضرورت اور حاجت کی شرطیں

* ضرورت اور حاجت کے درمیان فرق

* حاجت کے مراتب

* کیا زمیندار کا کوٹھی مالکان سے قرض لینا ضرورت ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضرورت اور حاجت کی تعریف ،شرائط ،فرق اور متعلقہ احکام ذکر کریں، کیا کوٹھی کے مالکان کا زمینداروں کو قرض دیناضرورت یاحاجت میں شامل ہے؟

ضرورت:

ضرورت سے مراد ہر وہ کام جس کا کرنا ضروری ہو،اس کا کوئی متبادل بھی نہ ہواورنہ ہی اس کے علاوہ کوئی چارہ کار ہو, ورنہ ہلاکت یاہلاکت کے قریب ہونے کاخطرہ ہو۔

"الضرورة اسم من الاضطرار .وفي الشرع : بلوغ الإنسان حدا إن لم يتناول الممنوع هلك أو قارب."
(الموسوعۃ الفقہیۃ:ج٢٧،ص ٣٢٠)

"تعريف الضرورة:
عرف بعض العلماء الضرورة (بأن يبلغ الإنسان حداً إن لم يتناول الممنوع هلك أوقارب الهلاك .وعرفها الحنفية بأنها : (خوف الضرر أو الهلاك على النفس أو بعض الأعضاء بترك الأكل) .وعرفها المالكية بأنها: (الخوف على النفس من الهلاك علماً أو ظناً) .وعرفها الحنابلة بأنها (خوف الإنسان التلف إن لم يأكل المحرم غير السم .فالضرورة أن يتعرض الإنسان لظروف تصيره إلى حد يعلم ـ أو يظن ـ أو يخاف أنه إن لم يتناول المحرم ـ غير السم هلك، أو قارب الهلاك ـ هلك جميعه، أو هلك بعضه... أو قارب الهلاك أي منهما.تعريف الضرورة وحكمها: هي الخوف على النفس من الهلاك علماً (أي قطعاً) أو ظناً. فلا يشترط أن يصبر حتى يشرف على الموت. وحكمها في المذاهب الأربعة وجوب الأكل من المحرَّم، بمقدار ما يسد رمَقَه (أي بقية حياته)، ويأمن معه الموت...."

"ضرورت" کی شرائط:

- ✓ ضرورت درپیش ہو۔
- ✓ اس کے علاوہ کوئی جائز متبادل نہ ہو۔
- ✓ وہ ضرورت اسلام کے کسی بھی حکم کا مخالف نہ ہو۔
- ✓ اور وہ ضرورت بقدر ضرورت ہو۔
- ✓ متبادل سے ضرورت کاازالہ یقینی ہو۔

"شروط الضرورة :
ليس كل من ادعى الضرورة يسلَّم له ادعاؤه، أو يباح له فعل الحرام، وإنما لابد من توافر شروط أو ضوابط للضرورة، وهي ما يأتي :
1 - أن تكون الضرورة قائمة لا منتظرة في المستقبل، أي أن يحصل في الواقع خوف الهلاك على النفس أو المال بغلبة الظن بحسب التجارب، أو التحقق من خطر التلف،
2- أن يتعين على المضطر ارتكاب المحظور الشرعي أي ألا يكون هناك وسيلة أخرى من المباحات لدفع الخطر إلا تناول الحرام.

3- ألا يخالف المضطر مبادئ الإسلام، فلا يحل الزنا والقتل والكفر والغصب بأي حال؛
4- أن يقتصر في رأي الجمهور على الحد الأدنى أو القدر اللازم لدفع الضرر
5 - أن يصف المحرم - في حال ضرورة الدواء - طبيب عدل ثقة في دينه وعلمه، وألا يوجد من غير المحرَّم علاج آخر، يقوم مقامه.ولا يتقيد الاضطرار بزمن مخصوص لاختلاف الأشخاص في ذلك ."

(الفقه الاسلامی : تعریف الضرورة وحكمها)

علامہ حموی نے ابن الھمام رحمہما اللہ سے پانچ مراتب نقل کیے ہیں:

* **ضرورت:** ایسی حد تک پہنچنا کہ اگر ممنوع چیز سے پرہیز کیا جائے، یا توہلاک ہو جائے گا اور یا ہلاکت کے قریب ہو گا۔
* **حاجت:** ایسی حد تک پہنچنا کہ اگر ممنوع چیز سے پرہیز کی جائے، تو مشقت اور حرج میں پڑ جانے کا خطرہ ہو۔
* **منفعت:** نفع کی خاطر کوئی کام کرے۔ جیسے: گندم کی روٹی، چھوٹا گوشت، روغنی روٹی وغیرہ۔
* **زینت:** اپنی چاہت کی خاطر کوئی کام کرے۔ جیسے: میٹھی چیز کی خواہش کرنا۔
* **فضول:** حرام میں وسعت اور یا مشتبہ اشیاء کے استعمال کو فضول کہا جاتا ہے۔

فائدہ: زیر بحث مقالہ میں صرف ضرورت اور حاجت پر بحث ہو گی۔

نوٹ: حاجت اور ضرورت میں چونکہ رخصت پر فتویٰ دیا جاتا ہے۔ مقصد سے قبل رخصت کی وضاحت ضروری ہے۔

رخصت کی تین قسمیں:

مباح: پہلی قسم سے مراد وہ حالت اضطراری جس کا سوائے حرام کھانے کے کوئی متبادل نہ ہو، یا کسی نے کھانے پر ایسا مجبور کیا ہو، کہ نہ کھانے پر قتل یا کسی عضو کے کاٹنے کی دھمکی دی گئی ہو، تو اس وقت حرمت ساقط ہو جاتی ہے۔

حرمت برقرار: اسے مراد ایسی حالت کا ہونا کہ جس میں حرمت تو ساقط نہ ہوتی ہو، البتہ رخصت ہو۔

جیسے: قتل کی دھمکی دی ہوئی کا کلمہ کفر زبان پر جاری کرنا۔

غیر مباح وغیر مرخص: وہ حالت کہ نہ تو حرام کی اباحت ہو اور نہ ہی رخصت ہو، چاہے حالت اختیاری ہو، یا اضطراری ہو۔ جیسے زنا کرنا، یا کسی کو ناحق قتل کرنا وغیرہ۔

فائدہ: حکم کے اعتبار سے تیسری قسم کسی صورت میں جائز نہ ہو گی، جب کہ پہلی قسم (اباحت) جائز ہے اور تیسری قسم میں رخصت کے باوجود حرمت برقرار رہے گی۔

(تفصیل کے لیے اصول افتاء : ص۳۱۷)

ضرورت کے مراتب میں فرق:

واضح رہے: عام طورپر ضرورت کے لیے مذکورہ بالاشرائط ہیں ،تاہم ضرورت کے مراتب میں لوگوں کی حالت کو یکسر مسترد کرنا اور خاص کردورحاضر کے انسانی خواہشات اور تقاضوں کو ملحوظ نظرنہ رکھنے سے کافی مشکلات کا سامنا ہوگا۔مثال کے طورپر سابقہ ادوار میں تین کپڑے ضرورت کے تحت آتے تھے ،اس سے زائد کپڑے قربانی یا صدقہ فطر کے نصاب میں شمار ہوتے تھے، کیادورحاضر میں تین سے زائد کپڑے ضرورت ہیں، یانہیں ؟

اسی طرح ایک شخص کی ضرورت گرمی میں ایک پنکھے سے پوری ہوسکتی ہے ،وہ اپنے لیے ایئر کولر بھی بطورضرورت کے استعمال کرتاہے ،کیا یہ ضرورت میں شمار ہوگا؟ یامثلا:ایک شخص کی ضرورت آٹھ لاکھ (800000) کی گاڑی سے پوری ہوسکتی ہے، وہ پچیس لاکھ (2500000) کی گاڑی کا اپنے لیے انتخاب کرتاہے ،کیااس شخص پر ان تیرہ لاکھ(1300000) کی وجہ سے قربانی یاصدقہ فطرلازم ہوگا ؟اس طرح بہت ساری مثالیں ہماری سامنے ہیں، جس کوآج کی اصطلاح میں ضرورت کہاجاتاہے۔

واضح رہے:

وضاحت سے قبل چند قواعد لکھے جاتے ہیں :

الضرورات تبیح المحظورات ۔۔الامراذاضاق اتسع واذاضاق اتسع۔۔الضرریزال ۔۔۔الضرالاشدیزال بالضررالاخف۔۔الضرورۃ تتقدر بقدرھا۔۔ یختارأھون الشرین۔۔المشقۃ تجلب التیسیر۔۔ الحاجۃ تنزل منزلۃ الضرورۃ عامۃ اوخاصۃ۔۔الضررلایزال بمثلہ۔۔۔

تمام قواعد کا خلاصہ خاص کر"الحاجۃ تنزل منزلۃالضرورۃ عامۃاورخاصۃ" یہ ہواکہ حاجت اورمشقت کے وقت چیزوں میں تخفیف ہوجاتی ہے اور بسااوقات خاص طبقہ ،یاخاص اشخاص کی حاجت بھی بعض اوقات ضرورت کا درجہ حاصل کرلیتی ہے اوراسی بناپر اس کے ساتھ وہ معاملہ اختیار کیاجاتاہے، جن کی عام حالات میں اجازت نہیں ہوتی ۔" مثلا: فقہاء سودی قرض حاجت کی بناء پر جائز سمجھتے ہیں اور فقہاء شوافع نے تعلیم دینے کی غرض سے غیر محرم کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔

اب مشکل اس میں ہے ،کہ کس کو ضرورت کہاجائے اور کس کو حاجت کہاجائے۔۔۔۔؟ فقہی جزئیات پر غور کرنے سے معلوم ہوگا، کہ جن چیزوں کی ممانعت ذاتی ہوں، ان کی اجازت ضرورت اوراضطراری کی صورت میں ہےاور جن کی ممانعت کسی خارجی سبب کی بناپر ہویعنی ممنوع لغیرہ ہو (جیسے سودی قرض) حاجت کی بناپر وہ جائز قرار پاتی ہیں۔

(تفصیل کے لیے قاموس الفقہ : ج۳، ص ۱۷۲)

"والمقترض آثم كذلك إلا عند الضرورة .والضرورات تبيح المحظورات . ولكن الضرورة تقدر بقدرها ، فما زاد عن حد الضرورة ظل محرما، فما الضرورة إذن في القروض الإنتاجية ؟"

(مجلة فقه الاسلامی)

جیساکہ پہلے گذرچکاکہ حاجات اصلیہ کی تعریف میں حالت اوراشخاص کی رعایت رکھنے سے بہت سارے مشکلات سے گزرناآسان ہوگا،شریعت مطہرہ میں اسی پہلوپر خاطر خواہ رعایت موجودہے۔مثلا:استعمالی اشیاء میں سے جومال تجارت ہونے کی وجہ سے نموپذیرنہ ہوں ،یاسوناچاندی اورروپیہ نہ ہو(جس کو شریعت بہرحال نموپذیرقراردیتی ہے۔)حاجات اصلیہ میں داخل ہیں۔(جس کو ضرورت کے مراتب کی بناپر ضرورت کہاجائے گا۔)مثلا:گھرکاسامان،رہائشی مکان ،مطالعہ کی کتابیں ،گاڑیاں اورخوداستعمال کرنے والااسلحہ وغیرہ۔

اورپھرشریعت کے مذاق اورمزاج سے معلوم ہوتاہے ،جہاں یہ چیزیں مطلق چوڑی گئی ہیں،بعض خاص اموال میں زکوۃ کا ذکرملتاہے ،جب کہ اس برعکس بعض ایسی صورتیں ہیں ،جن میں زکوۃ واجب نہ ہونے کی صراحت ذکرہے،مثلا:ذاتی خدمت کے لیے خریدے ہوئے غلام میں صدقہ فطرکے علاوہ زکوۃ واجب نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے قاموس الفقہ : ج۳،ص ۱۷۳)

"إن هذا حاجة عامة وضرورة والضرورة تقدر بقدرها والتضييق في هذا الأمر أيضا خلاف ليسر الإسلام وسعته ومرونته وصلوحيته لكل زمان ومكان . فالأفضل فيما أرى وترون حفظكم الله وأنتم العلماء المنصفون أن نبتغي بين ذلك سيرا وسطا لا هو إلى الإفراط ولا هو إلى التفريط كما ذكر المنصور للإمام مالك حين قال له : اكتب كتابا تبتعد فيه عن رخص ابن عباس وعن شدائد ابن عمر ، وعن شواذ ابن مسعود ووطئه للناس توطئا وفيما ذكرت لعله يكون الوسط ، لعله، أما فيما ذكره أخي وجاري جار الرضى الأستاذ الدكتور محمد عطا السيد في قضية أنه ياهل ترى ؟ هل هذا فيما يفيض عن الحاجة أم لا يفيض ؟ أقول : هذا السؤال ربما يكون في غير محله لأسباب .منها أن الأغنياء شحوا عن دفع الزكاة فكيف يفيض المال ؟ نحن في واقع اجتماعي أليم ، إن الذي يدفع الزكاة في البلاد الإسلامية عامة مع اختلاف الأقطار فيما بينها اختلافا طفيفا لا يتجاوز بحد غير مبالغ فيه 40 أو 50 % إن يكن أقل فكيف نتصور في هذا العصر أن يفيض المال عن حاجة الفقراء . نحن اليوم في عصر شحت الأغنياء فيه في واقع نريدأن نعالجه كما هو عليه لا حينما تقوم الدولة الإسلامية في العالم الإسلامي ويصير للناس إمام واحد وخليفة واحد وتوزع أموال الزكاة كما وزعت في عهد عمر بن عبد العزيز . لا . في ذلك الوقت له وضع آخر وحل آخر . نريد أن نعالج مرضًا خطيرا وهو أن الفقراء إذا لم نتبين هذه الحلول الواقعية اليوم أنهم سيدخلون زمرازمرا في أفكار إلحادية مناقضة للإسلام تحت اسم حل مشكلة الفقر وما إلى ذلك مما تعلمونه بالإشارة فضلا عن العبارة . أستغفر الله وأقول قولي هذا والحمدلله رب العالمين ."

(مجلة فقه الاسلامی)

اس کی مثال فقہ کی کتابوں سے یوں بھی دی جاسکتی ہے، جیسے: مال دار شخص پر بیوی کے نفقہ کاالگ حکم ہے، جب کہ تنگ دست کے لیے الگ حکم ہے، یااسی طرح تعزیر میں شریف اور غیر شریف شخص کا فرق کیا گیاہے۔جس کا مطلب یہی ہے کہ لوگوں کے مراتب اور حالات کو مد نظر رکھاجائے گا۔

"ولا بد من مراعاة حال الغني والفقير والشرف والضعة ، وليست حالة الوسط الذي يعيش فيه الأغنياء كحالة الوسط الذي يعيش فيه الفقراء ، ولا عيشة الأشراف والأمراء كعيشة السوقة والضعفاء ، ولهذا قال ابن العربي : إن المرأة الشريفة إذا امتنعت عن إرضاع ولدها فلا يلزمها ذلك نظرًا للعرف...."

(مجلۃ مجمع فقہ الاسلامی:العرف بین الفقہ:ج۲)

<u>بنابرایں اگرضرورت کی تعریف میں مراتب کا خیال رکھاجائے،توان مشکلات کا حل باسانی ہوگا۔</u>

<u>اسی طرح فقہاء نے مختلف حالات کی وجہ سے ضرورت پر فتوی دیاہے۔</u>

- تبلیغ کی خاطر غیر مسلم سے حسن سلوک ضروری ہے۔(کفایت المفتی)
- ضرورت کی وجہ سے عبادت پر اجرت لیناجائزہے۔(کفایت المفتی)
- (ضرورت کی وجہ سے مذہب غیر پر فتویٰ دیناجائزہے۔لیکن ضرورت کو غیر ضرورت سے جدا کرنا مشکل ہے۔

(فتاویٰ فریدیہ: ج۵،ص۱۹۶)

- سودی قرضہ لیناناجائز اور حرام ہے ، مستحق لعنت ہے،البتہ بوقت شدت ضرورت یعنی اگر کوئی شخص اس حدتک پہنچے کہ بچے بھوک سے تڑپ رہے ہو،یا خوداس حالت کا شکار ہو،توسودی قرضہ بقدرضرورت لینادرست ہے۔

يجوزللمحتاج الاستقراض بالربح ،وتحتہ فی الحموی :وذلک نحوأن یقرض عشرة دینامثلا،ویجعل لربہا شیئامعلوم فی کل یوم ربحا۔

(الأشباه والنظائر:ج ۱،ص ۳۳۹)

- ضرورت کی وجہ سے مسجد میں ٹھلنا۔مثلا: ریاحی تکلیف ہو،یاشوگر وغیرہ ہو،کیونکہ طبعی ضرورت میں سے ہے۔(کتاب الفتاویٰ: ج۳،ص۳۲۱)
- ضرورت کے وقت جب جان بچانا دشوار ہو،یاسخت مشقت میں مبتلا ہونے کااندیشہ ہو،تورشوت دینادرست ہے،جب کہ لینے کی کسی صورت گنجائش نہیں ہے۔(کتاب النوازل: ج۱۱،ص ۲۶۰)

حاجت: حاجت سے مرادایسی حالت کا ہونا جس میں مبتلا شخص کے لیے اس کے نہ کرنے سے مشقت میں پڑجانے کا خطرہ ہو۔ بالفاظ دیگر دین ،جان ، عقل،مال اور نسل کی حفاظت کے لیے وہ آخری درجہ تو نہ ہو،لیکن اگران کی حیثیت ایسی تدابیر کی ہو،کہ اگراس کی رعایت نہ کی جائے،توآدمی دشواری سے دوچار ہوجائے۔

"الحاجة تطلق على الافتقار ، وعلى ما يفتقر إليه مع محبته .واصطلاحا : ما يفتقر إليها من حيث التوسعة ورفع الضيق المؤدي في الغالب إلى الحرج والمشقة اللاحقة بفوت المطلوب .والفرق بين المشقة والحاجة أن الحاجة وإن كانت حالة جهد فهي دون المشقة ومرتبتها أدنى منها ."

(الموسوعۃ الفقہیۃ:ج۳۷،ص ۳۲۱)

(باب كراهة مازاد على الحاجة من الفراش واللباس)

" قوله صلى الله عليه و سلم (فراش للرجل وفراش لامرأته والثالث للضيف والرابع للشيطان) قال العلماء معناه أن مازاد على الحاجة فاتخاذه انما هو للمباهاة والاختيال والالتهاء بزينة الدنيا وما كان بهذه الصفة فهو مذموم."

(شرح المسلم للنوی،باب كراهۃ مازاد على الحاجۃ من الفراش)

حدیث کی تشریح میں علامہ نوویؒ اوردیگر شراح نے یہ تصریح کی ہے کہ اگرچہار سے زائد بستر ہو،تودرست ہے ،بشرطیکہ تکبراور نمود کے لیے نہ ہو۔

حاجت کی قسمیں: عامہ-----خاصہ

حاجت عامہ : جس کی طرف احتیاج عام ہو،جب کہ خاصہ سے مراد خصوص جماعت یا گروہ کی حاجت ہے۔

احکام شرعیہ میں حاجت دوصورتوں میں موثر ہوتی ہے:

اول : کتاب اللہ یاسنت میں اس کی صراحت موجود ہو۔جیسے: بیع سلم اوریاحالت جنگ اورمرض میں ریشمی لباس پہننا۔یامثلا: شرکت ،مضاربت ،اجارہ ،مساقات ،مزارعت وغیرہ میں حاجت کو ملحوظ نظرر کھاگیاہے،جس میں ایک کے پاس سرمایہ ،یازمین ہوتی ہے،جب دوسرے کے پاس محنت اور ہنر ہوتاہے۔اسی طرح بعض اوقات کسی کے پاس قرض آداکرنے کی استطاعت نہیں ہوتی ہے،تووہ کسی دوسرے پر حوالہ کرتاہے ،اس طریقے سے وہ اپنی حاجت پوری کرتاہے،یامثلا: قرض دارقرض اداکرنے کی صلاحیت نہیں رکھتاہے ،تو وہ ابراء کی طرف حاجت رکھتاہے۔

(تفصیل کے لیے شرح مجلّہ)

دوم : اصل حکم محتمل ہو،کتاب اللہ اورسنت میں اس کی وضاحت نہ ہواوریا مجتہد فیہ ہو،تواس وقت اباحت کوترجیح دی جائے گی۔

جیسے : عورت کا گواہی کے لیے چہرہ کھولنا احناف کے نزدیک جائز ہے ، کیونکہ عورت کے چہرہ کا ستر ہونا نص صریح سے ثابت نہیں ہے۔

یاد رہے : اگر ہر حاجت کو ضرورت کے قائم مقام قرار دیا جائے ،تو دونوں کے درمیان فرق نہ ہوگا۔اس لیے حاجت بقول شیخ احمد زرقاؒ وہاں معتبر ہوگی جہاں نص شرعی اس کو جائز قرار دیتی ہو، یا تعامل امت ہو اور یا اس کے متعلق ممانعت کی صریح نص نہ ہو اور جواز کی نظیر شریعت میں موجود ہو جس کے ساتھ منسلک کی جائے۔

(اصول الافتاء وادابہ)

حاجت اور ضرورت میں فرق :

- ✓ ضرورت میں بقدر ضرورت کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے، جیسے : اکل میتہ اور شرب خمر وغیرہ۔جب کہ حاجت میں توسع کی گنجائش ہے۔ جیسے : بیع سلم ۔
- ✓ ضرورت میں ایسی چیز کا استعمال ہوتا ہے ،جس کی حرمت دلیل یا نص قطعی سے ثابت ہوئی ہے،اس میں حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے اباحت کی اجازت ہے،جب کہ حاجت میں اس کی قید نہیں ہے۔
- ✓ ضرورت میں حرام لعینہ کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے۔جب کہ حاجت میں حرام لغیرہ کے استعمال کی اجازت ہوتی ہے۔

کیا کوٹھی کے مالکان کا زمینداروں کو قرض دینا ضرورت یا حاجت میں شامل ہے؟

کوٹھی کے مالکان زمینداروں یا کاشتکاروں کو قرض دیتے ہیں ،بعد میں زمیندار پھل فروٹ اور سبزیاں ان مالکان کو دیتے ہیں کیا شریعت کی نگاہ سے یہ درست ہے ؟اور کیا اس طرح کا قرض لینا حاجت اور ضرورت میں داخل ہے؟

واضح رہے :

کوٹھی کے مالکان اگر دوران قرض یہ شرط صریح طورپر ذکر کریں، کہ فروٹ یا سبزیاں ہمیں دینے ہوں گے ،اس کے فساد میں کوئی شک نہیں ہے ، کیونکہ " کل قرض جر نفعا فھو ربا" کے زمرے میں آکر یہ صریح سود ہے۔

اگر دوران قرض یہ اس شرط کی وضاحت نہ ہو،جب کہ عرف میں یہی مشہور ہے کہ مال متعلقہ کوٹھی تک پہچانا ہے،تو اس صورت کے جواز اور عدم جواز سے قبل چند تمہیدی باتیں ضروری ہیں :

- ❖ المعروف کالمشروط کے لیے اتنی شہرت ضروری ہے کہ قاضی، یا حکم اس کے مطابق فیصلہ کرے۔
- ❖ شرط مقتضائے عقد کے خلاف ہونے کے باوجود عرف کی وجہ سے جائز ہو جاتی ہے۔
- ❖ مقتضائے عقد کے خلاف شرط کے عدم جواز کی وجہ جھگڑا ہے۔

واضح رہے:

فقہاء کرام نے مشتری کا بائع سے کپڑا لے کر اسکو یہ کہنا کہ اس کو رنگ بھی دیناہے، یا جوتے خرید کر بائع پر تسمہ لازم کرنے کے جواز کا فتویٰ عرف کی بناپر دیا گیاہے۔اسی گھڑی ساز کو گھڑی مرمت کے لیے دینااور دوران مرمت نیاپرزہ بھی ڈال دیتاہے، جو بیک وقت بیع اوراجارہ دونوں ہیں، لیکن جواز کا فتوی ابتلاء عام کی وجہ سے دیا گیاہے، ورنہ لوگ حرج اور مشقت میں پڑجائیں گے۔ اسی طرح فریج کمپنی والوں کا یہ آفر دینا کہ ایک سال تک وارنٹی ہے اگر دوران سال خراب ہوا تواس کی مرمت ہم کریں گے یا نئے فریج سے تبدیل کریں گے۔اس پر بھی جواز کا فتویٰ عرف ہی کی بناپر دیا گیاہے۔

اسی طرح باغات کی مروجہ خرید وفروخت کہ ٹھیکہ دار پھل درختوں پر چھوڑ دیتاہے،جس کو فقہاء کرام بشرط ترک ناجائز کہتے ہیں لیکن اگر چھوڑنے یا نہ چھوڑنے کی صراحت نہ ہو، تو عرف ہی وجہ سے جواز کا دیاہے۔حالانکہ یہاں بھی شرط ذکر نہ کرنا بمنزلہ ذکر ہے، کیونکہ عرف میں یہی مشہور ہے کہ ٹھیکہ دار پھل درختوں پر چھوڑتاہے اور نہ ہی ٹھیکہ دار فوراکاٹنے کی نیت اورارادہ سے سودا کرتاہے ،اوراس میں احدالمتعاقدین کا فائدہ بھی ہے ،کیونکہ مالک زمین کی زمین اور درختیں زیراستعمال ہیں اوراس پر مزید یہ کہ کچھ پھل ظاہر ہوتے ہیں سودا انہی پر ہوتاہے بعد میں آنے والے پھل اگرچہ معدوم ہے، لیکن اس کو موجود کے تابع شمار کیاجاتاہے ،ان سب ممنوعہ وجوہات کے باوجود فقہاء نے عرف کی وجہ سے جواز کا فتوی دیاہے۔کہ عدم جواز کے فتویٰ سے لوگ مشقت اور حرج میں پڑجائیں گے۔

(تفصیل کے لیے تقریر ترمذی شریف: ج۱، ص ۹۴)

واضح رہے:

دارالعلوم کراچی کے فتوی میں دی گئی درج ذیل عبارت سے بھی انہوں نے المعروف کالمشروط کے لیے شرط کی شہرت کا حکم لگایا ہے۔یعنی کہ شرط اس قدر معروف ہو، کہ ذکر کیے بغیر بھی ان کو ضروری طورپر ذکر کیاجانا معتبر جاناجاتا ہو۔

"العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرطالمبحث الثالث :العادة المطردة هل تنزل منزلةالشرط ؟قال في إجارة الظهيرية : والمعروف عرفا كالمشروط شرعا انتهى وقالوا في الإجارات : لو دفع ثوبا إلى خياط ليخيطه له أو إلى صباغ ليصبغه له ولم يعين له أجرة ثم اختلفا في الأجر وعدمه وقد جرت العادة بالعمل بالأجرة : فهل

ينزل منزلة شرط الأجرة فيه اختلاف قال الإمام الأعظم : لا أجرة له وقال أبو يوسف رحمه الله : إن كان الصابغ حريفا له أي معاملا له فله الأجر وإلا لا وقال محمد رحمه الله : إن كان الصابغ معروفا بهذه الصنعة بالأجر وقيام حاله بها : كان القول قوله وإلا : فلا اعتبارا للظاهر المعتاد وقال الزيلعي : والفتوى على قول محمدرحمه الله انتهولا خصوصية لصابغ بل كل صانع نصب نفسه للعمل بأجرة فإن السكوت كالاشتراط.."

(الاشباہ والنظائر:العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرط)

مذکورہ بالاعبارت میں فتوی امام محمدؒ کے قول پر دیا گیاہے ،وجہ شہرت ہے کہ اگررنگ سازاپنے فن میں مشہور ہواور تاحال اسی پیشہ سے وابستہ ہوتوانہی کا قول معتبر ہوگا۔

"ومذهب الحنفية المنع عن المرجوح حتى لنفسه لكون المرجوع صار منسوخا اهـ فليحفظ، وقيده البيري بالعامي أي الذي لا رأي له يعرف به معنى النصوص حيث قال: هل يجوز للإنسان العمل بالضعيف من الرواية في حق نفسه، نعم إذا كان له رأي، أما إذا كان عاميا فلم أره، لكن مقتضى تقييده بذي الرأي أنه لا يجوز للعامي ذلك. قال في خزانة الروايات: العالم الذي يعرف معنى النصوص والأخبار وهو من أهل الدراية يجوز له أن يعمل عليها وإن كان مخالفا لمذهبه اهـ.قلت: لكن هذا في غير موضع الضرورة، فقد ذكر في حيض البحر في بحث ألوان الدماء أقوالا ضعيفة، ثم قال: وفي المعراج عن فخر الأئمة: لو أفتى مفت بشيء من هذه الأقوال في مواضع الضرورة طلبا للتيسير كان حسنا. اهـ. وكذا قول أبي يوسف في المني إذا خرج بعد فتور الشهوة لا يجب به الغسل ضعيف، وأجازوا العمل به للمسافرأو الضيف الذي خاف الريبة كما سيأتي في محله وذلك من مواضع الضرورة."

(مقدمہ ،ردالمحتار،مطلب: مطلب لا يجوز العمل بالضعيف حتى لنفسه عندنا)

"ولأن القياس في الكثير أن يتنجس أيضاً لأن الجزء الذي لاقاه النجاسة يتنجس بملاقاة النجاسة إياه كما في غير الماء من المائعات وإذا تنجس ذلك الجزء والذي يجاوره ثم وثم حتى يصير الكل نجساً كما في غير الماء من المائعات لكن تركنا القياس في الكثير لأجل الضرورة لأن صونالكثير بالأواني غير ممكن والضرورة في القليل لأن صون القليل بالأواني ممكن فنعمل في القليل بالقياس....."

(المحيط البرهانی،الفصل الرابع فی المياه التی يجوزالتوضوء)

بنابریں دورحاضر کی مادہ پرست اور ہوس پرست انسان کامفت قرض دیناا گرچہ ناممکن نہیں ہے ،لیکن مشکل ضرورہے اور بینک سے قرض لینے پر صریح سود دیناپڑتاہے ،تاہم کتب فقہ میں حاجت اور مشقت کی اکثر مثالوں کا تعلق خرید وفروخت اور اجارہ سے ہیں،اور تعامل امت کی وجہ سے بناء برحاجت جواز کافتوی دیا گیاہے۔

جہاں تک صورت مسؤلہ ہے ،اس کا تعلق قرض دے کر نفع اصول کرنے سے ہے :

ایک تو یہ ہے کہ یہ حاجت اور مشقت تعامل کی حدتک نہیں پہنچی ہے ،جس کو بنیاد بناکر جواز کا فتوی دیاجائے ،کیونکہ رخصت کی تین صورتیں بنتی ہیں ،یہ ان میں سے کوئی نہیں ہے ،اسی طرح حاجت کی دونوں قسموں میں سے بھی نہیں بن سکتی ہے کیونکہ نہ جواز کی صراحت ذکرہے اورنہ ہی تعامل امت ہے ،اور دوسرایہ ہے کہ جواز کے فتویٰ دینے سے ہر فیکٹری والے (شوگرملز ،آٹاملز ،گھی ملزیادیگر کارخانے وغیرہ) کے لیے قرض پر نفع لینے یادینے کا جواز مل جائیگا۔مثلا: فیکٹری والے مالک

دوکاندار کو قرض دے اور پھر مالک دوکان سامان اسی متعلقہ فیکٹری سے خرید لے۔حالانکہ یہ صورت زیادہ درپیش ہے ،کیونکہ تجارت کا معاملہ بنسبت زراعت زیادہ ہے،جب کہ یہاں کسی نے جواز کا فتویٰ نہیں دیاہے۔اور یہاں پر مذہب غیر پر بھی فتویٰ نہیں دیاجاسکتاہے ،کیونکہ پہلے تو اس کی تصدیق نہیں ہے ،کہ وہاں جواز کا فتویٰ موجود ہے اور دوسرا یہ ہے کہ مذہب غیر پر فتوی دینے کے لیے چارشرطیں ہیں :

- ✓ ضرورت شدیدہ ہواورایسی درپیش حاجت ہو،جس سے کوئی چھٹکارانہ ہو۔جیسے :زوجہ عنین،زوجۃ المفقود،اورمتعنت ،یامسلم فیہ کاوقت آنے سے قبل موجودنہ ہونااوریاعروض میں شرکت وغیرہ۔
- ✓ اس میں ایک مفتی کافتویٰ نہ ہو،بلکہ دیگر مفتیان عظام بھی اس فتویٰ میں شریک ہوں۔
- ✓ مذہب پر فتویٰ دینے کی صورت میں متعلقہ مذہب کے مسائل پر کافی دسترس حاصل ہو۔
- ✓ دیاگیافتویٰ شاذاقوال پر مبنی نہ ہو۔

(تفصیل کے لیے :اصول افتاء وادابہ :ص ۲۰۵)

اور اس سے بڑھ آقا دوعالم ،شافع محشر، محمد مصطفیٰ ﷺ کافرمان : لیأتین علی الناس زمان لایبقیٰ أحد الاأکل الربا،فان لم یأکلہ أصابہ من بخارہ ۔اوکماقال ﷺ ۔یعنی لوگوں پر ایک زمانہ ضرورآئے گاکہ جس میں وہ یاتوسود کھائیں گے اوریااس کو سود کادھواں پہنچے گا۔

لہٰذامفتیان کرام کی خدمت میں یہ عرض ہے ،کہ مذکورہ بالاوجوہات کو دیکھتے ہوئے پہلے عموماتوکھلی چوٹ سے بچنے کی خاطر عدم جواز کا فتویٰ دےاور خصوصاجب کوئی مستفتی آئے،توبذریعہ دعوت ان کوترغیب دے،کہ کسی سے قرض حسنہ لے لیں اورقرضہ نہ ملنے کی صورت میں بوجہ حرج ومشقت جواز کا فتویٰ دے۔

واضح رہے : اس وقت جواز کی صورت حاجت کی دوسری قسم میں داخل ہوگی،کہ جہاں صریح ممانعت نہ ہو البتہ جواز حرج اورمشقت کی وجہ سے بوجہ تعامل امت درست ہو۔

واللہ اعلم بالصواب۔

السید کلیم اللہ الحرمزئی۔

- ❖ طویل المیعاد قرضوں پر زکوۃ کا حکم۔
- ❖ زیادہ قسطوں والے کاروبار والوں کے لیے قربانی اور زکوۃ۔
- ❖ خرید و فروخت کے دوران بائع کا زکوۃ کی نیت کرنا۔
- ❖ بیوی کو سونا حوالہ نہ کرنے کی صورت میں زکوۃ اور قربانی۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

زید کپڑے کا کاروبار کرتا ہے' چنانچہ وہ بڑی مقدار میں کپڑے درآمد کرتا ہے' بعض اوقات وہ یکمشت رقم آدا نہیں کرتا ہے' بلکہ کئی مہینے تک قسطیں آدا کرتا رہتا ہے' زید کے پاس غریب گاہک بھی آتے ہیں' وہ ادھار پر کپڑے خریدتے ہیں' کبھی غریب لوگ سابقہ رقم ادا کیے بغیر نیا سوٹ لیتے ہیں' زید اس نئے سوٹ کی قیمت لے کر انہیں یہ کہہ دیتا ہے: کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے۔اس میں زید یہ نیت کرتا ہے' کہ نیا سوٹ میں زکوۃ کی مد میں دیتا ہوں اور اس نئے سوٹ کی مثلا: دوہزار روپے' پرانے سوٹ کی دوہزار روپے سابقہ قرض سمجھ کر وصول کرتا ہوں اور دوبارہ یہی دوہزار روپے زکوۃ کی مد میں دیتا ہوں۔ گویا کہ زید کا سابقہ اور موجودہ دونوں سوٹ زکوۃ کی مد میں شمار ہوئے۔

اب پوچھنا یہ ہے:

1. ...زید دوران تجارت لاکھوں روپے مقروض ہوتا ہے' کیا شریعت میں اس کے مقروض ہونے کا اعتبار ہے؟

2. ...چودہ' پندرہ مہینوں تک قسطیں آدا کرنے سے زید کی زکوۃ اور قربانی پر اثر پڑتا ہے؟ حالانکہ زید یہ اپنے کاروبار کا پیمانہ وسیع تر ہونے کے بجائے مختصر بھی کر سکتا ہے؟

3. ...کبھی زید کے ساتھ سرمایہ کاری میں دوسرے لوگ بھی شریک ہوتے ہیں' ان کی زکوۃ اور قربانی کا کیا حکم ہے؟

4. ...زید کا غریبوں کو سوٹ فروخت کرنا اور اور پیسے وصول نہ ہونے کی صورت میں نئے سوٹ کی قیمت وصول کر کے دوبارہ زکوۃ کی نیت سے دینا اور نئے سوٹ کو بھی زکوۃ کی مد سے شمار کرنا درست ہے؟

5. ...زید نے بیٹے کی شادی میں بیٹے کی اہلیہ (بہو) کے لیے سونا خریدا' لیکن تاحال سونا نہ بیٹے کو حوالہ کیا ہے' اور نہ ہی اس کی بیوی کو دیا ہے' یعنی سونا خرید کر گھر میں رکھا۔اب قربانی اور زکوۃ کس کے ذمہ ہے؟

الجواب حامداومصليا

ویسے تو شرعی اصول کے مطابق اصل سرمایہ سے قرضے نکال کر بقایا سرمایہ پر زکوۃ اور قربانی کا حکم لگتا ہے' لیکن کاروبار کی وسیع تر اقسام اور طویل قرضوں اور لمبے قسطوں کے پیش نظر متاخرین نے فتوی میں ترمیم کی' کہ طویل المیعاد قرضے' یا طویل قسطوں میں ایک سال کی مدت کا اعتبار ہوگا' فقہا نے اس کو مہر مؤجل کے درجہ میں رکھ کر غیر مانع قرار دیا ہے۔

لہذا ایک سال کے بعد والے قرضے' یا قسطیں منہا کرنے کے بعد نصاب کے پورا ہونے پر زکوۃ اور قربانی واجب ہو گی۔

لہٰذا :

اول...3...2...1 تینوں صورتوں میں حکم مذکورہ بالاعبارت کے مطابق ہوگا۔

''وزاد القہستانی عن الجواہر:والصحیح انہ غیرمانع۔''

(ردالمحتار : ج۳'ص ۱۷۷'ط : الریاض)

''وقال بعض مشائخنا :ان المؤجل لایمنع؛لانہ غیرمطالب بہ عادۃ۔''

(بدائع الصنائع : ج ۲'ص ۳۸۴'ط : بیروت)

''وذکرالبزدوی فی شرح الجامع الکبیر،قال مشائخنا:فی رجل علیہ مہرمؤجل لامراتہ ،وھو لایرید آدئہ ،لایجعل مانعا من الزکاۃ ؛لعدم المطالبۃ فی العادۃ،وانہ حسن ایضا۔''

(الفتاوی الھندیۃ : ج۱'ص ۱۹۰'ط : بیروت)

نوٹ : معاصر علماکرام نے اسی پر فتوی دیاہے۔البتہ فتاوی قاسمیہ میں فتوی عام اصول کے مطابق دیاگیاہے 'کہ ہر قرض منہاکیاجائے گا چاہے اس کا فوری مطالبہ کیاجاتاہو اور یالمبے قسطوں میں کیاجاتاہو۔

تفصیل کے لیے : (فتاوی قاسمیہ : ج ۱۰'ص ۳۷۸)

4. ....صورت مسئولہ میں زکوۃآدانہیں ہوئی۔

یادرہے :

گاہک کوصاف اورصراحتا کہناچاہیے 'کہ یہ رقم میں زکوۃ کی مدمیں دیتاہوں۔ورنہ مبادلۃالمال بالمال (مال کامال کے ساتھ تبادلہ) کی وجہ سے یہ بیع ہوگی۔

چنانچہ فتاوی عبادالرحمٰن میں اسی سے ملتی جلتی ایک صورت کے متعلق یوں فتویٰ دیاگیاہے :

کیافرماتے ہیں علمائے کرام اورمفتیان عظام اس مسئلہ کے بارے میں 'کہ میں نے کسی کو چھوٹی کتاب دی ہے 'اب ایک بڑی کتاب مانگ رہاہے 'تومیں نے اس سے کہا : کہ میری چھوٹی کتاب واپس کردو 'بڑی کتاب میں بطورزکوۃ دوں گا۔اب پوچھنایہ ہے : کہ اس بڑی کتاب میں میری زکوۃ کی نیت صحیح ہے 'یانہیں ؟یایہ مبادلۃالمال بالمال ہے۔

جواب: آپ نے چونکہ صراحت کی ہے کہ بڑی کتاب بطورزکوۃ دوں گا اس لیے یہ معاملہ کوئی بیع نہیں ہے زکوۃ کی نیت صحیح ہے بشرطیکہ وہ شخص مستحق زکوۃ ہو۔

لمافی البدائع :

''البیع لغۃ مقابلۃ شئی بشئی علی وجہ المعاوضۃ ۔''

(ج ٦ ص ٥٢٧ ط: دارالکتب العلمیہ)

(ماخوذ از : فتاوی عبادالرحمٰن : کتاب الزکوۃ : ج ٣ ص ٥٥١ ط : دارالافتا والتحقیق)

ورنہ جہاں مبادلۃ المال بالمال کی صورت نہ بنتی ہو وہاں زکوۃ کی نیت سے زکوۃ آدا ہو گی چاہے دینے والا جو بھی کہے ہبہ کا لفظ کہے یا صدقہ اور تحفہ وغیرہ۔

''دفع الزکوۃ الی صبیان اقاربہ برسم عید اوالی مبشر اومہدی الباکورۃ ،جاز الااذا نص علی التعویض۔''

(الدرالمختار:کتاب الزکوۃ ،ج ٣،ص ٣٠٤،ط: امدادیہ)

5. ....پانچویں صورت میں چونکہ ملک تاحال زید کے والد کی ہے بہو کے تصرف میں نہ دینے کی وجہ سے ملک ناقص ہے اس لیے زکوۃ بھی زید ہی کے ذمہ ہو گی۔

تفصیل کے لیے فتاوی عبادالرحمٰن : (کتاب الزکوۃ عنوان : بچیوں کے نام پر سونا رکھنے کا حکم : ج ٣ ص ٤٨٥)

''وثمنیۃ المال کالدراھم والدنانیر؛لتعینھا للتجارۃ بأصل الخلقۃ ،فتلزم الزکوۃ کیفاامسکھا،ولو للنفقۃ۔''

(ردالمحتار : کتاب الزکوۃ : ج ٢ ص ٢٩٤ ط : سعید)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- خود کو عوضی ٹیچر کی جگہ پیش کرنا
- کسی اور کو اپنی جگہ عوضی معلم بنانا
- عوضی ٹیچر بنانے والے کی امامت
- مدرس کا طویل رخصت لینے کی صورت میں تنخواہ لینا
- معروف چھٹیوں کی تنخواہ لینا
- وقف خاص کو دوسری مد میں لگانا
- مہتمم کا کسی ضرورت مند استاد کو وقف سے قرض دینا
- منقولی چیزوں کا وقف

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

ایک سرکاری/نیم سرکاری ملازم اپنی جگہ دوسرے شخص کو عوضی مقرر کرلیتاہے اوراس کواپنی تنخواہ سے مخصوص رقم دیتاہے، پھروہی شخص اس ملازم کے ذمہ سپرد کئے ہوئے امورسرانجام دیتاہے۔مثلا: اس کی جگہ پڑھاتاہے اورہروہ ڈیوٹی دیتاہے، جس کاملازم سے مطالبہ ہو:

- کیاملازم کے لیے کسی دوسرے شخص کواپنی جگہ عوضی مقرر کرنااور تنخواہ لیناشرعاجائزہے، یانہیں؟
- دوسرے استاد کے لیےایسا عمل کرنااوراجرت لیناشرعاجائزہے، یانہیں؟
- ایسے شخص کی امامت کاکیاحکم ہے، جودوسرے کواپنی جگہ عوضی مقرر کرتاہے، یادوسرے شخص کی جگہ بطورعوض کام کرتاہے؟

کسی نے مدرسہ کے مہتمم کورقم دے کریوں کہا:

اس سے طلبا کے لیے کپڑے خریدو۔

- کیامہتمم اس رقم کودیگرضروریات (مثلا: طلبا کے لیے کتابیں خریدنا) میں صرف کرسکتاہے؟
- اگرکتابوں کی ضرورت زیادہ ہو، تب کیاحکم ہے؟
- کیامہتمم رقم دینے والے سے دوبارہ رجوع کرسکتاہے کہ میں اس رقم سے طلبا کے لیے کتابیں خریدتاہوں؟
- کیامذکورہ بالاصورت میں واقف اپنے وقف میں تبدیلی کرسکتاہے؟
- کیارقم (منقولی چیزیں) وقف کرنادرست ہے؟
- مدرسہ کااستاد مہینہ بھرمریض ہو، کیاوہ تنخواہ لینے کاحق رکھتاہے؟
- اسی طرح ایک استاد ضرورت مند ہو، کیامہتمم مدرسہ کی رقوم سے اس کی ضرورت پوری کرسکتاہے؟
- سرکاری اسکول میں پرنسپل ایک مخصوص فنڈ (اسپورٹس کے لیے مختص رقم) دوسری مد میں استعمال کرسکتاہے؟

الجواب حامداومصليا

عوضی ٹیچر/ملازم:

عوضی ٹیچر/ملازم (اگرچہ پڑھانے/کام کرنے کی صلاحیت رکھتاہو) کے لیے کسی دوسرے شخص کواپنی جگہ عوضی مقرر کرکےاپنی تنخواہ سے کچھ معاوضہ اس کودینااوربقیہ تنخواہ لیناشرعاجائزنہیں ہے۔

واضح رہے:

اگرکسی شخص کواجرت کے عوض کوئی کام دیاجائےاوراس کی نوعیت اس طرح ہو،کہ ہر کوئی کرسکتاہو،اورہرکسی کواجازت ہو،تودرست ہے،ورنہ درست نہیں ہے۔

حکومتی تعلیمی بورڈکی طرف سےامتحان لینے کے مختلف مراحل ہوتے ہیں،انہی مراحل سے گزرکراستاد کاانتخاب ہوتاہے،جس کامطلب یہ ہوتاہے،کہ تعلیمی بورڈکسی اور کے پڑھانے پرراضی نہیں ہے،بلکہ وہ اسی منتخب شدہ استاد کی صلاحیتوں پرراضی ہے۔

قال فی ردالمحتار:

''(واذاشرط عملہ بنفسہ)بان یقول لہ:اعمل بنفسک اوبیدک(لایستعمل غیرہ الاالظئرفلهااستعمال غیرها)بشرط وغیرہ ،خلاصۃ.(وان اطلق کان لہ)ای للاجیر ان یستاجر غیرہ۔''

(کتاب الاجارۃ)

''الاجیرالذی استوجرعلی ان یعمل بنفسہ لیس لہ ان یستعمل غیرہ ،مثلا:لواعطی احد جبۃ علی ان یخیطهابنفسہ بکذا درهم ،فلیس للخیاط ان یخیطهابغیرہ ،وان خاطها بغیرہ ،فتلفت فهو ضامن ۔۔۔لواطلق العقد حین الاستئجار فللاجیر ان یستعمل غیرہ۔''

(شرح المجلۃ،کتاب الاجارہ،المادۃ:572/2،571)

یادرہے:

<u>اجیر کی اجرت دوبنیادی نکتوں کی بنیادپر متعین کی جاتی ہے:وقت اور عمل۔۔۔۔اب اگراجیر نہ وقت دے اورنہ ہی عمل کرے تواجرت لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔</u>

''والاجارۃ لاتخلو:اما ان تقع علی وقت معلوم اوعمل معلوم،فان وقعت علی عمل معلوم فلاتجب الاجرۃ الاباتمام العمل ۔۔۔وان وقعت علی وقت معلوم ،فتجب الاجرۃ بمضی وقت۔''

(النتف فی الفتاوی :کتاب الاجارۃ)

<u>اوراجیرخاص کے لیے دوران مدت اپنے آپ کو حوالہ کرناضروری ہے۔</u>

والاجیرالخاص :الذی تستحق الاجرۃ بتسلیم نفسہ فی المدۃ۔

(الهدایۃ،کتاب الاجارۃ،باب ضمان الاجیر:312/3)

(شرح المجلۃ،لسلیم رستم باز،المادۃ:571،کتاب الاجارۃ)

خود عوضی ٹیچر/ملازم کے لیے پڑھائی/کام کی اجرت:

عوضی ٹیچر یاملازم جو اس کام سے بخوبی واقف ہو،اور بہتر طریقے سے اس کو نبھار ہاہو،تواس کو لیے اجرت لینادرست ہے۔البتہ خلاف اولیٰ اور مکروہ ہے،کیونکہ حکومتی ریکارڈ میں اس کا باقاعدہ نام نہیں ہے۔اور نہ ہی اس کے ساتھ عقدملازمت ہواہے۔

ذیل میں عربی عبارت لکھی جاتی ہے،اس کی روشنی میں مسئلہ کی وضاحت ہوجائے گی۔

’’قولہ:بان یقول :اعمل بنفسک اوبیدک)ھذا ظاہراطلاق المتون،وعلیہ الشروح ۔فمافی البحر والمنح عن الخلاصۃ من زیادۃ قولہ ولاتعمل بیدغیرک۔فالظاہرانہ لزیدالتاکید،لاقیداحترازی؛لیکون بدونہ من الاطلاق ۔تامل۔(قولہ:لایستعمل غیرہ)ولوغلامہ اواجیرہ ۔قہستانی؛لان علیہ العمل من محل معین،فلایقول غیرہ مقامہ۔کمااذاکان المعقودعلیہ المنفعۃ،بان استاجر رجلاشہرا للخدمۃ لایقوم غیرہ مقامہ؛لانہ استیفا للمنفعۃ بلاعقد۔زیلعی۔قال فی العنایۃ:وفیہ تامل؛لانہ ان خالفہ الی خیربان استعمل من ھو اصنع منہ اوسلم دابۃ اقوی من ذلک ینبغی ان یجوز۔واجاب السائحی بان مایختلف بالمستعمل فان التقیدفیہ مفید،وماذکرمن ھذاالقبیل اھ۔وفی الخانیۃ:لودفع الی غلامہ اوتلمیذہ لایجب الاجر۔وظاہرھذا مع التعلیل المارانہ لیس المرادبعدم الاستعمال حرمۃ الدفع مع صحۃ الاجارۃ واستحقاق المسمی او مع فسادھا واستحقاق اجر المثل ،وانہ لیس للثانی علی رب المال متاع شیئ لعدم العقد بینھمااصلا۔وھل لہ علی الدافع اجرالمثل؟محل التردد۔فلیراجع۔قولہ :بشرط وغیرہ)لکن سیذکرہ الشارح فی الاجارۃ الفاسدۃ عن الشرنبلالیۃ انھا لودفعتہ الی خادمھا اواستاجرت من ارضعتہ لھاالاجر الااذاشرط ارضاعھا علی الاصح۔وکان اوجہ ماھنھاان الانسان عرضۃ للعوارض فربمایتعذر علیھاارضاع الصبی فیتضرر ،فکان الشرط لغوا۔تامل۔قولہ :وان اطلق)بان لم یقید بیدہ وقال: خط ھذاالثوب لی اواصبغہ بدرھم مثلا؛لانہ بالاطلاق رضی بوجودعمل غیرہ۔قھستانی۔‘‘

(کتاب الاجارۃ)

’’الااذاشرط ان لایخدم غیرہ ولایرعی لغیرہ ،فیکون خاصا۔‘‘

(کتاب الاجارہ،باب ضمان الاجیر)

مذکورہ بالاعبارت میں فقہا کرام کا اختلاف اس مسئلہ میں واضح ہے،کہ اگرکسی اجیراورملازم سے کہاگیا: یہ کام اپنے کرناہے،جب کہ اس نے برعکس کسی اورسے کرایا۔توکیااس کے لیے ایسا کرنادرست ہے؟اگردرست ہے،تواجرت کیاہوگی؟اوراگردرست نہیں ہے،تواجرت کاکیاحکم ہوگا؟

جس نتیجہ پرراقم حروف پہنچاہے،وہ یہ ہے،کہ مسئلہ کی چندصورتیں ہیں:

- اگردوسرابندہ نہ کام جانتاہو،اورنہ ہی اسی طرح مہارت رکھتاہو،تونہ یہ عمل درست ہے اورنہ ہی اجرت کامستحق ہے۔
- اوراگرکام جانتاہوتاہم کرایہ پرلینے والی ایسی چیزہو(مثلا:گاڑی وغیرہ)جواستعمال کرنے سے تبدیل ہوتی ہو،

یعنی کام کی نوعیت جاننے کے باوجود وہ چیز ایسی ہو، جو لوگوں کے استعمال سے اثر قبول کرتی ہو تب بھی اجیر اور ملازم کے لیے نہ کسی اور کو دینا درست ہے اور نہ ہی اجرت کا مستحق ہے۔

''وانہ لیس للثانی علی رب المال متاع شیئ لعدم العقد بینھمااصلاوھل لہ علی الدافع اجر المثل؟محل التردد.فلیراجع.''

کیااس صورت میں کام لینے والا مالک کی اجازت کے بغیر کام دینے والے اپنی اجرت کا مطالبہ کر سکتا ہے؟

(بظاہر کر سکتا ہے، کیونکہ وہ اپنے عمل کا اجرت مانگتا ہے،اور جس سے مانگتا ہے اس سے باقاعدہ عقد کیا ہوا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔)

- اور اگر دوسرا بندہ اس کو بہتر اور مہارت کے ساتھ سرانجام دیتا ہو اور نہ ہی استعمال سے فرق پڑتا ہو، تو حوالہ کرنا درست ہے۔ البتہ نامناسب ضرور ہے، ضرورت کے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔
- اور اگر اجیر اور ملازم پر کوئی قید نہ ہو، تو اجیر وہ خود بھی کر سکتا ہے اور کسی اور سے بھی کرا سکتا ہے۔

عوضی ٹیچر کی امامت:

کام کیے بغیر اجرت لینے والا گناہگار ہے، ایسے شخص کو امام نہ بنایا جائے۔ بہتر یہی ہے، کہ متقی اور پرہیزگار شخص کے پیچھے نماز پڑھی جائے، بصورت مجبوری اکیلے نماز پڑھنے سے فاسق کے پیچھے باجماعت پڑھنا بہتر ہے۔

''وفی النھرعن المحیط:صلی خلف فاسق اومبتدع نال فضل الجماعۃ.(قولہ:نال فضل الجماعۃ)افاد ان الصلاۃ خلفھااولی من الانفراد،لکن لاینال کماینال خلف تقی ورع؛لحدیث من صلی خلف عالم تقی ،فکانما صلی خلف نبی.۔..ویکرہ امامۃ عبد.۔..وفاسق (قولہ:وفاسق)من الفسق:وھوالخروج عن الاستقامۃ ،ولعل المراد بہ من یرتکب الکبائر کشارب الخمر،والزانی،وآکل الربا ونحوذلک.۔..''

(الشامیۃ:باب الامامۃ)

خلاصہ:

اپنی جگہ پر عوضی مقرر کر کے کچھ تنخواہ اس کو دینا اور بقیہ خود وصول کرنے والا دھوکہ باز اور خائن ہے، جو بحکم فاسق ہے۔ اور فاسق کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے۔

اور ایمانداری سے کام کرنے والا عوضی ملازم/ٹیچر خلاف قانون کا ارتکاب کرنے والا ہے، اور اس پر مزید یہ ہے، کہ ایک ملازم کو فارغ کر کے اس کے گناہ میں معاون بن رہا ہے اور اس کو اس جرم عظیم پر دلیر بنانے کا ذریعہ بھی بن رہا ہے۔ اس کے پیچھے

نماز مکروہ تنزیہی ہے۔اور اگر اس تعاون میں مسلسل شریک ہے،ممانعت کے باوجود بھی باز نہیں آتا ہے، تو پھر اس کے پیچھے بھی نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔

وقف کی مد میں تصرف:

وقف کی چیزوں میں قدر تفصیل ہے :

- کسی نے طلبہ کے لیے زکوۃ کی رقم مہتمم مدرسہ کو دیدیا، مہتمم نے مشہور حیلہ تملیک کیا،اب تملیک کے بعد گویا کہ یہ رقم طالب العلم / مہتمم کی ہوگئی،اس کی اپنی مرضی جہاں خرچ کرنا چاہے، خرچ کر سکتا ہے۔

لمافی الشامیة،کتاب الزکاة ، مطلب فی زکاة ثمن المبیع وفاء،269/2)
"(و قدمنا ان الحیلۃ ان یتصدق علی الفقیر ثم یامرہ بفعل ھذہ الاشیاء ، و ھل لہ یخالف امرہ ؟لم ارہ و الظاھر نعم)البحث لصاحب النھر و قال لانہ مقتضی صحۃ التملیک ،قال الرحمتی : و الظاھر ا نہ لاشبۃ فیہ لانہ ملکہ ایاہ عن زکوۃ مالہ و شرط علیہ شرطا فاسدا و الھبۃ و الصدقۃ لا یفسدان با لشرط الفاسد "

- اور اگر رقم دے کر یوں کہا: کہ اس پیسوں سے طلبا کے لیے کتابیں خریدو، تو اس وقت مذکورہ رقم کتابوں کی مد میں خرچ کرنے کا وکیل ہے۔اور وکیل کا حکم ذیل عبارت سے معلوم ہوگا۔

لما فی شرح المجلۃ ، کتاب الوکالۃ ، المادۃ:(1479ص:1/694)
"اذا قید ت الوکالۃ بقید فلیس للوکیل مخالفتہ فان خالف لاینفذ شراؤہ علی الموکل و ماشتراہ فھو لنفسہ ولکن اذا خالف بما ھو اکثر فائدۃ للموکل فلا یعد ذالک مخالفۃ فی المعنی -------و الحاصل ان المخالفۃ اذا کانت فی الجنس فھی غیر جائزۃ سواء کانت الی خیر او الی شر و ان کانت فی القدر او الوصف فان الی خیر جازت و ان الی شر فلا "
لما فی الاشباہ والنظائر مع حاشیة الحموی :(278/2،کتاب الوکالة)
الاصل ان الموکل اذا قید علی وکیلہ فان کان مفیداً اعتبر مطلقاً و الا لا ،وان کان نافعا من وجہ ، ضارا من وجہ ،فان اکدہ بالنفی اعتبر و الا لا ، و فی حاشیۃ الحموی :قولہ : و ان کان نافعاً من وجہٍ ضاراً من وجہٍ کما لو قال :بعہ فی سوق کذا فباع فی غیرذلک السوق جاز ، لان ھذا شرط قد ینفعہ و قد لا ینفعہ"
لمافی الشامیة،کتاب الزکاة ، مطلب فی زکاة ثمن المبیع وفاء:(2/269)
"و ھنا الوکیل انما یستفید التصرف من الموکل وقد امرہ بالدفع الی فلان فلا یملک الدفع الی غیرہ "
لمافی الفقه الحنفی و ادلته کتاب الزکاة:(1/340)
"اما اذا عین الغنی الفقیر للوکیل لم یجز لہ ان یدفع الزکاۃ الی غیرہ "
لما فی الاشباہ والنظائر ،کتاب الوقف ،الفن الثانی :(106/2)
لان شرط الواقف یجب اتباعہ لقولہم :شرط الواقف کنص الشارع :ای فی وجوب العمل بہ ، وفی المفہوم و الدلالۃ "

(وکذافی فتاوی دار العلوم زکریا، کتاب الزکوۃ، وکیل کا موکل کے خلاف زکوۃ کی رقم خرچ کرنے کا حکم : 3/219)
''الوکیل اذاخالف ان خلافا الی خیرفی الجنس کبیع بالف درھم ،فباعہ بالف ومأئۃ نفذ۔

ولوبمأئۃ دینار لا،ولوخیرا۔خلاصۃ،ودرر۔''

(الدرالمختار:521/5،ط:ایچ،ایم،سعید)

تفصیل کے لیے : (فتاوی عبادالرحمٰن ،کتاب الوقف : 268/5،ط : دارالافتا والتحقیق، کراچی)

مذکورہ بالاعبارات سے یہ نتیجہ اخذ کیاجاسکتاہے، کہ جوچیز بہتر ہو، مہتمم اس مد میں بحیثیت وکیل وہ رقم خرچ کرسکتاہے۔

- اور اگر رقم دے کر مزید کچھ وضاحت نہ کی، تو مہتمم کی مرضی ہے، وہ ضرورت کے وقت جہاں خرچ کرنا چاہے، خرچ کرسکتاہے۔
- اگر رقم دے کرایک مخصوص مد میں صرف کرنے کی وضاحت کی۔مثلا: یوں کہا: کہ اس رقم سے طلبا کے لیے کتابیں خریدو۔اب کتابوں سے زیادہ ٹیبل اور ٹاٹ وغیرہ کی ضرورت زیادہ ہو، تو وکیل یہ مخصوص مد کی رقم میں تبدیلی کرکے بہتر اور نفع بخش مد میں صرف کرسکتاہے۔

''الوکیل اذاخالف ان خلافا الی خیرفی الجنس کبیع بالف درھم ،فباعہ بالف ومأئۃ نفذ۔

ولوبمأئۃ دینار لا،ولوخیرا۔خلاصۃ،ودرر۔''

(الدرالمختار:521/5،ط:ایچ،ایم،سعید)

یادرہے :
عام فتاوی کی روشنی میں کسی وکیل کے لیے مقرر کیاہوا مخصوص مد کو چھوڑ کر کسی اور مد میں صرف کرنا درست نہیں ہے۔

تفصیل کے لیے : فتاوی عثمانیہ۔۔۔۔فتاوی قاسمیہ۔۔۔کتاب الوقف۔

تاہم صورت مسئولہ کاجواب عام فتاوی کے برعکس دیاگیا۔کیونکہ : وکیل موکل کے حکم کے خلاف کرکے انفع چیز خرید سکتاہے۔جس سے یہ نتیجہ اخذ کیاجاسکتاہے، کہ مہتمم اور متولی بھی مخصوص مد کی رقم نفع بخش مد میں استعمال کرسکتاہے۔(واللہ اعلم بالصواب۔)

- البتہ اگر رقم دینے والے نے اس کی صراحت کی ہو، کہ فلان مد میں خرچ کرو، کسی اور مد میں خرچ نہ کرنا، تو مہتمم کو کسی اور مد میں استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

’’فان اکدہ بالنفی اعتبر و الا لا ،‘‘
(الشامیۃ)

الااذاشرط ان لایخدم غیرہ ولایرعی لغیرہ ،فیکون خاصا۔

(کتاب الاجارہ،باب ضمان الاجیر)

"اما اذا عین الغنی الفقیر للوکیل لم یجز لہ ان یدفع الزکاۃ الی غیرہ "
(لما فی الاشباہ والنظائر ،کتاب الوقف ،الفن الثانی :106/2)

وقف میں تبدیلی:

بغیر کسی عذر شدید کے وقف کو تبدیل کرنادرست نہیں ہے

’’واذا صح الوقف لم یجز بیعہ ولاتملیکہ،ولاقسمتہ۔۔۔‘‘

(الفقہ الاسلامی وادلتہ،الباب الخامس،الوقف،الفصل الثالث:حکم الوقف:7671/10)

’’قلت:وفی مختارات النوازل لصاحب الھدایۃ:فقیر مات فجمع من الناس الدراھم ،وکفنوہ وفضل شیئ،ان عرف صاحبہ یرد علیہ،والایصرف الی کفن فقیر اخر،او یتصدق بہ۔‘‘

(الشامیۃ102/3)

وقف میں تبدیلی کے لیے واقف سے رجوع کرنا:

وقف کے بعد چیز واقف کی ملک سے نکل کراللہ تعالیٰ کی ملک میں منتقل ہو جاتی ہے،اس میں کسی کو بھی کسی قسم کے تصرف کا کوئی اختیار نہیں ہے۔اگرچہ وہ متولی کیوں نہ ہو۔

البتہ اگر مخصوص مد میں استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہے،توضائع ہونے سے بچنے کی خاطر کسی دوسری مد میں بقیہ ماندہ رقم وغیرہ استعمال کیاجاسکتاہے۔

’’بان بنی مدرسۃ ومسجداوعین لکل وقفا وفضل من غلۃ احدہما،لایبدل شرط الواقف ،وکذا اذااختلف الواقف لاالجہۃ یتبع شرط الواقف ،وقدعلم بہذاالتقریر اعمال الغلتین احیا للوقف ورعایۃ شرط الواقف،ھذاہوالحاصل من الفتاوی۔‘‘

(الفقہ الاسلامی وادلتہ،کتاب الوقف،الفصل الخامس استبدال الوقف وبیعہ حالۃ الخراب:7674/10)

مراعاۃ غرض الواقفین واجبۃ۔

(الشامیۃ،کتاب الوقف،مراعاۃ غرالواقفین:665/6)

خراب ہونے کی صورت میں :

’’جازللحاکم ان یصرف من فاضل الاخرعلیہ؛لانہماحینئذکشیئ واحد۔‘‘

(کتاب الوقف،مطلب:فی نقل انقاض المسجدونحوہ:551/6)

نقدرقم کا وقف :

بعض فقہا کے نزدیک پیسوں کا وقف درست ہے، کیونکہ اس کا عین برقراررکھ کراس سے استفادہ کیاجاسکتاہے۔مثلا:کسی کو رقم مضاربت کے طورپر دے کریوں کہے:کہ اس کا منافع آدھاآپ کو ملے گا اورآدھا میں مدرسہ کو دوں گا،کیونکہ یہ رقم میں نے مدرسہ کے لیے وقف کی ہے۔یہاں عین برقرار ہونے کے ساتھ ساتھ منافع مدرسہ کو دیاجارہاہے۔

منقولی چیزوں کا وقف :

ہراس چیزکاوقف درست ہے،جس سے نفع ہلاک کیے بغیرلیاجاسکتاہواورتعامل امت بھی وقف پر ہو۔پیسے اورنقدرقم سے چونکہ براۓراست نفع نہیں لیاجاسکتاہے،اس لیےاس کاوقف درست نہیں ہے۔جن حضرات نےامام مالکؒ کی طرف جواز کاقول منسوب کیاہے،وہ درست نہیں ہے۔

’’وجملتہ ان مالایمکن الانتفاع بہ مع بقا عینہ کالدنانیر،والدراھم والمطعوم والمشروب ،والشمع واشباھہ لایصح وقفہ،فی قول عامۃ الفقھا واھل العلم الاشیئا یحکی عن مالک والاوزاعی فی وقف الطعام انہ یجوز ولم یحکہ اصحاب مالک ،ولیس بصحیح؛لان الوقف تحبیس الاصل وتسبیل الثمرۃ؛ومالاینتفع بہ الاباتلاف لایصح فیہ ذلک۔‘‘

(المغنی:۲۲۹/۸)

<u>یادرہے:اگررقم وقف کرکے یوں کہا:کہ اس سے زمین خریدواوراس پرمسجدیامدرسہ بناؤ،تووقف درست ہوگا۔کیونکہ یہ رقم بصورت زمین محفوظ ہے،جوبظاہراستہلاک نہیں ہے۔۔۔۔علامہ شامیؒ نے بھی درہم اوردینارکے وقف کافتوی بھی دیاہے۔</u>

وقف قرآن مجید/یاکتابیں منتقل کرنا:

عام اصول کے تحت کسی مسجد میں وقف شدہ قرآن کریم وہاں کے ساتھ خاص ہیں۔البتہ بسااوقات وہ قرآن کریم زیادہ نہیں پڑھے جاتے ہیں،جب کہ واقف کی نیت پڑھنے اور ثواب حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔اس لیے قریبی مسجد منتقل کرنادرست ہے۔

وان وقف علی المسجد جاز،ویقرا فیہ،ولایکون محصورا علی ھذاالمسجد وبہ عرف
حکم نقل کتب الاوقاف من محالہاللانتفاع بہا۔

(الدرالمختار:365/4،ط:ایچ،ایم ،سعید)

تفصیل کے لیے : (فتاوی عبادالرحمٰن ،کتاب الوقف : 271/5 ط : دارالافتا والتحقیق)

بیماری کے دنوں کی تنخواہ:

- مدرس معروف چھٹی کے معلوم دنوں میں رخصت والا شمار ہوتا ہے، چھٹی کے علاوہ دنوں میں اطلاع اور رخصت لیناضروری ہے، ورنہ تنخواہ لینے کا مستحق نہ ہوگا۔
- جس مدرسہ میں باقاعدۃ چھٹی لینے کا دستور نہ ہو، وہاں قریبی مستندمدارس کے اصولوں پر عمل کیاجائے گااور یا عرف عام کا اعتبار ہوگا۔
- تاہم اگرمہتم نے تقرری کے دوران اس کی وضاحت کی ہو، کہ غیر حاضری کی صورت میں تنخواہ نہیں ملے گی اورمدرس نے قبول کیا، تو مستحق نہ ہوگا۔

وھل یاخذ(المدرس)ایام البطالۃ کعیدورمضان لم ارہ،وینبغی الحاقہ ببطالۃ القاضی ،والاصح انہ یاخذہ ؛لانہاللاستراحۃ......فینبغی ان یعطی لیوم البطالۃ المعروفۃ بقرینۃ ماذکرہ فی مقابلۃ البنا علی العرف،فحیث کانت البطالۃ معروفۃ فی یوم الثلثا والجمعۃ،وفی رمضان والعیدین یحل الاخذ،وکذا لوبطل فی یوم غیرمعتاد لتحریردرس الااذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیہ۔

(الشامیۃ،کتاب الوقف،فی استحقاق القاضی والمدرس الوظیفۃ)

فتاوی مفتی محمود میں ہے :

اگرمدرسہ کا کوئی آئین ہے، یاملازمت کے وقت کوئی شرط ٹھہری ہے، یعنی کوئی اصول طے کیے ہیں ،تواس کے مطابق عمل ہوگا اور اگر کوئی دستورنہیں تو استحقاق رخصت کے علاوہ ایام غیرحاضری کی تنخواہ دینا تبرعا ہوگا لازم نہیں۔

(اجارہ کابیان : 352/9)

اگر بیماری کی اطلاع مدرس نے مہتمم کودے دی ہو، درخواست دی ہو، یازبانی اطلاع دی ہو تو بیماری کے دنوں کی تنخواہ کاٹنا اسے جائز نہیں۔اوراگرنہ درخواست دی ہواورنہ زبانی اطلاع تو تنخواہ کاٹنا جائز ہے۔

(اجارہ کابیان : 373/9)

البتہ اگر مہتمم نے اس کی صریح وضاحت کی، کہ صرف پڑھائی کے دنوں کی تنخواہ ملے گی، تو صرف پڑھائی کے دنوں کی تنخواہ ملے گی۔

الااذا نص الواقف علی تقیید الدفع بالیوم الذی یدرس فیہ۔

استاد کی شادی کا خرچہ مدرسہ کی مد سے دینا:

مدارس میں جمع شدہ رقم طلبا کی اصلاح اور اساتذہ کی ضرورت کے لیے ہے۔ مثلا: طلبہ کے لیے کتابیں، لائبریری، بہتر سالن اور حفظان صحت وغیرہ کا انتظام کرنا۔۔۔اسی طرح اساتذہ کی تنخواہوں کو اسی مد سے آدا کرنا۔ اس پر مزید خرچہ (استاد کی شادی حج اور عمرہ وغیرہ) مہتمم کے لیے درست نہیں ہے، بصورت مجبوری اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

(تفصیل کے لیے: فتاوی دارالعلوم دیوبند، فتاوی نمبر 3371442 / -468)

پرنسپل کا اسکول فنڈ میں تبدیلی:

- اسکولوں میں حکومت کی طرف سے جو فنڈ کسی مخصوص مد میں استعمال کرنے کے لیے دیا جائے، تو پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر کے لیے کسی اور مد میں استعمال کرنا درست نہیں ہے، متعلقہ مد میں استعمال کرنے کی ضرورت نہ ہو، تو حکومت کی طرف سے عمومی ضابطوں کا خیال رکھ کر استعمال کرنا ضروری ہے۔ اور پرنسپل حضرات بھی تصرف کرنے مجاز نہ ہو گے، کیونکہ یہ صرف نگران ہے اور نگران کو فقہ کی کتابوں میں مشرف کہا گیا ہے۔ مشرف کا وقف کی مد میں تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

المعروف عرفا کالمشروط شرطا......المعروط کالمشروط۔

(قواعد الفقہ)

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- نمازوں میں طوال،اوساط اور قصار کا حکم
- کیا سورتوں کی ترتیب سنت مؤکدہ ہے، یا غیر مؤکدہ؟
- مسنون قرات کی بقدر آیتیں پڑھنا
- لمبی سورتوں اورافتان انت یامعاذ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے درمیان تعارض

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

نماز کی قراءت میں طوال مفصل،اوساط اور یا قصار کی ترتیب کے متعلق چند سوالات:

- ❖ کیاکتب فقہ میں متعین کی گئی سورتوں(مثلا: حجرات سے بروج تک....بروج سے بینہ تک) کی رعایت رکھناسنت ہے،یامستحب؟
- ❖ اگرسنت ہے،تو موکدہ ہے یا غیر موکدہ ہے؟
- ❖ کیاسورتوں (مثلا: حجرات سے بروج تک) کااعتبار ہوگا؟یامقدارآیت کی رعایت (مثلا: نماز فجر میں چالیس سے ساٹھ تک اور یا سوتک کی آیتیں) رکھنی چاہیے؟
- ❖ حدیث میں جہاں لمبی نماز کی ممانعت آئی ہے۔افتان انت یامعاذاوریا من یوم القوم فلیخفف سے اس کی تنطبیق کیسی ہوگی؟

الجواب حامداومصلیا

سورتوں کی مذکورہ بالانوعیت کا خیال رکھناسنت ہے۔

واضح رہے:

اردو فتاوی میں مسؤلہ بالاصورت کے متعلق قدراختلاف ہے۔

چنانچہ فتاوی محمودیہ میں سورتوں کوترتیب سے پڑھناسنت لکھاہے،کہ عامۃانہی سورتوں کواسی ترتیب سے پڑھاجائے۔

(تفصیل کے لیے:(76\7)

کفایت المفتی میں اسی ترتیب کو سنت کہاہے،مؤکدہ نہیں کہاہے۔اس کے خلاف کرنا مکروہ نہیں ہے،بلکہ خلاف اولی ہے۔

(تفصیل کے لیے:487\4)

فتاوی نوازل میں عام حالت میں یعنی اگرحالت سفر اور عذر نہ ہو،توترتیب سور کا خیال رکھناافضل ہے۔

(تفصیل کے لیے:521\3)

فتاوی دارالعلوم دیوبند میں افضیلت کا ذکر ہے۔

(تفصیل کے لیے:(175\2)

امدادالاحکام میں سنت لکھاہے۔

(تفصیل کے لیے:کتاب الصلوۃ:۵۸۲)

فتاوی عبادالرحمٰن میں مستحب ومسنون لکھاہے۔

(تفصیل کے لیے:کتاب الصلوۃ)

مذکورہ بالاحوالہ جات پر نظر رکھنے سے سنت کا حکم واضح ہوتاہے۔عربی عبارات پر نظر کرنے سے ترتیب مذکورہ کے ساتھ پڑھنے پر تاکید ہے۔جس سے سنت کا حکم واضح ہوتاہے۔

رضي الله عنه - أنه كتب إلى أبي موسى الأشعري: أن اقرأ في الفجر والظهر بطوال المفصل، وفي العصر والعشاء بأوساط المفصل وفي المغرب بقصار المفصل. قال في الكافي: وهو كالمروي عن النبي - ﷺ - لأن المقادير لا تعرف إلا سماعا. اهـ. "

(الشامیۃ:فصل فی القراءۃ)

" قوله: في الفجر؛ لما ثبتَ عنه ﷺ أنّه قرأ فيه سورة: {والطور}، أخرجه البخاريّ، و{سورة إذا الشمس كورت} أخرجه مسلم وأبو داود ، وسورة {ق} أخرجه مسلم."

(عمدۃا لرعایۃ:کتاب الصلوٰۃ)

"وفي العصر والعشاء يقرأ في الركعتين بأوساط المفصل لأنه - عليه الصلاة والسلام – «قرأ في العصر في الأولى البروج، وفي الثانية سورة الطارق» اهـ."

<u>کیاترتیب مذکورہ سے پڑھناسنت موکدہ ہے۔۔۔۔۔۔؟</u>

- اردو فتاوی میں سنت لکھاہے، اس سے موکدہ مراد نہیں ہے،کیونکہ نیچے دیے کثیر حوالوں سے ثابت ہوگا،کہ سنت موکدہ قریب الی الواجب ہے۔
- حدیث اورآثار صحابہ میں اصرار کاذکر ہے،لیکن اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ نہ کرنے والاگناہ کبیرہ کامرتکب ہوا۔
- تیسرا یہ کہ مطلق سنت اور مستحب کے درمیان صاحب بحرالرائق نے فرق کیاہے۔لہٰذا مطلق سنت چھوڑنے سے وبال مستحب کے چھوڑنے سے زیادہ ہوگا۔
- چوتھا یہ ہے کہ سنت موکدہ وہاں ہوتی ہے ،جس کے ترک پر نہی خاص وارد ہواہے۔پانچواں یہ ہے کہ صاحب مجمع الفتاوی کے مطابق سنت موکدہ کی بھی دوقسمیں ہیں سنت موکدۃ قویہ اور غیر قویہ سنت موکدہ قویہ جوواجب کے حکم میں ہواوراس کاچھوڑنامکروہ تحریمی ہے۔

بنابرایں اگرسنت موکدہ غیر قویہ کہاجائےتوبے جانہ ہوگا۔

"وفي الجوهرة عن القنية تاركها فاسق وجاحدها مبتدع وفي التلويح ترك السنة المؤكدة قريب من الحرام يستحق به حرمان الشفاعة ﷺ من ترك سنتي لم ينل

شفاعتي وفي شرح المنار للشيخ زين الأصح أنه يأثم بترك المؤكدة لأنها في حكم الواجب والإثم مقول بالتشكيك فهو في الواجب أقوى منه في السنة المؤكدة اه وقيل الإثم منوط بإعتياد الترك وصحح وقيل لا إثم أصلا۔

قوله (وأما التي لم يواظب عليها) كأذان المنفرد وتطويل القراءة في الصلاة فوق الواجب ومسح الرقبة في الوضوء والتيامن وصلاة وصوم وصدقة تطوع ويلقبونها بالسنة الزائدة وهي المستحب والمندوب والأدب من غير فرق بينها عند الأصوليين وأما عند الفقهاءفالمستحب ما استوى فعله مع تركه والمندوب ما تركه أكثر من فعله وعكس صاحب المحيط والأولى ما عليه الأصوليون أفاده الشيخ زين في شرح المنار والسنة عند الحنفيةما فعله ﷺ على ما تقدم أو صحبه بعده قال في السراج ما فعله النبي ﷺ أو واحد من أصحابه اه فإن سنة أصحابه أمر عليه السلام باتباعها بقوله عليه السلام عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين من بعدي وقوله عليه الصلاة والسلام أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم..."

(حاشیۃ الطحطاوی :فصل فی سنن الوضوء)

"لأن السنة المؤكدة والواجب سواء خصوصا السنة التي هي من شعائر الإسلام،فلا يسع تركها، ومن تركها فقد أساء؛ لأن ترك السنة المتواترة يوجب الإساءة،وإن لم تكن من شعائر الإسلام..."

(بدائع الصنائع :فصل فی ترک الاذان)

"وتعليلهم بأن فيه ترك السنة يفيد أنه مكروه تنزيها إذ ليس فيه نهي خاص ليكون فيه تحريما...."

(البحرالرائق:عقص شعرالراس فی الصلوۃ)

"وعلى هذا ففي ترك المستحب والمندوب كراهة إلا أنه ينبغي أن تكون دون كراهة ترك السنة غير المؤكدة كما قدمه المؤلف من أن الإثم في ترك السنة المؤكدةدونه في ترك الواجب وأنه مقول بالتشكيك....."

(البحرالرئق:قتل الحیۃ والعقرب فی الصلوۃ) "ثم جميع فروض الكفاية ثوابها للمباشر وحده وإثم تركها على الجميع ومقتضى ترك الفرض عدم الصحة مطلقا والإثم إن كان عمدا ومقتضى ترك الواجب كراهة التحريم مع العمد وإلا فسجود السهوان كان في الصلاة ومقتضى ترك السنة والمستحب كراهة التنزيه مع العمد وإلا فلا....."

(حاشیۃ الطحطاوی : فصل فی الوضوء)

"ومتى حافظ المسلم على سنة النبي ﷺ، علما وعملا وتعليما، حصل له من الفوائد والنتائج الطيبة والثمار المباركة ما لا يخطر ببال، يقول ابن قدامة رحمه الله: (وفي اتباع السنة بركة موافقة الشرع، ورضا الرب سبحانه وتعالى، ورفع الدرجات، وراحة القلب، ودعة البدن، وترغيم الشيطان، وسلوك الصراط المستقيم) ، ومن آثار العمل بالسنة: الوصول إلى درجة المحبة، محبة الله عز وجل لعبده المؤمن،روى البخاري عن أبي هريرة قال: قال رسول الله - ﷺ: « من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب، وما تقرب إلي عبدي بشيء أحب إلي مما افترضته عليه، وما يزال عبدي يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه، فإذا أحببته..."

(مجلۃ البحوث الاسلامیۃ:الاعتصام بالسنۃ)

"لكن في التلويح ترك السنة المؤكدة قريب من الحرام يستحق حرمان الشفاعة، لقوله - عليه الصلاة والسلام - : «من ترك سنتي لم ينل شفاعتي» . اهـ. وفي التحرير: إن تاركها يستوجب التضليل واللوم، اهـ. والمراد الترك بلا عذر على سبيل الإصرار كما في شرح التحرير لابن أمير حاج، ويؤيده ما سيأتي في سنن الوضوء من أنه لو اكتفى بالغسل مرة إن اعتاده أثم، وإلا لا."

(حاشیہ ابن عابدین:سنن الوضوء)

''وترك السنة المؤكدة قريب من الحرمة يستحق حرمان الشفاعة اهـ. ومقتضاه أن ترك السنة المؤكدة مكروه تحريما لجعله قريبا من الحرام۔''

(الشامية:الحظر والاباحة)

کیا مذکورہ سورتوں کا اعتبار ہوگا، یا آیتوں کی مقدار کا اعتبار ہوگا؟

کتب فقہ میں طوال مفصل، یا اوساط اور یا قصار کی ترتیب میں قدر اختلاف ہے، متون میں طوال کا مطلب : سورہ حجرات سے بروج تک ،اوساط سے مراد بروج سے سورہ بینہ تک اور قصار سے مراد بینہ سے والناس تک ہے، جب کہ شروح میں طوال سے چالیس سے ساٹھ کی بقدر آیتیں، اوساط سے بیس سے تیس کی بقدر آیتیں، جب کہ قصار سے پانچ آیتیں ایک رکعت میں مراد ہیں۔

فقہاء کرام نے بوجہ استحسان متون کو ترجیح دی ہیں۔

"والكنز والمجمع والوقاية والنقاية وغيرها، وحصر المقروء بعدد على ما ذكرهفي النهر والبحر مما علمته مخالف لما في المتون من بعض الوجوه كما نبه عليه في الحلية فإنه لو قرأ في الفجر أو الظهر سورتين من طوال المفصل يزيدان على مائة آية كالرحمن والواقعة، أو قرأ في العصر أو العشاء سورتين من أوساط المفصل تزيدان على عشرين أو ثلاثين آية كالغاشية والفجر يكون ذلك موافقا للسنة على ما في المتون لا على الرواية الثانية، ولا تحصل الموافقةبين الروايتين إلا إذا كانت السورتان موافقا للعدد المذكور، ويلزم على ما مرعن النهر من أن المقدار المعين سنة أخرى أن تكون قراءة السورتين الزائدتين على ذلك المقدار خارجة عن السنة إلا أن يقتصر من كل سورة منهما على ذلك المقدار مع أنهم صرحوا بأن الأفضل في ركعة الفاتحة وسورة تامة، فالذي ينبغي المصير إليه أنهما روايتان متخالفتان اختار أصحاب المتون إحداهما، ويؤيده أنه في متن الملتقى ذكر أولا أن السنة في الفجر حضراأربعون آية أو ستون، ثم قال: واستحسنوا طوال المفصل فيها وفي الظهر إلخ.فذكر أن الثاني استحسان فيترجح على الرواية الأولى لتأيده بالأثر الوارد عن عمر - رضي الله عنه - أنه كتب إلى أبي موسى الأشعري: أن اقرأ في الفجروالظهر بطوال المفصل، وفي العصر والعشاء بأوساط المفصل وفي المغرب بقصار المفصل. قال في الكافي: وهو كالمروي عن النبي - صلى الله عليه وسلم - لأن المقادير لا تعرف إلا سماعا. اهـ "

(الشامية:فصل فى القراءة)

" (قوله والذي عليه أصحابنا أنه من الحجرات إلخ) قال في الفتح اختلف في أول المفصل فقيل سورة القتال، وقال الحلواني وغيره من أصحابنا الحجرات فهوالسبع الأخير وقيل من " ق " وحكى القاضي عياض أنه الجاثية، وهو غريب فالطوال من أوله على الخلاف إلى البروج والأوساط منها إلى لم يكن والقصار الباقي، وقيل الطوال من أوله إلى عبس والأوساط منها إلى والضحى والباقي القصار اهـ.وقيل غيرها قال الرملي ونظم ابن أبي شريف الأقوال في المفصل في بيتين فقال مفصل قرآن بأوله أتى ... خلاف فصافات وقاف وسبح وجاثية ملك وصف قتالها ... وفتح ضحى حجراتها ذا المصحح زاد السيوطي في الإتقان قولين فأوصلها إلى اثني عشر قولا: الرحمن قال حكاه ابن السيد في أماليه على الموطإ والإنسان اهـ.

(تنبيه) الغاية ليست مما قبلها فالبروج من الأوساط لا الطوال لما قال في الكافي،

وفي العصر والعشاء يقرأ في الركعتين بأوساط المفصل لأنه - عليه الصلاة والسلام –

«قرأ في العصر في الأولى البروج، وفي الثانية سورة الطارق» اهـ.

كذا في الشرنبلالية أقول: وهو مخالف لما في النهر حيث قال ولا يخفى دخول الغاية في المغيا هنا اهـ.ونقل مثله الشيخ إسماعيل عن البرجندي، ثم قال والذي يظهر خروجها فيما عدا الآخر لما صرح به الزيلعي من أن

آخرالمفصل قل أعوذ برب الناس بلا خلاف ويمكن إرجاع كلام النهر والبرجندي إليه، وإن احتملت الإشارة بهنا إلى جميع حدود المفصل ولا محذور في التوزيع بهذا الطريق إذا أوصل إلى التوفيق فليتأمل. اهـ.وقد حمل الرملي كلام النهرعلى ذلك أيضا. أقول: لكن كلام النهر فيما مر صريح في أنها من الطوال،وهو ظاهر كلام الهداية أيضا على ما قرره في عبارتها حيث رد على أخيه(قوله ولم يذكر المصنف عدد الآيات التي تقرأ في كل صلاة إلخ) لم يبين أن العدد المذكور هل هو سنة أو مستحب وتقدم عن النهر أن القراءة من المفصل سنة ومقدار الخاص سنة أخرى لكن في السراج عن المحيط مايدل على أن المقدار المذكور مستحب فإنه ذكر أن القراءة في الصلاة على خمسة أوجه: فرض وواجب وسنة ومستحب ومكروه. والفرض آية،الواجب الفاتحة وسورة، والمسنون طوال المفصل في الفجر والظهر وأوساطه في العصر والعشاء وقصاره في المغرب، والمستحب أن يقرأ في الفجر إذا كان مقيما في الركعة الأولى قدر ثلاثين آية أو أربعين سوى الفاتحة، وفي الثانيةقدر عشرين إلى ثلاثين سوى الفاتحة، والمكروه أن يقرأ الفاتحة وحدها أوالفاتحة ومعها آية أو آيتان."

(البحرالرائق:آداب الصلوٰۃ)

"(و) يسن (أن تكون السورة المضمومة للفاتحة من طوال المفصل) الطوال والقصار بكسر أولهما جمع طويلة وقصيرة والطوال بالضم الرجل الطويل وسمي المفصل به لكثرة فصوله وقيل لقلة المنسوخ فيه وهذا (في) صلاة (الفجر والظهر ومن أوساطه) جمع وسط بفتح السين ما بين القصار والطوال (في العصر والعشاء ومن قصاره في المغرب) وهذا التقسيم (لو كان) المصلي هذا (مقيما) والمنفرد والإمام سواء ولم يثقل على المقتدين بقراءته كذلك والمفصل هو السبع السابع قيل أوله عند الأكثرين من سورة الحجرات وقيل من سورة محمد صلى الله عليه وسلم أو من الفتح أو من ق والطوال من مبدئه إلى البروج وأوساطه منهاإلى لم يكن وقصاره منها إلى آخره وقيل طواله من الحجرات إلى عبس وأوساطه من كورت إلى الضحى والباقي قصاره لما روي عن عمر رضي الله تعالى عنه أنه كان يقرأ في المغرب بقصار المفصل وفي العشاء بوسط المفصل وفي الصبح بطوال المفصل والظهر كالفجر لمساواتهما في سعة الوقت وورد انه كالعصر لاشتغال الناس بمهماتهم وروي عن أبي هريرة رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه و سلم كان يقرأ في الفجر يوم الجمعة " ألم تنزيل الكتاب " و " هل أتى على الإنسان " وقد ترك الحنفية إلا النادر منهم هذه السنة ولازم عليها الشافعية إلا القليل . فظن جهلة المذهبين بطلان الصلاة بالفعل والترك فلا ينبغي الترك ولا الملازمة دائما (و) للضرورة (يقرأ أي سورة شاء) لقراءة النبي صلى الله عليه و سلم المعوذتين في الفجر . فلما فرغ قالوا أوجزت قال سمعت بكاء صبي فخشيت أن تفتن أمه كما لو كان مسافرا لأنه صلى الله عليه و سلم قرأ بالمعوذتين في صلاة الفجر في السفر۔"

(مراقی الفلاح،فصل فی بیان سننہا)

تطبیق :

تطبیق کی صورت یوں ہوگی ،کہ قوم کی نوعیت اور ان کی قوت برداشت کودیکھاجائے۔چنانچہ اگرجماعت میں کمزور،بوڑھے اوربیمار ہوں توامام ہلکی نمازپڑھائے۔

"(و) للضرورة (يقرأ أي سورة شاء) لقراءة النبي صلى الله عليه و سلم المعوذتين في الفجر . فلما فرغ قالوا أوجزت قال سمعت بكاء صبي فخشيت أن تفتن أمه كما لو كان مسافرا لأنه صلى الله عليه و سلم قرأ بالمعوذتين في صلاة الفجر في السفر۔"

(مراقی الفلاح،فصل فی بیان سننها)

"والظاهر أن المراد عدم التقدير بمقدار معين لكل أحد وفي كل وقت، كما يفيده تمام العبارة، بل تارة يقتصر على أدنى ما ورد كأقصر سورة من طوال المفصل في الفجر، أو أقصر سورة من قصاره عند ضيق وقت أو نحوه من الأعذار، «لأنه – ﷺ - قرأ في الفجر بالمعوذتين لما سمع بكاء صبي خشية أن يشق على أمه» وتارة يقرأ أكثر ما ورد إذا لم يمل القوم، فليس المراد إلغاء الوارد ولو بلا عذر، ولذا قال في البحر عن البدائع: والجملة فيه أنه ينبغي للإمام أن يقرأ مقدار ما يخف على القوم ولا يثقل عليهم بعد أن يكون على التما فصل من آدابهاأشار بمن التبعيضية إلى أنه لم يستوف أفراد الآداب فمنها إنتظار الصلاة والإعتمادعلى الركبتين حال النهوض على طريقة والتسمية بين الفاتحة والسورة على طريقة أيضا والقراءة من طوال المفصل على ما تقدم وقراءة الفاتحة في الأخيرتين بناء على أنها أفضل والإشارة في التشهد على ما في العيني عن التحفة "

(الشامیۃ:فصل فی القراءۃ)

"يرجع فيؤم قومه ، فصلى العشاء ، فقرأ بالبقرة ، فانصرف الرجل ، فكأن معاذ ينال منه ، فبلغ الرسول ، فقال : (فتان ، فتان ، فتان) ، ثلاث مرات ، وأمره بسورتين من أوسط المفصل)"

(شرح البخاری لابن البطال: ابواب الجماعۃ)

واضح رہے:

تخفیف کا ہر گز یہ مراد نہیں ہے ،کہ امام کسی بھی عذر کے نماز میں ترتیب مسنون کو چھوڑدے ،یعنی عشاء اوساط کے بجائے قصار پڑھے ،بلکہ مطلب یہ ہے ،کہ آداب صلوٰۃ،مستحبات اور ترتیب مسنون کی رعایت کرتے ہوئے تخفیف کرے،کیونکہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نماز عشاء میں سورہ بقرہ پڑھتے ،جس سے قوم کی برداشت نہ کر سکی ،جب کہ اس کے جواب اوساط کا حکم دیا گیا ،جس کا مطلب یہی ہوگا،کہ تخفیف اتمام کے ساتھ ہونی چاہیے۔البتہ اگر دوران سفر ہواور یاضرورت شدیدہ ہو توحرج نہ ہوگا۔

"قال في البحر عن البدائع: والجملة فيه أنه ينبغي للإمام أن يقرأ مقدار ما يخف على القوم ولا يثقل عليهم بعد أن يكون على التمام فصل من آدابها أشار بمن التبعيضية إلى أنه لم يستوف أفراد الآداب فمنها إنتظار الصلاة والإعتماد على الركبتين حال النهوض على طريقة والتسمية بين الفاتحة والسورة على طريقة أيضا والقراءة من طوال المفصل على ما تقدم وقراءة الفاتحة في الأخيرتين بناء على أنها أفضل والإشارة في التشهد على ما في العيني عن التحفة "

(الشامیۃ:فصل فی القراءۃ)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

بسم الله الر حمن الرحيم

کیافرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان عظام اس مسئلے کے بارے میں کہ :

1۔ عید کے دن مسجد میں نماز فجر کے بعد مصافحہ ومعانقہ کرنا کیساہے ؟

2۔ عید کے دن نماز فجر کے بعد مصافحہ ومعانقہ نہ کرنے والوں نکیر کرنے سے مصافحہ ومعانقہ کا لزوم ثابت ہوگا یا نہیں؟

3۔ مجموعہ احسن الرسائل میں لکھاہے کہ عید کے دن عید کی خوشی میں ایک دوسرے سے مصافحہ ومعانقہ کرنا عید کی خوشی سمجھ کر جائز بلکہ مستحسن ہے؟

الجواب حامداً ومصلّیاً

1۔ عید کے دن رسمی مصافحہ و معانقہ حضور اکرم ﷺ ،صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ،تابعین اور ائمہ مجتہدین سے ثابت نہیں ہے۔پس احتیاط یہ ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے ،زبانی مبارک باد اور ایک دوسرے کو خیر وبرکت کی دعائیں دی جائیں جو کہ ایک مستحسن اور بہتر عمل ہے ،تاہم اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھائے تو اس سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیے۔

لما في ’’حاشية ابن عابدين‘‘:

ونقل في تبيين المحارم عن الملتقط أنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال، لأن الصحابة رضي الله تعالى عنهم ما صافحوا بعد أداء الصلاة.

(كتاب الحظر والإباحة، باب الاستبراء: ج٩،ص٦٢٩ط:رشيديه)

وفي’’ فيض الباري‘‘:

’’فينبغي لنا أن لا نُحَرم من الأدعيةِ ونَرْفَع لها الأيدي، لثبوتِه عنه عقيبَ النافِلةِ وإنْ لم يَثْبت بعد المكتوبة، فإذا ثَبَت جِنْسه لم تكن بِدعةً أصلا مع وُرُود القوليةِ في فَضْله، بخلاف المصافحة في العيدين فإنها لم تَثبت في الجنس أيضًا، نعم ثبتت عند اللقاء فقط.وتلك فروقُ أَدَقُّ من الشَّعر. ‘‘

(كتاب الصلاة، باب صلاة الضحى في الحضر: ج٢،ص٥٨٣ ط: رشيدية)

2۔ فجر یا عید کی نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ نہ کرنے والوں پر نکیر کرنے سے لزوم مصافحہ و معانقہ ثابت ہوگا ،ایسی حالت میں مصافحہ و معانقہ بدعت اور واجب الترک ہے ،اور اس سے اجتناب ضروری ہے۔

لما في ’’مجموع الرسائل للكهنوي‘‘:

’’فكم من مباح يصير بالالتزام من غير لزوم والتخصيص من غير مخصص مكروها. ‘‘

(المسئلة في الجهر بالذكر: ج٣،ص٤٩٠)

مجموعہ احسن الرسائل تالیف مولانا مفتی زرولی خان صاحب رحمہ اللہ نے عید کے دن مصافحہ کی ثبوت پر جو دلائل پیش کی ہے ، وہ عام مصافحہ کی دلیلیں ہیں ، ان سے عید کے دن کا مصافحہ ومعانقہ ثابت کرنا درست نہیں ہے۔

- امر بالمعروف کی تعریف
- امر بالمعروف کے فضائل
- نہی عن المنکر نہ کرنے کا گناہ
- امر بالمعروف کے مراتب
- کیاامر بالمعروف صرف حکومت کا کام ہے؟
- حکومت کاامر بالمعروف نہ کرنے سے عوام کی ذمہ داری
- کیا پنچائیت جسمانی سزادے سکتی ہے؟
- عوامی کمیٹی کے لیے مجرم کا جرم منظر عام پر لانے کا حکم
- عوامی کمیٹی کااپنے اخراجات کے لیے کسی پر مالی رقم مقرر کرنا
- تعزیر مالی کا حکم
- گناہ کے آلات توڑنا

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

مفتیان کرام درج ذیل مسائل کے بارے میں کیافرماتے ہیں :

- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تعریف کیاہے ؟
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کے فضائل اور نہ کرنے پر کیاوعیدیں ہیں ؟
- امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کتنے مراتب ہیں ؟
- کیاامر بالمعروف اور نہی عن المنکر صرف حکومت کاکام ہے ؟
- ایک عام مسلمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کاکتناذمہ دار ہے ؟
- جب حکومت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتی ہوں،تو عوامی سطح پر کمیٹی بنانے کی کیاحیثیت ہے ؟
- کیاعوامی فلاحی کمیٹی جرائم پیشہ افراد کو تعزیری سزادے سکتی ہے ؟
- عوامی کمیٹی کا مجرم کے جرم کو منظر عام پر واضح کرنا کیساہے ؟
- کمیٹی کااپنے اخراجات کے لیے گاؤں کے لوگوں پر کوئی خاص رقم مقرر کرنا کیساہے ؟
- گناہ کرنے کے آلات (ساز،باجہ،وغیر توڑنا)
- گناہ کے آلات کی مرمت کرنااوراس پر اجرت لینا

الجواب بعون ملهم الصواب

حل مسئلہ سے پہلے چنداصطلاحات کی تعریف لکھی جاتی ہے :

امر :

لغت میں حکم (Order) دینے کو کہتے ہے۔اور اصلاح شرع میں اس لفظ کو کہتے ہے، جسکے ذریعے کسی کو کسی فعل کے بجالانے کا حکم پوری قوت اور بالادستی کے ساتھ دیا جائے۔

معروف :

اس فعل کو کہتے ہے،جو معاشرے میں اچھا سمجھا جائے،لیکن اصطلاح شریعت میں معروف اس قول وفعل کو کہتے ہیں، جو اطاعت الٰہی کا مظہر اور اللہ تعالیٰ کی قربت کاذریعہ ہو،اس قول وفعل کانیکی ہوناعوام میں معروف ہو۔

نہی : امر کی ضد اور "منکر" معروف کی ضد ہے،اصطلاح شریعت میں نہی عن المنکر کامطلب کسی کو قوت اور بالادستی کے ساتھ ایسے قول وفعل سے روکنا جو رضائے الٰہی کے موافق نہ ہو،یاد رہے، بدی چونکہ مسلمان معاشرے میں اجنبی اور نامونوس چیز بن چکی ہے،اس لئے اسے لفظ منکر (انجانی چیز) سے تعبیر کی گئی۔

"ان طلب الفعل لا يسمى أمرا حقيقة الا اذا كان على سبيل الاستعلا ء أى استعلاء الأمر على المأمؤر ،احترز عن الدعاء و التماس وهو شرط أكثر المأتورية و الأمدى من الأشعرية و صححه الرازى "

(احكام السلطانيه :ص۶۵)

(الموسوعة الفقهية:ج:۶،ص ۲۴۷)

(نور الانوار :ص ۲۴)

(الفروق للقرافى :ج۲،ص۱۵۸)

النهي عن المنكر هو طلب الكف عن فعل ما ليس فيه رضا الله تعالى ، وهو من فروض الكفاية التي يجب على المسلمين أن يقوموا بها ، ويأثمون إذا تركوها جميعا ، ويسقط الحرج عن الباقين إذا قام به بعضهم ، قال تعالى : { ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر وأولئك هم المفلحون.

الموسوعة الفقهية الكويتية - (8 / 40)

امر کی تعریف کا خلاصہ :

امر کی تعریف سے یہ خلاصہ نکلا کہ امر آڈر کے معنی میں ہے ،جس میں غیر کو حکم دیاجاتاہے "کہ یہ کام کرو اور اس کو کرنا ہوگا 'اس میں رضا کارانہ طور پر کام کرنے کی اپیل و التماس اور درخواست نہیں ہوتی ہے 'بلکہ دوٹوک الفاظ میں حکم ہوتاہے 'کہ یہ کام کرو 'اگر نہیں کیا تو سزا کیلئے تیار ہوجاو ' اور چونکہ امر کا یہ مفہوم قوت نافذہ اور طاقت کا تقاضہ کرتاہے 'اسی وجہ سے نزول قرآن کے وقت تیرہ سال تک اللہ تعالی نے مکی دور میں "تأمرون بالمعروف وتنھون عن المنکر " کے الفاظ اور اس اصطلاح کو قرآن میں بالکل ذکر نہیں فرمایا 'جب مسلمانوں اور پیغمبر اسلام نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور آسمان سے جہاد کا حکم آگیا 'اس کے بعد اللہ تعالی نے قرآن مجید " تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر " کی اصلاح بیان فرمایا 'آپ کو کسی بھی مکی سورت میں یہ اصطلاح اور یہ الفاظ نہیں ملیں گے ' یہ سب مدنی سورتوں میں ہے۔

واضح رہے :

(خذ العفووامربالعرف واعرض عن الجاہلین۔)اس آیت میں بعینہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مذکورہ معنی میں نہیں ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ مفسرین کے نزدیک یہ آیت جہاد سے منسوخ ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اعرف المعارف (سب سے بڑا معروف) اسلام لانا 'توحید و رسالت کا اقرار کرنا ہے ' اور انکر المنکر (سب سے بڑا منکر) کفر اختیار کرنا ہے ' جہاد ہی کے ذریعے سے کفر کی شان وشوکت مٹ کر خاک بن جاتی ہے اور اسلام کا بول بالا ہو کر جوک درجوک اسلام میں داخل ہوجاتے ہیں 'اس سے معلوم ہوا کہ جہاد مقدس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک اعلی قسم ہے۔

اور اسی جہاد ہی کی وجہ سے اس امت کو پچھلی تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے ' چنانچہ علامہ الوسی رحمہ اللہ نے روح المعانی میں "كنتم خير امت أخرجت للنا س "کے تحت حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کو اس طرح نقل کیا ہے :

" عن ابن عباسأن المعنى تأمرونهم ان يشهدوا ان لااله الا الله و تقاتلونهم عليها و لااله الا الله هو اعظم المعروف و تنهون عن المنكر هو التكذيب و هو أنكر المنكر "

(روح :ج۴ ،ص ۲۸)

اور علامہ قرطبیؒ تفسیر قرطبیؒ میں لکھتے ہیں :

"فجعل الله الأمر بالمعروف و النهی عن المنكر فرقا بين المؤمنين و المنافقين فدل على ان أخص أوصاف المؤمنين الأمربالمعروف و النهی عن المنكر ورأسهاالدعاالى الاسلام و القتال عليہ"

(قرطبی، ۴/۴۷)

علامہ ابن کثیر نے تفسیر ابن کثیر میں "آیت" کے تحت لکھتے ہیں:

"قال ابو هريره رضی الله عنہ كنتم خير الناس للناس تأتون بهم فی السلاسل أعناقهم حتى يد خلوا فی الاسلام وقال ابو هريرةرضی الله عنہ نحن خير الناس للناس نسوقهم بالسلاسل الى الاسلام"

یعنی لوگوں کے نفع کے خاطر تم لوگوں میں سب سے بہترین لوگ ہو ں کہ تم لوگوں کے گردنوں میں زنجیریں ڈلوا کر انکو اسلام میں داخل کراتے ہوں ،ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کے لیے لوگوں میں سب سے بہترین لوگ ہیں کہ انکے گردنوں میں طوق ڈالو اکر انکو اسلام میں داخل کراتے ہیں۔

شاہ عبد القادر علیہ الرحمہ نے آیت کنتم خیر اِمت کے تحت لکھتے ہیں کہ یہ اِمت ہر اِمت سے بہتر ہے اس دو وصف میں اِمر بالمعروف یعنی جہاد اور ایمان یعنی توحید کی تقید (تاکید) اس قدر اور ادیان میں نہیں۔

"امر بالمعروف و نہی عن المنکر "شریعت اسلامیہ کا اہم فریضہ اور اسلامی معاشرت کا خاص امتیازی وصف ہے ،جو اہل اسلام کو ہر طرح کی فکری و عملی گمراہیوں کے تیز ہواؤں سے بچا کر صراط مستقیم پر گامزن رکھتا ہے ، یہ عمل امت کو ایک خاص مزاج میں ڈالتا ہے ،جو بندگی رب تعالی کے لیے ہر امتی سے مطلوب ہے۔

❖ **امر بالمعروف کی اہمیت اور اس کے ترک پر وعیدیں:**

اللہ تعالی نے قرآن کریم میں اہل ایمان کو حکم فرمایا ہے:

''وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"

یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی کا ہونا ضروری ہے ،کہ خیر کی طرف بلایا کریں ،اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں ،اور وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس آیت میں خاص ایک ایسی جماعت کے ہونے کی ترغیب دی گئی ہے ،جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائیں۔نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔جس معاشرے میں یہ حکم زندہ ہوگا در حقیقت وہ معاشرہ زندہ معاشرہ ہوگا ، اسی معاشرے کے افراد کو کامیابی اور فلاح کی نوید سنائی گئی ہے۔

○ **امر بالمعروف کی اہمیت وفضیلت پر بکثرت احادیث شریف منقول ہیں ،اس مقام کی مناسبت سے چند منتخب احادیث پیش کی جاتی ہیں:**

حذيفة عن اليمان :عن النبي صلى الله عليه و سلم قال والذي نفسي بيده لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر أو ليوشكن الله أن يبعث عليكم عقابا منه ثم تدعونه فلا يستجاب لكم "

سنن الترمذی- (4 / 468)

حضرت یمان رضی اللہ عنہ روایت نقل کرتے ہے 'کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا : (اہل ایمان) قسم اس پاک ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے اور تم کو تاکید ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کافریضہ انجام دیتے رہو (یعنی اچھی باتوں اور نیکیوں کی لوگوں کو ہدایت و تاکید کرتے رہو اور بری باتوں اور برے کاموں سے ان کو روکتے رہو) یا پھر ایسا ہو گا کہ (اس معاملہ میں تمہاری کوتاہی کی وجہ سے) اللہ تم پر اپنا کوئی عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم اس سے دعائیں کروگے اور تمہاری دعائیں قبول نہیں کی جائیں گی۔

تشریح : اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے امت کو واضح الفاظ میں آگاہی دی ہے 'کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میری امت کا ایسا فریضہ ہے کہ جب اسکی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی ہو گی تو اللہ کی طرف سے وہ کسی فتنہ اور عذاب میں مبتلاء کر دی جائے گی 'اور پھر جب دعائیں کرنے والے اس عذاب اور فتنہ سے نجات کے لیے دعائیں کریں گے تو ان کی دعائیں بھی قبول نہ ہوں گی۔

○ **<u>مذکورہ حدیث کی تشریح میں مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ فرماتے ہے :</u>**

کہ اس عاجز کے نزدیک اس میں قطعاً شبہ کی گنجائش نہیں کہ صدیوں یہ امت طرح طرح کے جن فتنوں اور عذابوں میں مبتلاء ہے اور امت کے اخیار اور صلحاء کی دعاؤں اور التجاؤں کے باوجود ان عذابوں سے نجات نہیں مل رہی ہے 'تو اس کا بہت بڑا سبب یہی ہے کہ رسول ﷺ نے اللہ تعالی کے حکم سے امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو ذمہ داری سپرد کی تھی اور اس سلسلہ میں جو تاکیدی احکام دیئے تھے اور اسکا جو عمومی نظام قائم فرمایا تھا' وہ صدیوں سے تقریباً معطل ہے 'امت کی مجموعی تعداد میں اس فریضہ کے ادا کرنے والے فی ہزار ایک کے تناسب بھی نہیں ہیں' الغرض یہ وہی صورت حال ہے 'جس کی رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں واضح آگاہی دی تھی۔

○ **<u>مذکورہ حدیث کا دوسرا مطلب :</u>**

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی واضح ہو جاتاہے 'کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو باتوں میں ایک بات کا ہونا ضروری ہے یا تم یقینا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروگے یا ان دونوں فریضوں کے کرنے پر یقینا اللہ تعالی تم پر تمہارے برے لوگوں کو مسلط کر دیگا پھر تمہارے نیک لوگ (بُرے لوگوں کی ہلاکت کے لیے) دعا کریں گے مگر ان کی دعا قبول نہیں کی جائے گی۔ (طبرانی اوسط)

عن أبي بكر الصديق رضي الله عنه قال يا أيها الناس إنكم تقرؤون هذه الآية يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم فإني سمعت رسول الله يقول إن الناس إذا رأوا منكرا فلم يغيروايوشك أن يعمهم الله منه بعقابه"

(رواہ ابن ماجہ والترمذی)

○ **<u>حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی آپ ﷺ کے ارشاد گرامی کا مفہوم :</u>**

کہ تم لوگ قرآن پاک کی یہ آیت پڑھتے ہو۔

(يا أيها الذين آمنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم-----)

(اے ایمان والو تم پر لازم ہے 'کہ اپنے نفسوں کی فکر کرو' تمہارے کچھ نہ بگاڑیں گے گمراہ ہونے والے لوگ جب تم راہ ہدایت پر ہو)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس آیت کا حوالہ دیکر فرمایا کہ کسی کو اس آیت سے غلط فہمی نہ ہو) میں خود رسول اللہ ﷺ سے

سنا ہے 'آپ ﷺ فرماتے تھے کہ جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ شریعت کے خلاف کام کرتے ہوتے دیکھیں اور اسکی تغیر وصلاح کے لیے کچھ نہ کریں تو قریبی خطرہ ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے ان سب ہی پر عذاب آجائے۔

تشریح :

سورۃ مائدہ کی یہ آیت جس کا حوالہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دیا ہے 'اس آیت کے ظاہری الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ اسکی فکر کریں کہ وہ خود اللہ ورسول کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلتے رہیں' دوسروں کی اصلاح وہدایت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے 'اگر دوسرے لوگ اللہ اور رسول کے احکام کے خلاف چل رہے ہیں تو چلتے رہیں' ہم کو ان کی گمراہی اور غلط کاری سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے فرمایا کہ آیت سے ایسا سمجھنا غلط ہوگا' میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جب لوگوں کا رویّہ یہ ہو جائے کہ وہ دوسرے لوگوں کو خلاف شریعت کام کرتے دیکھیں اور ان کی اصلاح کے لیے کچھ نہ کریں بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں تو اس بات کا قریبی خطرہ ہوگا کہ خدا کی طرف سے ایسا عذاب آئے جو سب ہی کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

صدیق اکبرؓ کی اس حدیث اور قرآن و حدیث کے دوسرے نصوص کی روشنی میں سورۃ مائدہ کی اس آیت کا مفاد اور مدعی یہ ہوگا کہ اے اہل ایمان جب تم راہ ہدایت پر ہو 'اللہ و سول کے احکام کی تعمیل کر رہے ہو (جس میں امر بالمعروف نہی عن المنکر اور بقدر امکان بندگان خدا کی اصلاح و ہدایت کی کوشش بھی شامل ہے) تو اس کے بعد جو ناخداترس لوگ ہدایت قبول نہ کریں اور گمراہی کی حالت میں رہیں 'تو اس کی اس گمراہی اور معصیت کوشی کی تم پر کوئی ذمہ داری نہیں 'کہ تم عند اللہ بری الذمہ ہو۔

- "عن جریر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول :مامن رجل یکون فی قوم یعمل فیھم بالمعاصی یقدرون علی ان یُغیروا علیہ ولا یُغیرون الا اصابھم اللہ بعقاب قبل ان یموتوا"

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرماتے تھے کہ کسی قوم میں کوئی آدمی ہو جو ایسے اعمال کرتا ہو جو گناہ اور خلاف شریعت ہیں اور اس قوم اور جماعت کے لوگ اس کی قدرت اور طاقت رکھتے ہوں کہ اس کی اصلاح کردیں اور اس کے باوجود اصلاح نہ کریں (اسی حال میں اس کو چھوڑے رکھیں) تو ان لوگوں کو اللہ تعالی مرنے سے پہلے کسی عذاب میں مبتلا فرمائے گا۔

تشریح :

مطلب یہ ہے کہ استطاعت اور قدرت کے باوجود غلط کار اور بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح وہدایت کی کوشش نہ کرنا اور بے پروائی کا رویہ اختیار کرنا 'اللہ کے نزدیک ایسا گناہ ہے جس کی سزا آخرت سے پہلے اس دنیا میں بھی دی جاتی ہے۔

- "عن جابر قال قال رسولﷺاوحی اللہ عزوجل الی جبرئیل علیہ السلام ان اقلب مدینۃ کذاوکذا باھلھا ،فقال یارب ان فیھم عبدک فلانالم یعصک طرفۃعین ،قال تعالی اقلبھا علیہ فان وجھہ لم یتمعر فیّ ساعۃ قط "

(البیھقی فی شعب الایمان)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو پوری آبادی کے ساتھ الٹ دو جبرائیل نے عرض کیا خداوند اس شہر میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے، جس نے پل جھپکنے برابر بھی کبھی تیری نافرمانی نہیں کی، اللہ تعالی کا حکم ہوا کہ اس بستی کو اس بندے پر اور اسکے دوسرے سب باشندوں پر الٹ دو، کیونکہ کبھی ایک ساعت کے لیے بھی میری وجہ سے اس بندے کا چہرہ متغیر نہیں ہوا۔

تشریح :

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے پہلے کسی زمانہ کا یہ واقعہ بیان فرمایا کہ کوئی بستی تھی، جس کے باشندے عام طور سے سخت فاسق فاجر تھے اور ایسی بداعمالیاں کرتے تھے جو اللہ تعالی کے قہر وجلال کا باعث بن جاتی ہیں، لیکن اسی بستی میں ایک ایسا بندہ بھی تھا جو اپنی ذاتی زندگی کے لحاظ سے اللہ تعالی کا پورا فرمانبردار تھا اور اس سے کبھی معصیت سرزد نہیں ہوئی تھی، مگر دوسری طرف اس کا حال یہ تھا کہ بستی والوں کے فسق و فجور اور ان کی بداعمالیوں پر کبھی اس کو غصہ بھی نہیں آتا تھا اور اس کے چہرے پر شکنیں بھی نہیں پڑتی تھیں، اللہ تعالی کے نزدیک یہ بھی اس درجہ کا جرم تھا کہ جبرائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ بستی کے فاسق فاجر باشندوں کے ساتھ اس بندے پر بھی بستی کو الٹ دو۔

- ''عن العُرس بن عمیر عن النبی ﷺ قال اذا عملت الخطیئۃ فی الارض من شھدھا فکرھھا کان کمن غاب عنھا ومن غاب عنھا فرضیھا کان کمن شھدھا"

(سنن ابی داؤد)

حضرت عرس بن عمیرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کسی سرزمین میں گناہ کیا جائے تو جب لوگ وہاں موجود ہوں اور اس گناہ سے ناراض ہوں تو (اللہ کے نزدیک) وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو وہاں موجود نہیں ہیں (یعنی ان سے اس گناہ کے بارے میں کوئی بازپرس نہ ہوگی) اور جو لوگ اس گناہ والی سرزمین میں موجود نہ ہوں مگر اس گناہ سے راضی ہوں وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جو وہاں موجود تھے (اور گویا شریک گناہ تھے)۔

تشریح :

اس باب کی دوسری حدیثوں کی روشنی میں حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ جن لوگوں کے سامنے اللہ ورسول کے احکام اور شریعت کے خلاف کام کئے جائیں وہ اگر ان سے ناراض ہوں اور حسب استطاعت اصلاح و تغییر کی کوشش کریں ورنہ کم از کم دل ہی میں اس کے خلاف جذبہ رکھیں تو خواہ ان کی ناراضی اور کوشش کا کوئی اثر نہ ہو اور معصیتوں کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے، تب بھی ان سے کوئی بازپرس نہ ہوگی (بلکہ وہ انشاء اللہ ماجور ہوں گے) اور جن لوگوں کو ان خلاف شریعت کاموں سے ناگواری اور ناراضی بھی نہ ہو، وہ اگرچہ گناہوں کی جگہ سے دور ہوں پھر بھی وہ مجرم ہوں گے اور شریک گناہ سمجھے جائیں گے۔

- عن النعمان بن بشير رضي الله عنه عن النبيﷺقال مثل المدهن في حدود الله والواقع فيها مثل قوم استهموا سفينة فصار بعضهم في أسفلها وصار بعضهم في أعلاها فكان الذي في أسفلها يمرون بالماء على الذين (الذي)في أعلاها فتأذوا به فأخذ فأسا فجعل ينقر أسفل السفينة فأتوه فقالوا مالك قال تأذيتم بي ولا بد لي من الماء فإن أخذوا على يديه(يده) أنجوه ونجوا أنفسهم وإن تركوه أهلكوه وأهلكوا أنفسهم"

(بخاری ،کتاب الشركۃ)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا کہ مثال ان لوگوں کی جو اللہ کی حدود اور اسکے احکام کے بارے میں مداہنت (یعنی سہل انگاری اور ڈھیلے پن) سے کام لیتے ہیں' (روک ٹوک نہیں کرتے) اور ایسے لوگوں کی جو خود اللہ کی حدود کو پامال اور اسکے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں' ایک ایسے گروہ کی سی مثال ہے' جو باہم قرعہ اندازی کر کے ایک کشتی پر سوار ہوا تو کچھ لوگوں نے کشتی کے نیچے کے درجہ میں جگہ پائی اور کچھ نے اوپر والے درجہ میں' تو نیچے کے درجہ والا آدمی پانی لے کر اوپر کے درجہ والوں پر سے گزرتا تھا' اس سے انہوں نے تکلیف محسوس کی (اور اس پر ناراضی کا اظہار کیا) تو نیچے کے درجے والے نے کلہاڑا لیا اور لگا سوراخ کرنے کشتی کے نیچے کے حصے میں (تاکہ نیچے ہی سے دریا سے براہ راست پانی حاصل کرلے اور پانی کے لیے اوپر آنا جانا نہ پڑے) تو اوپر کے درجہ والے اس کے پاس آئے اور کہا کہ تم کو کیا ہو گیا ہے؟ (یہ کیا کر رہے ہو؟) اس نے کہا کہ (پانی کے لیے میرے آنے جانے سے) تم کو تکلیف ہوئی (اور تم نے ناراضی کا اظہار کیا) اور پانی تو (زندگی کی) ناگزیر ضرورت ہے (میں دریا سے پانی حاصل کرنے کے لیے یہ سوراخ کر رہا ہوں' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) تو اگر یہ کشتی والے اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیں (اور اس کو کشتی میں سوراخ نہ کرنے دیں) تو اس کو بھی ہلاکت سے بچا لیں گے' اور اپنے کو بھی اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں گے (اور کشتی میں سوراخ کرنے دیں گے) تو اس کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے' اور اپنے کو بھی (سب ہی غرقاب ہو جائیں گے)۔

تشریح: بڑی ہی عام فہم اور سبق آموز مثال ہے' حدیث کا پیغام یہ ہے کہ جب کسی بستی یا کسی گروہ میں اللہ کی حدود پامال کی جاتی ہوں اور اس کے احکام کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوتی ہو' وہ بداعمالیاں ہوتی ہوں جو خداوند ذو الجلال کے قہر وعذاب کو دعوت دیتی ہیں' تو اگر ان میں اچھے اور نیک لوگ اصلاح و ہدایت کی کوئی کوشش نہیں کریں گے' تو جب خدا کا عذاب نازل ہوگا تو یہ بھی اسکی لپیٹ میں آجائیں گے اور ان کی ذاتی نیکی اور پرہیزگاری ان کو نہ بچا سکے گی' قرآن پاک میں بھی فرمایا گیا ہے:

"و اتقوافتنۃلاتصیبین الذین ظلموا منکم خاصۃواعلموا ان اللہ شدید العقاب "

(الانفال ۲۵)

(اور اس عذاب سے ڈرو اور بچنے کی کوشش کرو' جو صرف ظالموں مجرموں ہی پر نہیں آئے گا' اور خوب جان لو کہ اللہ کی سزا بڑی ہی سخت ہے)۔

- عن عبد اللہ بن مسعود قال :قال رسول اللہ -ﷺ- :« لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نہتہم علماؤ ہم فلم ینتہو فجالسو ہم فی مجالسہم و اکلو ہم وشاربو ہم فضرب اللہ قلوب بعضہم ببعض فلعنہم علی لسان داؤد و عیسی ابن مریم ذالک بما عصوا و کانوا یعتدون قال فجلس رسو ل ﷺ وکان متکئا فقا ل لا والذی نفسی بیدہ حتی تأطروہم أطراً و فی روایۃ ابی داؤد "قال « کلا واللہ لتأمرن بالمعروف ولتنہون عن المنکر ولتأخذن علی یدی الظالم ولتأطرنہ علی الحق أطرا ولتقصرنہ علی الحق قصرا او لیضربن اللہ بقلوب بعضکم علی بعض ثم لیلعننکم کما لعنہم "

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل جب گناہوں میں مبتلاء ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو روکا اور جب وہ باز نہ آئے تو ان کے علماء بھی ان کی مجلسوں کے ہم نشین بن گئے اور ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ ہو گئے چنانچہ اللہ

تعالی نے ان سب کو خلط ملط کردیا اور ان کے دلوں کو آپس میں ایک دوسرے کے دل کے ساتھ ملادیا پھر اللہ تعالی نے ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسی علیہم السلام کی زبان کے ذریعہ لعنت فرمائی اور یہ لعنت اس لیے کی گئی تھی کہ ان لوگوں نے گناہ کئے اور حد سے تجاوز کیا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اس وقت تکیہ لگائے بیٹھے تھے 'سیدھے بیٹھ گئے۔ چنانچہ فرمایا اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے 'تم اس وقت تک عذاب الہی سے نجات نہیں پاسکوگے جب تک کہ ظالموں کو ان کے ظلم سے اور فاسقوں کو ان کے گناہوں سے نہیں روکوگے۔ اور ابوداؤد کی ایک میں یوں ہے کہ آپ نے فرمایا (تمہارا یہ گمان ہے کہ سکوت و مداہنت کے باوجود تمہیں عذاب الہی سے نجات مل جائے گی تو) ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ خدا کی قسم تمہارے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو نیکی کی راہ اختیار کرنے کا حکم دو اور ان کو برائی کی راہ سے روکو 'ظالم کا ہاتھ پکڑو 'اس کو حق کی طرف مائل کرو اور اس کو حق وانصاف کی راہ پر قائم کرو اگر تم ایسا نہیں کروگے تو پھر اللہ تعالی تمہارے دلوں کو بھی آپس میں ایک دوسرے کے دل کے ساتھ خلط ملط کردیگا اور پھر تم پر لعنت فرمائے گا جیسا کہ بنی اسرائیل پر (ان کے گناہوں کی وجہ سے) لعنت فرمائی تھی۔

تشریح : " فضرب الله قلوب بعضهم ببعض فلعنهم"

مطلب یہی ہے کہ سب ملکر گناہ میں پڑ گئے تو اللہ تعالی نے پہلے ان کے دلوں کو سیاہ کردیا اور اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہوگئے 'پھر ان کے دل اجتماعی طور پر سخت کردیئے گئے ' جس سے وہ اللہ تعالی سے دور ہوگئے اب وہ اس قابل نہیں رہے کہ حق کو قبول کرسکیں اس لئے مسخ ہو کر کچھ تو خنزیر بن گئے اور کچھ لنگور بن گئے 'اس بیان کے بعد آنحضرت ﷺ اہتمام کے ساتھ بیٹھ گئے 'اور مزید ارشادات کو مجمع کے سامنے بیان فرمادیا جس میں یہ ارشاد تھا کہ خدا کی قسم ! تمہیں ظالم کا ہاتھ پکڑ کر منکر سے روکنا ہوگا ورنہ تمہارے دل بھی ان کے دلوں کی طرح ہوجائیں گے 'اور اگر وہ باز نہیں آئے تو تم ان سے الگ ہو جاؤ اور کنارہ کشی اختیار کرو 'نہ ان کے پاس بیٹھا کرو 'نہ ان کو کھلاؤ 'نہ ان سے کھاؤ 'نہ پیو 'نہ پلاؤ۔ (توضیحات ۷/۲۷ 'معارف الحدیث ۲۷/۸)۔'

(۵/۴) اِمر بالمعروف کے شرعی حکم اور اِمر بالمعروف کے اقسام کے بارے میں حضرت مفتی شفیع رحمہ اللہ معارف القرآن ۲/۷۱۳ 'پر لکھتے ہیں 'کہ اِمر بالمعروف کے دو درجے ہیں 'پہلا درجہ " کنتم خیر امت اِخرجت للناس "اس آیت مبارکہ میں پوری امت پر اِمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ عائد کیا گیا ہے 'اور دوسری امتوں پر اسکی فضیلت کا سبب ہی اس خاص کام کو بتلایا ہے 'اِمر بالمعروف کا دوسرا درجہ یہ ھیکہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت وارشاد ہی کیلئے قائم رہے 'اسکا وظیفہ یہی ہو کہ اپنے قول و عمل سے لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف بلائے 'اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست 'برائیوں میں مبتلاء دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے اور چونکہ اس اہم فریضہ یعنی اِمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری طرح اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے 'جب کہ اسکو مسائل کا پورا علم بھی ہو اور اِمر بالمعروف کو مؤثر بنانے کے اداب اور طریقے بھی سنت کے مطابق اسکو معلوم ہوں 'اس لئے مکمل طور پر اِمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب

پر مأمور کیا گیا ؛جو ہر طرح دعوت الی الخیر اِمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہو ؛ چنانچہ اسی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت اور اہمیت کو بتلاتے ہوئے ؛فرمایا

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ"

یعنی تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے ؛کہ خیر کی طرف بلایا کریں ؛اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں سے روکا کریں ؛اور یہی لوگ کامیاب ہیں "**ولتکن**" میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے ؛اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہو گا ؛کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں ؛ کیونکہ انکی حیات ملی اسی وقت محفوظ رہے گی ؛ جب تک یہ جماعت باقی ہے (معارف ۱۴۰/۲)

اسی آیت کریمہ اور دوسرے دلائل کو دیکھتے ہوئے جمہور علماء کرام کا یہی موقف رہا ہے ؛کہ اِمر بالمعروف کا یہ درجہ فرض کفایہ ہے۔

''ان العلماءاتفقوا علی أن الأمر بالمعروف والنہی عن المنکرمن فروض الکفایہ و لم یخا لف ذالک الا النزر۔۔۔''

(روح ۲۱/۴)

- **''مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح'' :**

''عن أبي سعيد الخدري أن رسول الله قال من رأى أي علم منكم منكرا أي في غيره من المؤمنين والخطاب للصحابة أصالة ولغيرهم من الأمة تبعا وفي الإتيان بمن التبعيضية إشعار بأنه من فروض الكفاية وإيماء إلى أنه لا يباشره إلا من يعرف مراتب الإحسان وتفاوت المنكرات ويميز بين المتفق عليه والمختلف فيه منها وهذا المعنى مقتبس من قوله تعالى ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ۔''آل عمران

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے پہلے درجے میں علماء کرام نے قدرے تفصیل بیان کی ہے ؛اور اس درجہ کا اِصل و مدار آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ "من رای منکم۔۔۔۔۔۔۔۔۔"حدیث مذکورہ اِمر بالمعروف و نہی عن المنکر تین مراتب بیان کئے گئے ہیں۔(۱) قوت سے بُرائی کو مٹانا (۲) زبان سے بُرائی ختم کرنا (۳) دل ہی میں اسکے مٹانے کا جذبہ رکھتے ہوئے اسے بُرا سمجھنااور یہ زبان کا سب سے کمزور درجہ ہے ؛اور دوسری حدیث میں وارد ہے کہ "لیس "اگر دل سے بھی بُرا نہیں سمجھتاہے ؛تو سمجھ لینا چاہیے ؛کہ اس میں ایمان کی کوئی نشانی بھی نہیں۔

<u>امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مراتب :</u>

- ✓ **<u>مرتبہ اول کی تفصیل :</u>**

پہلے مرتبہ کا دار مدار قوت پر ہے ؛اس لئے بعض اہل علم نے اسے خلیفہ المسلمین ؛صاحب اقتدار کیلئے خاص کر رکھاہے کہ وہ صاحب قدرت ہوتا ہے ؛یعنی قوت کے ساتھ بُرائی مٹانا خلیفہ المسلمین کی ذمہ داری ہے ؛لیکن "من" کی تعبیر کو بالکلیہ ختم کرکے اس مرتبہ کو خلیفہ کے لئے خاص کرنا بھی درست نہیں ہے ؛اس میں تفصیل ہے۔

(۱)صاحب اقتدار پر بُرائی کو قوت سے مٹانافرض عین ہے ؛ (شرح نووی مسلم ؛۲۳/۲) ۔

(۲)رعایا میں سے جس شخص کو ذاتی طور کسی شخص پر قدرت حاصل ہے ؛تواس پر بھی بُرائی مٹانافرض عین ہے ؛ جیسے باپ کواولاد پر استاد کو شاگرد پر ؛سردار کو قوم پر ؛سیٹھ کوملازمین پر ؛زوج کو زوجہ پر۔

(شرح نووی مسلم ،۲/۲۳۔اِلا کلکم راع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

الفتاوى الهندية - (5 / 352)

"أن الأمر بالمعروف على وجوه إن كان يعلم بأكبر رأيه أنه لو أمر بالمعروف يقبلون ذلك منه ويمنعون عن المنكر فالأمر واجب عليه ولا يسعه تركه"

الفقه الإسلامي وأدلته-أ. د. وهبة الزحيلي - (8 / 375)

" ويصير فرض عين على القادر الذي لم يقم به غيره من ذوي الولاية والسلطان، فعليهم من الوجوب ما ليس على غيرهم، فإن مناط الوجوب: هو القدرة، فيجب على القادر ما لا يجب على العاجز، قال الله تعالى: {فاتقوا الله ما استطعتم} ''

(۳) اگر منکر کسی ایسی جگہ میں ہورہاہے جس کا علم صرف ایک ہی شخص کو ہے اور وہ اس کے ازالے پر قادر ہے تو اس کاازالہ فرض عین ہے۔۔

(۴) بعض صورتین ایسی ہیں جن میں ہر فرد کو منکر کے ازالے کے لئے قوت کا استعمال جائز ہے ،مگر واجب اور فرض عین نہیں ہے ' مثلا : جان ومال اور عصمت کی حفاظت کیلئے قاتل ،ڈاکو 'بدمعاش ،زانی کو بُرائی سے روکے اور سکے لئے قوت کا استعمال کرے ' تو جائز ہے ۔(من قتل دون مالہ فھو شھید)

(۵) مسلمانوں کی کوئی جماعت بُرائی کو بزور قوت مٹانے پر آمادہ ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے ؟

<u>علامہ ابن تیمیہ ' ابن القیم الجوزی ' عزالدین بن عبد السلام فرماتے ہیں ' نہی عن المنکر میں چار احتمالات ہیں :</u>

(۱) اگر اِمر بالمعروف کے نتیجے میں بُرائی ختم ہو جائے ' اسکی جگہ نیکی قائم ہو جانے کا امکان ہو تو اسے بزور قوت مٹانا درست ہے ۔

(۲) بُرائی مکمل ختم نہ ہو مگر پہلے سے کم ہو جانے امکان ہو تو بھی اِمر بالمعروف و نہی عن المنکر درست ہے ۔

(۳) اگر اِمر بالمعروف کے نتیجے میں بُرائی کی جگہ اسی طرح کی بُرائی وجود میں آنے کا امکان ہو تو کرنے اور چھوڑنے دونوں کی گنجائش ہے۔

(۴) اگر امر بالمعروف کے نتیجے میں سابقہ بُرائی سے بڑی بُرائی کے قائم ہونے کا احتمال ہو تو ایسے مقامات پر امر بالمعروف ممنوع ہے۔

(الزواجر ،۲/۱۶۹، الحسبۃ ،۲۷/۲۹،)

✓ **<u>مرتبہ ثانی کی تفصیل :</u>**

زبان سے بُرائی ختم کرنے کی استطاعت ہو تو اولا نیکی کی ترغیب دے ،نرم لہجہ اختیار کرے ،اگر یہ کارآمد نہ ہو تو سخت لہجہ اختیار کرے ،مگر گالی گلوچ نہ دے ،اگر یہ بھی کارآمد نہ ہو تو ڈرائے دھمکائے ۔

(بدائع الصنائع، دارالكتب العلمية - (2 / 334)

"أن الآمر يبدأ بالموعظة على الرفق واللين دون التغليظ في القول، فإن قبلت، وإلا غلظ القول به، ومثلہ فی الھندیہ ،کتاب الکراھیہ ،۴۰۷/۵،الموسوعۃ الفقھیہ ،۱۷/ ۲۴۱)

دونوں مراتب کے چند بنیادی اصول :

بُرائی کو ہاتھ سے مٹانے اور زبان سے مٹانے میں بنیادی شرط قدرت ہے ' اگر قدرت نہ ہو تو ترک کرنا جائز ہے ' وجوب باقی نہیں رہتا ' ہاں البتہ استحباب پھر باقی رہتاہے ' یہی عزالدین اور علامہ غزالی کا موقف ہے۔

(تحفة الناظر ، الادب الشرعية ، ۱/۱۸۰،الموسوعة الفقهية ، ۱۷/ ۲۴۰)

✓ **مرتبہ ثالث کی تفصیل :**

اگر ہاتھ اور زبان سے بُرائی مٹانے پر قدرت نہ ہو تو دل سے اسکو بُرا سمجھنا فرض ہے ' اور یہ ارادہ رکھنا ضروری ہے کہ جب بھی قدرت ملی اسے مٹاؤں گا۔

❖ **امر بالمعروف کیلئے حکومت کا ہونا :**

جمہور علماء امت کی رائے یہ ہیکہ ہر مسلمان یہ فریضہ انجام دے سکتاہے ' کیونکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے دلائل عام ہیں ' ان کی عمومیت کو ختم کر کے اسے اصحاب اقتدار کے ساتھ خاص کرنا درست نہیں ' باقی تفصیلات تو پہلے گذر گئی۔(الموسوعة الفقهيه ۲۴۰/۱۷)

تفسير ابن المنذر - (1 / 332)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: " {كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ} قَالَ: تَجِيئُونَ بِهِمْ فِي السَّلاسِلِ تُدْخِلُونَهُمْ فِي الإِسْلامِ "

تفسير الثعلبي - (1 / 462)

وقال حذيفة اليماني : يأتي على الناس زمان لئن يكون فيهم جيفة حمار أحب إليهم من مؤمن يأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر .

وقال الثوري : إذا كان الرجل مُحبّباً في جيرانه محموداً عند القوم فاعلم أنه مداهن .

، عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، فِي قوله: " {كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ} يَقُولُ: تَأْمُرُونَهُمْ أَنْ يَشْهَدُوا أَنْ لا إِلَهَ إِلا اللهُ، وَالإِقْرَارَ بِمَا أَنْزَلَ اللهُ، وَتُقَاتِلُونَهُمْ عَلَيْهِ، لا إِلَهَ إِلا اللهُ هُوَ أَعْظَمُ الْمَعْرُوفِ، وَتَنْهَوْنَهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَالْمُنْكَرُ التَّكْذِيبُ وَهُوَ أَنْكَرُ الْمُنْكَرِ.

وتخصص هذه الفئة بما ذكر لا يمنع كون الأمر بالمعروف والنّهي عن المنكر واجبا على كلّ فرد من أفراد الأمّة بحسبه، كما ثبت في صحيح مسلم عن أبي هريرة قال: قال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم: «من رأى منكم منكرا فليغيّره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان»و في رواية: «وليس وراء ذلك من الإيمان حبّة خردل». صفوة التفاسير - (1 / 182)

روي عن عمر رضي الله عنه أنه قال « من سرَّه أن يكون من هذه الأمة فليؤد شرط الله فيها »

تفسير النيسابوري - (2 / 325) وروي عن النبي ﷺ « من أمر بالمعروف ونهى عن المنكر فهو خليفة الله في أرضه وخليفة رسول الله وخليفة كتابه » وعن علي : أفضل الجهاد الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ، ومن شنأ الفاسقين وغضب لله غضب الله له وكفى بقوله تعالى : { وأولئك هم المفلحون }

تفسير القرطبي - (4 / 162) القول الأول أصح فإنه يدل على أن الأمر بالمعروف والنهي عن المنكر فرض على الكفاية وقد عينهم الله تعالى بقوله : { الذين إن مكناهم في الأرض أقاموا الصلاة } [الحج : 41]

"ويأمرون بالمعروف"، يقول: يأمرون الناس باتباع محمد ﷺ ودينه الذي جاء بهمن عند الله (2) "وينهون عن المنكر": يعني وينهون عن الكفر بالله والتكذيب بمحمد وبما جاء به من عند الله، بجهادهم بالأيدي والجوارح، حتى ينقادوا لكم بالطاعة.

مجرم کو تعزیری سزا دینا درست ہے اور یہ حاکم وقت (یا عوامی کمیٹی) کی صوابدید پر ہے' کہ کتنی سزا بہتر ہے۔جب کہ حد جاری کرنا صرف حاکم وقت کا کام ہے' کیونکہ شریعت میں بسااوقات مفاسد پیدا ہونے کی خاطر عدم جواز کا فتوی دیا جاتا ہے' حدود کا اجرا بھی انہی قبیل میں سے ہے۔تاہم کتب فتاوی میں درج ہے:

کہ عین برائی کے دوران (مثلا: زنا کا عمل جاری ہو) حاکم کے علاوہ دیگر افراد بھی تعزیری سزا بغیر کسی شک کے دے سکتے ہیں۔

(فتاوی شامیہ: کتاب الحدود)

جب کہ عین برائی کے دوران کے علاوہ اوقات میں حاکم وقت تعزیری سزا کا اجرا نہیں کرتا ہو' تو پنچائیت والے خاص کر رشتہ دار اپنے مجرم کو تعزیری سزا دے سکتے ہیں'

''فان دفع المنکر واجب علی کل من قدر علیہ لاسیما من یلحقہ عارہ۔''

تفصیل کے لیے:

(ردالمحتار: ج۳'ص۵۹۷'بحوالہ جامع الفتاوی: ج۷'ص۲۹۹'ط: ادارہ تالیفات اشرفیہ)

<u>پنچائیت کا تعزیری سزا دینا:</u>

ویسا تو حد اور تعزیر جاری کرنا حاکم وقت کا کام ہے' اگر دوران تعزیر مجرم مر بھی جائے' تب بھی از روئے شرع حاکم وقت کی گرفت نہیں ہوتی ہے۔البتہ جب حاکم وقت اپنی ذمہ داری سے غافل ہو اور لوگ آئے روز جرم کے مرتکب ہو رہے ہوں' تو ایسی حالات میں ہر شخص پر منکر کو اپنی طاقت کے مطابق ختم کرنا فرض ہے۔بہتر یہ ہے کہ ہر شخص اپنے رشتہ دار کو تعزیری سزا دیدے۔مثلا: نافرمان بیوی کو شوہر ہی سزا دے' حاکم وقت غفلت کا مظاہرہ کرتا ہو' یا مجرم کی مزید پشت پناہی کرتا ہو' تو شوہر برائی کے روک تھام کے لیے ہر ممکن اور جائز تعاون طلب کر سکتا ہے۔

نوٹ: اگر شوہر سزا دینے سے عاجز ہو' تو عامۃ المسلمین پر اس وقت برائی کا خاتمہ فرض ہو جاتا ہے۔

تفصیل کے لیے:

(احسن الفتاوی' کتاب الحدود والتعزیر: ج۵'ص ۵۱۵'ط: ایچ۔ایم سعید)

تعزیر میں جسمانی سزا کتنی ہونی چاہیے۔۔۔۔؟اس حوالہ سے اتنی بات ثابت ہے' کہ تعزیر کی مقدار حد شرعی سے کم ہونی چاہیے' اس کے باوجود بھی مجرم باز نہ آتا ہو' تو جیل میں بند کر دیا جائے' سوشل بائیکاٹ کیا جائے۔

اور بعض اوقات جرائم پیشہ افراد رات کو کسی کے گھر پھلانگ کر چوری کرتے ہیں' یا کسی خاتون کے ساتھ ناجائز تعلقات پر پکڑے جاتے ہیں اور یا مثلا: شوہر بلا کسی عذر شرعی کے خاتون کو طلاق دیتا ہے' جس سے خاتون کسمپرسی کے عالم میں بے بسی اور تنہائی کے سخت لمحات سہتی ہے اور خاندان والے ہتک عزت کے نام رقم لیتے ہیں' یا کمیٹی والے اس پر تاوان اور جرمانہ عائد کرتے ہیں ' جس کو شریعت میں تعزیر مالی (مالی جرمانہ) کہا جاتا ہے۔ اور یہ اس لیے لازمی ہوتا ہے کہ مجرم کا اس کے بغیر اصلاح ممکن نہیں ہوتی ہے۔

فقہ حنفی میں تعزیر مالی کی گنجائش نہیں ہے' البتہ امام ابو یوسفؒ نے فتوی دیا ہے' کہ مجرم پر تاوان عائد کر کے محفوظ کر دیا جائے اور سدھرنے کی صورت میں واپس کر دیا جائے۔

جب کہ دور حاضر میں معاصر علما نے انتہائی مجبوری کی صورت میں تعزیر مالی کے جواز کا فتوی دیا ہے۔ مثلا:

- عام طور لوگ وعظ و نصیحت سے نہ باز آتے ہیں اور نہ ہی کان دھرتے ہیں۔
- مجرم کو یہ پتہ چلے کہ مجھے مالی تاوان دوبارہ ملتا ہے تو اپنے جرم سے تائب نہیں ہوتا ہے۔
- اگر مجرم کو مالی جرمانہ نہ کیا جائے' وہ صرف جسمانی ریمانڈ سے باز نہیں آتا ہے۔

ان جیسے ناگفتہ بہ حالات میں اگر کمیٹی والے مالی جرمانہ عائد کرے اور وہ رقم مصلحت کی خاطر محفوظ رکھے' سدھرنے پر واپس کردے' بصورت دیگر اپنے انتظامی کاموں میں خرچ کرے' تو حرج نہ ہوگا۔

یاد رہے:

کمیٹی والوں کے لیے معتمد علماء کرام اپنے ساتھ شامل کرنا ضروری ہے' کیونکہ تعزیر مالی میں خصوصا فقہائے احناف کا بہت اختلاف ہیں' کہ تعزیر مالی حاکم وقت اور اس کے ماتحت کام کرنے والے قاضی کا کام ہے' جب کہ دور حاضر میں شرعی نظام قضاء کا فقدان ہے' تو فقہا نے بوجہ مجبوری تعزیر مالی کا اختیار وہاں کے مستند' معتمد اور مرجع الخلائق عالم دین کو دیا ہے۔ ورنہ اگر علماء کی نگرانی نہ ہو' تو بے جا' یا زیادہ مالی جرمانہ سے ظلم اور جبر کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا۔

تعزیر مالی فقہا کی زبانی:

تعزیر مالی (مالی جرمانہ) کے متعلق حضرات فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں کافی تفصیلی بحث کی ہیں، ان تمام تفصیلات اور بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ حضرات طرفین کے نزدیک مالی جرمانہ سرے سے جائز نہیں ہے اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حاکم وقت کے لئے تعزیر مالی کو جاری کرنا جائز و درست ہے۔ اور ساتھ میں یہ بات واضح رہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تعزیر مالی

کا جواز مطلقاً ہر جگہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ جہاں پر ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو مصلحت سمجھے گی وہاں پر جاری کرے گی۔اور فقہاء نے حضرات طرفین کے نزدیک عدم جواز کی جو بات نقل فرمائی ہے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تعزیر مالی شروع اسلام میں جائز تھی بعد میں یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے، لیکن فقہ السنہ کے اندر منسوخ ہونے کی بات کی تردید کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مالی جرمانہ شروع اسلام میں جائز تھا بعد میں منسوخ ہوچکا ہے،ان لوگوں کے پاس منسوخ ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل کے ہے؛اس لئے یہ حکم آج بھی بدستور باقی ہے؛ لہٰذا جہاں ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو جاری کرنا مصلحت سمجھے گی وہاں آج بھی تعزیر مالی (مالی جرمانہ) جاری کرنے کی گنجائش ہے۔

اور اگر وقتی طور پر کچھ مال ضبط کرکے رکھ لیں اور بعد میں جب وہ اپنے جرم سے تائب ہوجائے تو اسے واپس کردیں، تو ایسا کرنا سب کے نزدیک جائز ہے اور تائب نہ ہونے کی صورت میں امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق متاثر کے حوالہ کرنے کی گنجائش ہے۔اب فقہاء کے جزئیات ملاحظہ فرمایئے:

''فقہ السنہ''

"ومن قال: إن العقوبة المالية منسوخة فقد غلط على مذاهب الأئمة نقلا واستدلالا، وليس يسهل دعوى نسخها والمدعوون للنسخ ليس معهم سنة، ولا إجماع يصح دعواهم. "

(فقه السنة ۲/ ۵۳۵)

"وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ الأموال جائز للإمام.

(تبيين الحقائق قديم مكتبه إمداديه ملتان ۳/ ۲۰۸، جديد زكريا ۳/ ۶۳۴)

وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ المال جائز للإمام، وعندهما والشافعي ومالک وأحمد لا يجوز بأخذ المال، وما في الخلاصة: سمعت من ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضى ذلک أو الوالي جاز، ومن جملة ذلک رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلک من المشايخ لقول أبي يوسف."

(حاشية چلپی على الزيلعي، قديم ۳/ ۲۰۸، جديد زكريا ۳/ ۶۳۴)

"الأصل في مذهب أبي حنيفة أن التعزير بأخذ المال غير جائز، فأبو حنيفةومحمد لا يجيزانه، بل إن محمدا لم يذكره في كتاب من كتبه، أماأبويوسف فقد روى عنه أن التعزير بأخذ المال من الجاني جائز إن رؤية فيه مصلحة."

(الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۲/ ۲۷۰)

"يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلک من المشايخ كقول أبي يوسف، وقال التمرتاشي:يجوز التعزير الذي يجب حقا الله تعاليلكل أحد بعلة النيابة عن الله تعالى."

(فتح القدير، زكريا ۵/ ۳۳۰)

"درمختار مع الشامی" میں اس کو ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، کافی تفصیل موجود ہے، اس میں سے تھوڑی سی عبارت اقتباس کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"لا بأخذ المال في المذہب (بحر) وفيہ عن البزازية وقيل: يجوز ومعناه أن يمسكہ مدة لينزجر ثم يعيده لہ، فإن أيس من توبتہ صرفہ إلى مايرى، وفي المجتبى: أنہ كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ، وتحتہ في الشامية: وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال وعندہماوباقى الأئمة لا يجوز۔"

(درمختار مع الشامي، زكريا ۶/۱۰۵۔۱۰۶، کراچی ۴/ ۶۱)

"بزازیہ" میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

"والتعزير بأخذ المال إن المصلحة فيہ جائزة قال مولانا خاتمة المجتہدين مولانا ركن الدين أبو يحيى الخوارزميؒ: معناه أن نأخذ مالہ ونودعہ، فإذا تاب نرده عليہ كما عرف في خيول البغاة وسلاحہم، وصوبہ الإمام ظہير الدين التمرتاشي الخوارزمي، قالوا: ومن جملتہ من لا يحضر الجماعة يجوزتعزيره بأخذ المال۔"

(البزازية على الہندية ۶/ ۴۲۷، زكريا جديد ۳/۲۵۱)

تعزیر مالی پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جو تجاویز منظور کی ہیں، اس کی تفصیل کے لیے:

(جدید فقہی مسائل: ج۶، ص ۴۷۱، ط: زمزم پبلشر)

مجرم کا جرم پاش کرنا:

عام طور کسی کی ذاتی معاملہ میں عیب پوشی کی ترغیب ہے، لیکن اگر وہ جرم متعدی ہو، معاشرہ کے لیے ناسور ہو، سمجھانے کے باوجود بھی وہ نہ سمجھے، تو اس وقت مجرم کا جرم افشاں کرنا درست ہے۔

یاد رہے:

مجرم کا جرم فاش اور آشکارا کرنا ایک جرائت مندانہ کا کام ہے، اس سے اگر فساد کا خاتمہ ہوتا ہے، تو فساد بڑھنے کا بھی خطرہ ہے، اس لیے کمیٹی، یا پنچائیت میں ایسے لوگوں کا ہونا ضروری ہیں، جو درپیش ہونے والے خطرات کو بھانپ سکتے ہوں اور اس کے کنڑول کرنے کی طاقت رکھ سکتے ہوں اور جرم کی وضاحت بھی صرف اصلاح معاشرہ اور مجرم کی خیر خواہی کی بنیاد پر ہو۔

پنچائیت کا اپنے اخراجات کے لیے کسی پر رقم مقرر کرنا:

عوامی کمیٹی اپنے اخراجات کے لیے ترغیبی مہم چلائیں، کسی پر رقم مقرر کرنا درست نہیں ہے، اس میں بسا اوقات لوگ دینے کو تیار نہیں ہوتے ہیں، تو ان پر خوامخواہ رقم مقرر کرنے میں طیب خاطر نہیں ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی اپنے صوابدید پر رقم دینا چاہیے، تو اجر اور ثواب ملے گا۔ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے:

- لایحل مال امرئ الابطیب منہ۔
- لایجوز لاحد ان یتصرف فی ملک الغیر بغیر اذنہ۔

آلات موسیقی توڑنا، یا ان کی مرمت پر اجرت لینا:

ایسے آلات جو محض گناہ کے لیے استعمال ہوتا ہوں، جیسے: باجہ، ستار وغیرہ۔ ان کا توڑنا درست ہے اور اس کی مرمت پر اجرت لینا ناجائز ہے۔

''والفتوی علی قولہمافی عدم الضمان...''

(الشامیۃ، بحوالہ احسن الفتاوی: ج۵، ص ۵۶۳)

تفصیل کے لیے:

احسن الفتاوی: ج۵، ص ۵۶۳، ط: ایچ۔ایم سعید)

(امداد الفتاوی: ج۳، ص ۱۳۹)

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- ❖ ذخیرہ اندوزی پر ایک فقہی نظر
- ❖ کرنسی میں ذخیرہ اندوزی کا حکم
- ❖ حکومتی نرخ کا شرعی حکم
- ❖ حکومت کا ذخیرہ شدہ مال نیلام کرنا
- ❖ بوجہ ولایت عامہ کے ذخیرہ شدہ مال پر حکومت کی ملکیت
- ❖ بھوسہ میں عشر

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

دورحاضر میں جب مہنگائی عروج پر ہے'انسانی ہمدردی کا فقدان ہے 'لوگ مال وزر بڑھانے کی خاطر ذخیرہ اندوزی (احتکار'اکتناز) کرنے میں مصروف ہیں۔ان حالات کے پیش نظرچند شرعی مسائل کی تحقیق مطلوب ہے :

1 ....کیاانسانی خوراک (مثلا : آٹا'دال' چاول 'اورگھی وغیرہ) میں ذخیرہ اندوزی مکروہ 'حرام اوریااس کے علاوہ ہے ؟

2 ....انسانی ضروریات زندگی (مثلا : کپڑے 'لکڑیاں' گاڑیاں اورپٹرول وغیرہ) میں ذخیرہ اندوزی درست ہے ؟

3 ....جانوروں کی خوراک (چارہ اور بھوسہ وغیرہ) میں ذخیرہ اندوزی کا کیا حکم ہے ؟

4 ....آج کل لوگ پاکستانی کرنسی کی آتار چڑھاؤ کی وجہ سے ڈالر کی ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں 'جس کا کرنسی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔کیا یہ بھی ذخیرہ اندوزی بھی شامل ہے ؟

5 ....بسا اوقات حکومت ذخیرہ اندوزوں پر چھاپہ مارتی ہے اوربرآمد شدہ سامان کاسرکاری نرخ کے مطابق نیلام کرتی ہے 'کیا اس صورت میں حکومت کی مداخلت اورنیلام درست ہے ؟

6 .... موجودہ دور میں حکومت چیزوں کی نرخ متعین کرتی ہے 'کیا اس نرخ نامہ کی کوئی شرعی حیثیت ہے اوراگر کوئی اس پر عمل نہ کرے 'تو حاصل شدہ منافع کا کیا حکم ہے ؟

7 .... کیاذخیرہ اندوزی کی کوئی مدت ہے 'کہ اگراتنی مدت نہ گزری ہو 'توذخیرہ اندوزی درست ہے ؟

8 ....آج کل بھوسہ مقصود سمجھ کراس کی باقاعدہ خریدوفروخت ہوتی ہے 'اب پوچھنا یہ ہے : کہ عشرصرف گندم میں ہے یا بھوسہ میں بھی عشر واجب ہے ؟

الجواب حامداومصليا

انسان کی تخلیق میں دوقوتیں کارفرماہیں : روح اورمادہ۔جس قوت کا غلبہ ہوجائیں اس کی خصلتیں انسان میں پیدا ہوجاتی ہیں 'وہ جب نیک اعمال کرتاہے 'اپنے رب کے احکام کو بجالاتاہے 'پیغمبراسلام ﷺ کے بتائے ہوئے نقش قدم پرچلتاہے 'صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے طریقوں پرگامزن ہوتاہے 'توروحانی سکون 'دلی اطمینان اوربے چین زندگی بطورنعمت ملتی ہے 'انبیاء علیہم السلام کی یہ قوت انتہاپرہوتی ہے 'اس لیے وحی الہی 'فیوضات ربانی اورفرشتوں کی ملاقات سے روح پروراورشاداب

ہوتے ہیں ٗجب کہ بسااوقات نفوس قدسیہ کو بھی کشف ہوجاتاہے ٗجس کا مطلب یہی لیاجاسکتاہے ٗکہ روحانی فیوضات قبول کرنے سے مادہ اورآلائش مادہ حاجب نہیں بنتے ہیں۔

اس کے برعکس جب حیوانی قوت ٗیامادہ کا غلبہ ہوتاہے ٗتوانسان خواہشات کی پجاری ٗاحکام ربانی سے غافل اور نفسی بے راہ روی کا شکار ہوجاتاہے ٗوہ مال وزر کاہوس ٗدنیاسے محبت اور موت سے نفرت کرنے لگتاہے۔اوروہ صرف اس پراکتفانہیں کرتاہے ٗبلکہ حیوانی خصلتیں ان کی زندگی میں سرایت کرجاتی ہیں ٗجوں جوں حیوانی زندگی انتہا پرہوتی توں توں آسمانی تعلیمات سے دور ہوتاہےاور پھر ظلم اوروحشت کی گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھٹکتارہتاہے۔

جیسے : حیوانوں کے مختلف طبقات ہیں : کچھ وہ جانور ہوتے ہیں جو محض نفع رساں ہیں۔مثلا : دنبہ اور بکری وغیرہ۔کچھ ایسے جانورہیں جو نفع رساں تونہیں ہیں ٗالبتہ نقصان بھی نہیں پہنچاتے ہیں۔مثلا : بلی وغیرہ۔ کچھ ایسے جانور ہوتے ہیں ٗجو محض ضرررساں ہیں۔ جیسے : سانپ اور بچھو وغیرہ۔

اسی طرح انسان جب حیوانیت کی سیڑھی میں قدم رکھنے لگتاہے ٗتوکسی نہ کسی درجہ میں وہ نسل انسانی کے ساتھ اپنارویہ اپناتاہے ٗمگرجب وہ انتہائی ظالم ہوتاہے ٗوہ چاہتاہے کہ دنیاپرمیراراج قائم ہو ٗمال وزرکے بٹورنے کے فکرمیں لگ جاتاہے ٗوحشت اورسفاکیت کی دیواروں کو پھلانگ کرجمع پونجی میں مصروف ہونے لگتاہے ٗپھر یہ انسان حیوانوں سے بھی زیادہ گمراہ ہوجاتاہے۔مال جمع کرکے دنیاپرراج اورجاگیرداری قائم کرنا چاہتاہے ٗکہ ہم چوں دیگرے نیست۔۔۔۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے مکرم پیدافرمایاہے ٗہونا تو چاہیے تھاکہ رب لم یزل کے سامنے سربسجود ہوتا اورسر موانحراف نہ کرتا ٗلیکن کچھ انسان اپنی حیثیت کھوچکا ہوتاہے ٗتھان ٗبت اورآگ کی پرستش معیارکامیابی قرار دیتاہے ٗحالانکہ ہدایت کی تجدید نو کے لیے انبیا علیہم السلام انہیں بھولاہواسبق یاد بھی دلاتے رہیں۔۔۔۔ ٗلیکن یہی انسان (اولئک کالانعام بل ھم اضل۔۔۔) کا مصداق بنا۔

زیرنظرمقالہ میں احتکاراورذخیرہ اندوزی کے متعلق شرعی احکام ومسائل ذکرکیے جاتے ہیں۔

احتکاراوراکتناز ذخیرہ اندوزی کو کہاجاتاہے۔اللہ کے محبوب پیغمبرآقائے دوعالم ٗسرورکونین ﷺ کاارشاد گرامی ہے :

"بئس العبد المحتکران ارخص اللّٰہ الاسعار حزن وان اغلاھا فرح"۔او کماقال۔

وہ ذخیرہ اندوز براہے ٗجو سستے داموں پر غمگیں اور مہنگے داموں پرخوش ہوتاہے۔

''الجالب مرزوق والمحتکر ملعون۔''اوکماقال۔

بازار میں چیزیں لانے والے کو رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوز اللہ تعالیٰ کی رحمت دور کیا جاتا ہے۔

'' من احتكر على المسلمين أربعين يوما ضربه الله بالجذام والإفلاس ۔''اوکماقال۔

جو شخص مسلمانوں پر چالیس دن مال روکے گا'اللہ تعالیٰ اس کو کوڑھ اور تنگ دستی کے مرض میں مبتلا کرے گا۔

" وفي رواية: " فقد برئ من الله وبرئ الله منه " قال في الكفاية : أي خذله والخذلان ترك النصرة عند الحاجة ا هـ

ذخیرہ اندوز کو اللہ پاک رسوا کرے گا اور بوقت ضرورت اس کی دادرسی نہیں کرے گا۔

وفي أخرى: " فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين لا يقبل الله منه صرفا ولا عدلا۔''

ذخیرہ اندوز پر اللہ تعالیٰ 'فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی اور اس کا فرض اور نفل کوئی عبادت قبول نہ ہوگی۔

مقالہ میں مذکور صورتوں کا حکم:

ذخیرہ اندوزی کے متعلق فقہا کا قدر اختلاف ہے'امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ صرف انسانی غذا میں استعمال ہونے والی اشیا کی ذخیرہ اندوزی کی حرمت کے قائل ہیں'جب کہ امام ابو یوسفؒ ہر قسم کی ضروریات زندگی کی ذخیرہ اندوزی کی حرمت کے قائل ہے'خواہ اس کا تعلق انسانی غذا سے ہو'انسانی ضروریات زندگی سے ہو اور یا حیوانوں کا چارہ وغیرہ ہو۔اور اس میں فتوی طرفین کے قول پر دیا گیا ہے۔

'' والتقييد بقوت البشر قول أبي حنيفة ومحمد وعليه الفتوى كذا في الكافي ، وعن أبي يوسف كل ما أضر بالعامة حبسه ، فهو احتكار وعن محمد الاحتكار في الثياب ابن كمال .''

(ردالمحتار،فصل فی البیع)

''الاحتكار في أقوات الآدميين والبهائم ببلد يضر بأهله، وعند أبي يوسف في كل ما يضر احتكاره بالعامة ولو ذهبا أو فضة أو ثوبا.''

(ملتقی الابحر،فصل فی البیع،ج1،ص213)

''وقال أبو يوسف كل ما يضر العامة فهو احتكار بالأقوات كان أو ثيابا أو دراهم أو دنانير اعتبارا لحقيقة الضرر لأنه هو المؤثر في الكراهة وهما اعتبر(اعتبرا)الحبس المتعارف وهو الحاصل في الأقوات في المدة۔''

(البحرالرائق،فصل فی البیع:ج8،ص 229)

اور ذخیرہ اندوزی کی تعریف میں بھی اختلاف ہے'امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بغیر کسی شرط کے غذائی قلّت 'یا کسی بھی ضروریات زندگی کی قلّت اور مہنگائی کے وقت احتکار ناجائز ہے'جب کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اپنی زمین کا غلہ ذخیرہ

کرنا درست ہے اسی طرح ایسی جگہ سے غذائی مواد خرید کر ذخیرہ کرنا بھی درست ہے'جہاں عام طور وہاں کے رہائشی سودا سلف نہیں خریدتے ہیں۔

''ولو اشترى طعاما في غير المصر ونقله إلى المصر وحبسه قال الإمام لا بأس به لأن حق العامة إنما يتعلق بما جمع من المصر أو جلب من فنائه وقال الثاني بكره(يكره) وقال محمد كل بقعة يمتد منها إلى المصر في العادة فهي بمنزلة فناء المصر يحرم الاحتكار منه وهذا في غاية الاحتياط ا هـ

قال رحمه الله (لا غلة ضيعته وما جلبه من بلد آخر) يعني لا يكره احتكار غلة أرضه وما جلبه من بلد آخر لأنه خالص حقه فلم يتعلق به حق العامة فلا يكون احتكارا ألا ترى أن له أن لا يزرع ولا يجلب فكذا له أن لا يبيع-----''

(البحرالرائق،فصل فی البیع:ج8،ص 229)

اختلاف ائمہ کو مدنظر رکھ کر دورحاضر میں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتوی دینا بہتر ہے'کہ ہر چیز میں ذخیرہ اندوزی حرام ہے'چاہے اس کا تعلق انسانی خوراک سے ہو'یا انسانی ضروریات زندگی سے متعلق ہو اور یا حیوانوں کی ضروریات زندگی سے تعلق رکھتی ہوں۔اور چاہے وہ کسی بھی جگہ سے درآمد کیا ہو'بشرطیکہ وہاں کے باسی ضروریات زندگی کی قلّت کے شکار ہو اور مہنگائی عروج پر ہو۔

اور اگر غذائی قلّت نہ ہو'مگر کوئی شخص صرف اس لیے ذخیرہ اندوزی کرتا ہے'کہ چیز مہنگی ہونے کی صورت میں فروخت کروں گا'تب بھی درستگی نیت نہ ہونے کی وجہ سے کراہت سے خالی نہ ہوگا۔

''بئس العبد المحتكران ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح''۔اوکماقال۔

وہ ذخیرہ اندوز براہے'جو سستے داموں پر غمگیں اور مہنگے داموں پر خوش ہوتا ہے۔

(کذافی نجم الفتاوی : ج۸'ص۵۷۹)

<u>یادرہے :</u>

ذخیرہ اندوزی کے مکروہ یا حرام ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے'کہ اس کا منافع سود یا شراب کی طرح حرام ہے'بلکہ یہ فعل اور عمل حرام ہے'البتہ اگر ایسی قیمت سے فروخت کی'جو مارکیٹ میں کسی کا نرخ نہ ہو'تو پھر یہ دھوکہ اور غبن فاحش ہے۔اس پر غبن فاحش کے احکام جاری ہوں گے۔کہ دھوکہ دہی ثابت ہونے پر خریدار بیع فسخ کرسکتا ہے۔

(تبیین الحقائق : ج۴'ص۴۳۶)

''ان لايدخل تحت تقويم المقومين۔''

(الشامية)

''الثمن المسمى ہوالذی يسميہ ويعنيہ العاقدان وقت البيع بالتراضی سواءکان مطابقا لقيمتہ الحقيقة او ناقصا اوزائدا عليها۔''

(شرح المجلة رستم ، ج ۱،ص ۷۳،المادة:۱۰۳)

''والفاصل بين القليل والكثير ان كانت زيادة تدخل تحت تقويم المقومين فہی قليلة ،ومالا تدخل تحت تقويہم فہی كثيرة ۔''

(بدائع الصنائع،فصل فی بیان حکم التوکیل،ج۷،ص ۴۳۶)

تفصیل کے لیے : خیار مغبون کی تحقیق۔

ذخیرہ اندوزی کے دوران کسی چیز پر زیادہ نفع لینا مکروہ تحریمی ہے۔

(نجم الفتاوی : ج۸ ،کتاب البیوع ،ص ۵۸۱)

امام ابو یوسفؒ کے فتوی کی ترجیحات :

- ✓ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا فتوی اپنے زمانہ کے عرف مبنی ہے۔

''وقال أبو يوسف كل ما يضر العامة فهو احتكار بالأقوات كان أو ثيابا أو دراهم أو دنانير اعتبارا لحقيقة الضرر لأنه هو المؤثر في الكراهة وهما اعتبر(اعتبرا) الحبس المتعارف وهو الحاصل في الأقوات في المدة فإذا قصرت لا يكون احتكارا لعدم الضرر إذا طالت يكون مكروها ـــ''

(البحرالرائق،فصل فی البیع:ج8،ص 229)

- ✓ ائمۂ ثلاثہ میں سے امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ بھی مطلقاً احتکار کی ممانعت کے قائل ہیں۔
- ✓ احادیث میں مطلق احتکار کا بھی ذکر ہے اور بعام کی قید بھی ہے۔جس سے ظاہر ہوتا ہے ،کہ ذخیرہ اندوزی حرام ہے جس سے لوگ فقر وفاقہ میں مبتلا ہو جائیں اور یا چیزوں کی قلّت سے مہنگائی پیدا ہو جائیں۔خواہ وہ غذا کی صورت میں ہو اور یا عام ضروریات زندگی ہوں۔
- ✓ آج کل جدید فتاوی میں تقریبا معاشی زبوں حالی اور ذخیرہ اندوزی سے پیدا ہونے والی مشکلات اور مصیبتوں کے دوران مطلق احتکار کی ممانعت کا فتوی دیا گیا ہے۔
- ✓ ادخار اور احتکار کے درمیان فرق بیان کرنے کے متعلق الموسوعۃ میں درج ہے :

اپنی جان اور عیال کے لیے جمع شدہ خوراک ادخار ہے ،جب کہ کاروبار کے لیے جمع شدہ خوراک احتکار ہے۔اور اگر ذخیرہ شدہ سامان کی وجہ سے مہنگائی بڑھتی ہوں اور ضروریات کی قلّت کی وجہ سے لوگ پریشان ہو ،تو ذخیرہ اندوزوں کو سامان فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔

''علی ان الحطاب نقل عن النووی اجماع العلمائ علی انہ ان کان عند انسان (ای مایحتاجہ الناس) او اضطر الناس الیہ ،ولم یجدوا غیرہ اجبر علی بیعہ دفعا للضرر عن الناس۔وھو مایتفق مع قاعدۃ:

(یتحمل الضرر الخاص لدفع ضرر عام) ''

(ج۲،ص ۳۵۰)

اخراجات المدخرات وقت الضرورۃ :

یتفق الفقھائ علی ان من ادخر شیئا من الاقوات الضروریۃ لنفسہ او لعیالہ واضطر الیہ احد غیرہ کان علیہ بذلہ لہ ان لم یکن محتاجا الیہ حالا ؛لان الضرر لایزال بالضرر۔

(مذکورہ بالاماخذ)

- ✓ **غیر غذائی مواد کے متعلق :**

ادخار غیر الاقوات :

والکراع والسلاح ونحو ذلک فانہ غیرضروری فی اوقات السلم ،ولکنہ یصبح ضروریا ایام الحرب ،وعلی الدولۃ بذلہ للمحتاج حین اضطرارہ الیہ ۔
(مذکورہ بالاماخذ:ص ۳۵۱)

✓ **فتح الملہم کی عبارت :**

''والذی یبدو لھذا العبد الضعیف ان حرمۃ احتکارالطعام ثابتۃ بالحدیث من غیرشک ،فکان امرتشریعیامعمولابہ الی الابد؛لان حاجۃ الناس الی الطعام اکثرمنہاالی غیرہ۔اما احتکارالاشیائ الاخری فیفوض الی رای الحاکم ،فان رأی فی احتکارھاضرراشدیدا نظیراالضررفی الطعام والأجازہ۔''
(فتح الملھم :ج۱،ص۶۵۷،ماخوذ ازنجم الفتاوی:ج۸،ص۵۸۱)

لہٰذا صورت مسئولہ میں 3،2،1 کاجواب یہی ہوگا،کہ جب حقیقی طورپر معاشی زبوں حالی ہو،فقروفاقہ زیادہ ہو،آئے روز مہنگائی اورلوگ ہرقسم کی ضروریات زندگی سے محروم ہوں اوریہ سب کچھ ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے ہو،توپھراحتکارا وراکتناز حرام ہے۔

4 ۔۔۔کرنسی میں احتکار :

کرنسی میں عام طور مہنگائی دوطرح ہوتی ہے :

ایک یہ ہے کہ عالمی منڈی میں طلب ورسد کی بنیادپر کرنسی کااتارچڑھاؤ ہو اوروہ مہنگائی درآمدات اوربرآمدات کی کمی کی وجہ سے ہو،توپھرڈالرکی ذخیرہ اندوزی درست ہے اوراگرملکی معیشت ڈالرکی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے کمزورہورہی ہوں،اور ڈالراسٹاک کی وجہ سے کرنسی کی قیمت میں اضافہ ہورہاہو،توپھراحتکاردرست نہیں ہے۔

''الاحتكار في أقوات الآدميين والبهائم ببلد يضر بأهله، وعند أبي يوسف في كل ما يضر احتكاره بالعامة ولو ذهبا أو فضة أو ثوبا. ----''
(ملتقی الابحر،فصل فی البیع،ج1،ص213)

نوٹ : اسی طرح فتوی دارالافتاءالاخلاص ،کراچی سے بھی شائع ہواہے۔

5 ۔۔۔ذخیرہ اندوزوں پر حکومت کا چھاپہ :

حکومت انہیں تنبیہ کرے کہ وہ اپنی ضرورت کے علاوہ چیزیں فروخت کریں،بصورت دیگر تعزیری سزادیدے۔اوراگر فقروفاقہ کی شدت ہو اور تقسیم غلہ ناگزیرہو،توحاکم وقت ذخیرہ اندوزوں سے غلہ ضبط کریں اورحاجت مندلوگوں میں تقسیم کریں اورفراوانی کی صورت میں مالکان کواپناغلہ واپس دیدیں۔

''وإذا وقع الضرر بأهل البلد واضطروا إلى الطعام ورفعوا أمرهم إلى القاضي أمر المحتكر أن يبيع ما فضل عن قوته وقوت أهله على اعتبار السعة في ذلك وينهاه عن الاحتكار فإن رفع إليه مرة أخرى حبسه وعزره على ما يرى زجرا له ودفعا للضرر عن الناس قال محمد أجبر المحتكرين على بيع ما احتكروا ولا أسعر وأقول لهم بيعوا كما يبيع الناس وبزيادة يتغابن في مثلها ولا أقول لهم بيعوا بأكثر منها وإذا خاف الإمام على أهل البلد الهلاك أخذ الطعام من المحتكرين وفرقه عليهم فإذا وجدوا سعة ردوا مثله وهذا ليس بحجر إنما هو للضرورة من اضطر إلى مال غيره وخاف الهلاك جاز له تناوله بغير رضاه----''

(الجوهرالنيرة،لاينبغى للسلطان ان يسعر على الناسِ،ج 6ص177)

6 ...سرکاری نرخ پر عمل دار آمد کا شرعی حکم :

معاشی فروغ اور تجارتی لین دین میں حکومت کی طرف سے نرخ مقرر کرنا درست نہیں ہے، تاکہ ہر ایک آزادانہ طور کاروبار کرسکے۔ البتہ بسا اوقات لوگ حکومت کی عدم مداخلت سے اجارہ داری قائم کرنے لگتے ہیں، چند سرمایہ دار مل کر چیزوں کی قیمتیں بڑھادیتے ہیں، جس کا اثر پورے ملک پر پڑتا ہے، یعنی امیر امیر تر ہورہے ہیں اور غریب غریب تر ہورہے ہیں، تو اس وقت حکومت کی مقرر کردہ نرخ درست ہے۔ اور حکومت کے ہر مباح قانون پر عمل واجب ہے، جو مفاد عامہ کی خاطر بنائے جاتے ہیں۔

''وأما لا يسعر لما روي أن السعر قد غلا بالمدينة فطلب من النبي عليه السلام أن يسعر فأبى وقال: «إن الله تعالى هو المسعر القابض الباسط الرازق»، وفي حديث الحر قال: «الله تعالى يخفض ويرفع وإني لأرجو أن ألقى الله تعالى وليس لأحد منكم عندي مظلمة»؛ ولأن الثمن حق البائع؛ لأنه يقابل ملكه، فيكون التقدير إليه إلا إذا أغلى فيه بأن يريد أن يبيع قفيزاً منه بمئة والناس يشترون منه بخمسين، فيمنع البائع عنه دفعاً للضرر عن الناس.''

(المحيط البرهانى)

''ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس إلا أن يتعدى أرباب الطعام تعدياً فاحشاً في القيمة فلا بأس بذلك بمشورة أهل الخبرة به.....''

(الاختيارلتعليل المختار:فصل فى الكسب ج1،ص 49)

''قوله (ولا ينبغي للسلطان أن يسعر على الناس) لما روي أن { السعر غلا في المدينة فقالوا يا رسول الله لو سعرت فقال إن الله تعالى هو المسعر القابض الباسط الرازق } ولأن الثمن حق العاقد فإليه تقديره فلا ينبغي للإمام أن يتعرض لحقه إلا إذا تعلق به دفع ضرر العامة وإذا وقع الضرر بأهل البلد واضطروا إلى الطعام ورفعوا أمرهم إلى القاضي أمر المحتكر أن يبيع ما فضل عن قوته وقوت أهله على اعتبار السعة في ذلك وينهاه عن الاحتكار فإن رفع إليه مرة أخرى حبسه وعزره على ما يرى زجرا له ودفعا للضرر عن الناس قال محمد أجبر المحتكرين على بيع ما احتكروا ولا أسعر وأقول لهم بيعوا كما يبيع الناس وبزيادة يتغابن في مثلها ولا أقول لهم بيعوا بأكثر منها وإذا خاف الإمام على أهل البلد الهلاك أخذ الطعام من المحتكرين وفرقه عليهم فإذا وجدوا سعة ردوا مثله وهذا ليس بحجر إنما هو للضرورة من اضطر إلى مال غيره وخاف الهلاك جاز له تناوله بغير رضاه.....''

(الجوهرالنيرة،لاينبغى للسلطان ان يسعر على الناسِ،ج 6ص177)

7 ...حکومت کا ذخیرہ اندوزوں پر چھاپہ اور مال کی نیلامی :

حکومت پہلے اطلاعی نوٹس جاری کریں کہ ذخیرہ اندوز بازار میں سامان فروخت کریں، بصورت دیگر تعزیری سزا دیدیں، لیکن اگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی، تو پھر مال ضبط کریں، البتہ اصل مالکان کی ضمان آدائیگی کے متعلق قدرے تفصیل ہے :

- اگر مالکان بخوشی مال چھوڑدے، تو حکومت کی ملک شمار ہوگی اور وہ اپنی مرضی سے تقسیم یا فروخت کرسکتی ہے اور فروخت ہونے کی صورت میں رقم بیت المال میں جمع کرے۔

- اگر مالکان قیمت وصول کریں ،تب بھی حکومت کی ملک ہوگی اور وہ اپنی مرضی کے مطابق تقسیم یافروخت کرے۔
- مالکان غائب ہیں ،اطلاع پانے کے باوجود بھی سراغ نہ مل سکا،تب بھی حکومت بوجہ لقطہ کے فروخت یا تقسیم کرے۔ اورملازمین کو بطورانعام بھی دے سکتی ہے۔فقہ حنفی کے مطابق والی یاحاکم لقطہ مال بوجہ ولایت عامہ کے غنی اور فقیر دونوں کو دے سکتاہے اور شوافع کے ہاں بغیر کسی قید کے غریب اورامیر دونوں لقطہ سے نفع اٹھاسکتے ہیں۔
- اوراگرمالکان موجود ہیں ،لیکن حکومت اجازت لیے بغیر ،یا قیمت دیے بغیر تقسیم ،یافروخت کریں ،تویہ صورت بوجہ ملکیت نہ ہونے کے درست نہیں ہے۔(جب کہ بعض مفتیان کرام نے بوجہ تعزیرمالی کے جواز کا فتوی دیا ہیں۔)

علامہ شامیؒ کی عبارت :

''ولیس للامام ان یخرج شیئا من یداحدالابحق ثابت معروف...''

(مطلب : القول لذی الید ان الارض ملکہ۔۔۔ج ۴،ص ۱۸۰ط : سعید)

حکومت ضبط کردہ مال کی مالک نہیں ہوتاہے۔

تفصیل کے لیے : **(فتاوی حقانیہ : ج٦،ص ٧٧ط : دارالعلوم حقانیہ)**

واضح رہے :

بسا اوقات حکومت سزا کے طورپر چھاپہ مارکاروائی کرتی ہے اور ضبط شدہ مال مالکان کی اجازت کے بغیر تقسیم یافروخت کرتی ہے اوروجہ سزابتاتی ہے تاکہ دوسرے بھی اس سے عبرت حاصل کریں اور یہ حکومت کے لیےاس لیے ضروری ہوکہ اگرمالکان کو عوض ملے وہ دوبارہ اس جرم کا ارتکاب کریں گے ،اس مصلحت کی وجہ سے علمانے حضرت امام ابویوسفؒ کے قول پر فتوی دیاہے ،کہ حکومت مال ضبط کریں اور مصلحت کی حدتک اپنے پاس رکھیں اورمالکان کے پھر بھی نہ سدھرنے سے لوگوں میں تقسیم کریں۔

زیر نظر سوال میں بڑھتی مہنگائی ،عوام پر بے جابوجھ ڈالنے ،چنداجارہ داروں کی وجہ سے مصنوعی غذائی قلّت اورحکومت کے بار بار تنبیہ کے باوجود بھی ذخیرہ اندوزوں کا مال منڈی اورمارکیٹ میں نہ لانے پر تعزیرمالی کے جواز کا حکم دیاجاسکتاہے۔

تعزیر مالی فقہا کی زبانی :

تعزیر مالی (مالی جرمانہ) کے متعلق حضرات فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں کافی تفصیلی بحث کی ہیں،ان تمام تفصیلات اور بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ حضرات طرفین کے نزدیک مالی جرمانہ سرے سے جائز نہیں ہے اور حضرت امام ابویوسفؒ کے نزدیک حاکم وقت کے لئے تعزیر مالی کو جاری کرنا جائز ودرست ہے۔اور ساتھ میں یہ بات واضح رہے کہ امام ابویوسفؒ کے نزدیک تعزیر مالی کا جواز مطلّقاً ہر جگہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ جہاں پر ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو مصلحت سمجھے گی وہاں پر جاری کرے گی۔اور فقہاء نے حضرات طرفین کے نزدیک عدم جواز کی جو بات نقل فرمائی ہے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تعزیر مالی شروع اسلام میں جائز

تھی بعد میں یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے، لیکن فقہ السنہ کے اندر منسوخ ہونے کی بات کی تردید کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مالی جرمانہ شروع اسلام میں جائز تھا بعد میں منسوخ ہوچکا ہے، ان لوگوں کے پاس منسوخ ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل کے ہے؛ اس لئے یہ حکم آج بھی بدستور باقی ہے؛ لہٰذا جہاں ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو جاری کرنا مصلحت سمجھے گی وہاں آج بھی تعزیر مالی (مالی جرمانہ) جاری کرنے کی گنجائش ہے۔

اور اگر وقتی طور پر کچھ مال ضبط کر کے رکھ لیں اور بعد میں جب وہ اپنے جرم سے تائب ہوجائے تو اسے واپس کردیں، تو ایسا کرنا سب کے نزدیک جائز ہے اور تائب نہ ہونے کی صورت میں امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق متاثر کے حوالہ کرنے کی گنجائش ہے۔ اب فقہاء کے جزئیات ملاحظہ فرمایئے:

''فقہ السنہ''

"ومن قال: إن العقوبة المالية منسوخة فقد غلط على مذاهب الأئمة نقلا واستدلالا، وليس يسهل دعوى نسخها والمدعوون للنسخ ليس معهم سنة، ولا إجماع يصح دعواهم۔ "

(فقه السنة ۲/ ۵۳۵)

"وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ الأموال جائز للإمام۔

(تبيين الحقائق قديم مكتبه إمداديه ملتان ۳/ ۲۰۸، جديد زكريا ۳/ ۶۳۴)

وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ المال جائز للإمام، وعندهما والشافعي ومالک وأحمد لا يجوز بأخذ المال، وما في الخلاصة: سمعت من ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي ذلک أو الوالي جاز، ومن جملة ذلک رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلک من المشايخ لقول أبي يوسف۔"

(حاشية چلپی على الزيلعي، قديم ۳/ ۲۰۸، جديد زكريا ۳/ ۶۳۴)

"الأصل في مذهب أبي حنيفة أن التعزير بأخذ المال غير جائز، فأبو حنيفةومحمد لا يجيزانه، بل إن محمدا لم يذكره في كتاب من كتبه، أماأبويوسف فقد روى عنه أن التعزير بأخذ المال من الجاني جائز إن رؤية فيه مصلحة۔"

(الموسوعة الفقهية الكويتية ۱۲/ ۲۷۰)

"يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلک من المشايخ كقول أبي يوسف، وقال التمرتاشي:يجوز التعزير الذي يجب حقا الله تعاليلكل أحد بعلة النيابة عن الله تعالى۔"

(فتح القدير، زكريا ۵/ ۳۳۰)

''درمختار مع الشامی'' میں اس کو ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، کافی تفصیل موجود ہے، اس میں سے تھوڑی سی عبارت اقتباس کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"لا بأخذ المال في المذهب (بحر) وفيه عن البزازية وقيل: يجوز ومعناه أن يمسكه مدة لينزجر ثم يعيده له، فإن أيس من توبته صرفه إلى مايرى، وفي المجتبى: أنه كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ، وتحته في الشامية: وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال وعندهماوباقى الأئمة لا يجوز۔"

(درمختار مع الشامي، زكريا ۶/۱۰۵۔۱۰۶، کراچی ۴/ ۶۱)

''بزازیہ'' میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

"والتعزير بأخذ المال إن المصلحة فيه جائزة قال مولانا خاتمة المجتهدين مولانا ركن الدين أبو يحيى الخوارزمي: معناه أن نأخذ ماله ونودعه، فإذا تاب نرده عليه كما عرف في خيول البغاة وسلاحهم، وصوبه الإمام ظهير الدين التمرتاشي الخوارزمي، قالوا: ومن جملته من لا يحضر الجماعة يجوزتعزيره بأخذ المال۔"

(البزازية على الهندية ۶/ ۴۲۷، زكريا جديد ۲۵۱/۳)

7...ذخیرہ اندوزی کی مدت:

ذخیرہ اندوزی کی مدت احادیث میں چالیس دن ہے، تاہم شراح کے مطابق یہ قید اتفاقی ہے، احترازی نہیں ہے، عموماً چالیس دن سے کم مدت میں اہل علاقہ غذائی قلّت کے شکار نہیں ہوتے ہیں، لیکن اگر چالیس دن سے کم مدت میں لوگ فقر وفاقہ، غذائی قلّت، ضروریات زندگی سے محروم ہوں اور مہنگائی کا خطرہ ہو، تو پھر بغیر کسی مقررہ مدت کے ذخیرہ اندوزی درست نہیں ہے۔

(من احتكر طعاما على أمتي أربعين يوما) قال الطيبي: لم يرد بأربعين التحديد بل مراده أن يجعل الاحتكار حرفة يقصد بها نفع نفسه وضر غيره بدليل قوله في الخبر المار يريد به الغلاء وأقل ما يتمون المرء في هذه الحرفة هذه المدة (وتصدق به لم يقبل منه) يعني لم يكن كفارة لإثم الاحتكار ، والقصد به المبالغة في الزجر فحسب

(فيض القدير،ج6،ص 46)

8... بھوسہ میں عشر:

بھوسہ میں عشر واجب نہیں ہے۔

واضح رہے:

دور حاضر میں بھوسہ باقاعدہ مقصود سمجھا جاتا ہے اور بسا اوقات اس کی قیمت گندم کی قیمت کے برابر ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی اس میں عشر واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ عشر کا تعلق قیمت سے نہیں ہے، بلکہ زمین سے حاصل شدہ پیداوار سے ہے۔ اور وہ بھی اس وقت جو ضمناً نہ ہو، جب کہ بھوسہ گندم کے ضمن میں حاصل ہوتا ہے۔ البتہ تجارت کے لیے بھوسہ رکھا ہو، تو سال گزرنے پر اس کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور اگر باغ ہی میں ایندھن کی لکڑیاں حاصل ہونے والے درخت اگائے جائے، یا بانس کے درخت اگائے جائے، تو پھر انہی درختوں پر عشر واجب ہوگا، جب کہ بھوسہ اس طرح نہیں ہے، کیونکہ اس کا باقاعدہ کاشت نہیں ہوتا ہے، وہ گندم کے ضمن میں حاصل ہوتا ہے۔

''ويجب العشر عندابى حنيفة رحمه الله فى كل ما تخرجه الارض من الحنطة والشعير۔۔۔''

(الفتاوى الهندية،ج١،ص ٢٠٤)

''واما قصب السكر وقصب الذرة ففيهما العشر ؛لانه يقصدبهما استغلال الارض بخلاف السعف والتبن ؛لان المقصود الحب والتمردونهما۔''

(الهداية،ج ١،ص ١٨٣،ط:اميرحمزه كتب خانه)
(كذا فى فتاوى حقانيه،باب العشر)

’’(الافیھما)لایقصدبہ استغلال الارض (نحو حطب وقصب)فارسی (وحشیش)وتبن وسعف وصمغ وقطران وخطمی واشنان وشجر قطن ۔

قولہ:الافیمالایقصد۔۔۔اشار الی ان مااقتصر علیہ المصنف کالکنزوغیره لیس المراد بہ ذاتہ بل لکونہ من جنس مالایقصد بہ استغلال الارض غالبا وان المدار علی القصد حتی لو قصد بہ ذلک وجب العشرکماصرح بعده۔‘‘

(کتاب الزکاۃ،باب العشر،ج۲،ص۳۲۷،ط: سعید)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- کمیشن ایجنٹ کی شرعی حیثیت
- کمیشن ایجنٹ کا دوطرفہ کمیشن وصول کرنا
- کمیشن ایجنٹ کا ضامن ہونا
- کمیشن ایجنٹ کے ضامن ہونے پر اجرت طلب کرنا
- کمیشن ایجنٹ کا کسی ایک شریک کے مال میں کمیشن معاف کرنا
- کمیشن ایجنٹ نے محنت کی، لیکن مال مالک نے خود فروخت کی

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

1۔۔۔باغات کی خرید وفروخت سے متعلق ایک مسئلہ درپیش ہے، جس کی صورت یہ ہے کہ ہمارے ہاں سے لوگ فصل بیچنے منڈی جاتے ہیں۔وہاں کوئی آدمی باغ کے مالک سے یہ ایگریمنٹ کرتا ہے کہ تمہارا مال منڈی میں منڈی میں فروخت کرنے اور اس سے پیسے لے کر تمہارے حوالہ کرنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، یہ آدمی باغ کے مالک سے کمیشن کے نام پر رقم لیتا ہے۔اسی طرح جس کو فروخت کرتا ہے اس سے بھی کمیشن لیتا ہے، پھر جب یہ آدمی مال فروخت کرتا ہے، کبھی وہ آدمی فرار ہو جاتا ہے اور آدائیگی نہیں کرتا۔اب پوچھنا یہ ہے :

- ازروئے شرع اس طرح کا معاملہ، جس میں ایک آدمی دوسرے کا مال تیسرے شخص کو فروخت کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے، درست ہے، یا نہیں ؟
- اس عمل پر وہ اجرت (کمیشن) بھی لیتا ہے، کیا اس کے لیے اس طرح کمیشن لینا درست ہے، یا نہیں ؟ نیز یہ اجرت دونوں پارٹیوں سے لیتا ہے۔کیا دونوں سے ایک ہی مال سے متعلق کمیشن لینا درست ہے، یا نہیں؟
- تیسرے شخص کے فرار ہونے کی صورت میں اس نے رقم آدا کرنے کی جو ذمہ داری لی ہے، کیا اس کو شرعاً ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے، یا نہیں؟

2۔۔۔زید اور بکر مشترکہ طور پر ایک باغ خرید لیتے ہیں، مال فروٹ ایجنٹ کے پاس لے جاتے ہیں، فروٹ ایجنٹ کے ہاں یہ اصول ہوتا ہے کہ دس فیصد مزدوری کاٹتے ہیں، یہاں زید فروٹ ایجنٹ کا واقف ہے وہ زید کی رعایت کرتے ہوئے پانچ فی صد کاٹتا ہے اور بقایا پانچ فیصد زید کی واقفیت کی وجہ اس کو واپس کرتا ہے، کیا اس پانچ فیصد میں بکر بھی کا حصہ ہوگا، یا نہیں؟

الجواب حامداو مصليا

کمیشن ایجنٹ کو فقہا کی اصطلاح میں اجرت دلال یا سمسار کہا جاتا ہے، اس کو بروکر اور پراپرٹی ڈیلر بھی کہا جاتا ہے۔

یاد رہے : یہاں چند چیزیں قابل غور ہیں : **<u>وکیل بالبیع :</u>** یہاں وکیل صرف بائع سے طے شدہ اجرت مثل، یا مقرر کیا ہوا کمیشن اور یا فیصدی کمیشن لینے کا حق رکھتا ہے۔**<u>وکیل بالشراء :</u>** اس صورت میں وکیل صرف خریدار کا نمائندہ ہے اور وہ خریدار سے کمیشن لینے کا حقدار ہے۔ تیسرا وہ شخص جو واسطہ بن کر بائع اور خریدار دونوں کے درمیان بھاگ دوڑ اور محنت کر کے کمیشن لیتا ہے، اس تیسرے شخص کے لیے دونوں طرف سے کمیشن لینا درست ہے۔

عقلی اعتبار سے خود دلال کی اجرت بھی درست نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک مجہول چیز پر اجرت لیتاہے، جس کا یہ علم نہیں ہے کہ وہ چیز کتنی رقم میں فروخت کرکے اپنی اجرت حاصل کرے گااورنہ یہ معلوم ہے، کہ کب فروخت کرے گا۔البتہ استحسانا عرف کی بناپر فقہانے جوازکا حکم دیاہے۔لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ ہر چیز پر عرف میں رائج ہوجانے سے جواز کا حکم لگایاجائے، بلکہ عرف پر فتوی دینے کے لیے چند شرائط ہیں :

شرائط عرف :

عرف شریعت کے کسی بھی حکم کا مخالف نہ ہو۔

عرف یاتوکلی طورپر جاری ہو، یاکم سے کم غالب ہو۔

عرف مستقل ہو، عارضی نہ ہو۔

عاقدین دوران عقد عرف کے خلاف وضاحت نہ کرے۔

طبیعت سلیمہ اس کو قبول کرتی ہو۔

"الشروط التي يجب توفرها في العرف الذي يحتجُّ بهاشترط علماؤنا في العرف الذي يعتبر شرعًا عدَّة شروط:الأول: أن لا يخالف العرف الشريعة ، فإن خالف العرف نصًّا شرعيًّا أو قاعدة من قواعد الشريعة فإنَّه عرف باطل.الثاني: أن يكون العرف مطّردًا أو غالبًا ، ومعنى اطراده أن يكون العمل بالعرف مستمرًا في جميع الحوادث ، لا يتخلف في واحدة منها ، أو يكون غالبًا في أكثر الحوادث.ولذا قالوا في البيع: لو باع بدراهم أو دنانير وكانا في بلد اختلفت فيه النقود مع الاختلاف في المالية والرواج انصرف البيع إلى الأغلب. قال في الهداية: "لأنَّه هو المتعارف ، فينصرف المطلق إليه".قالوا: لأنَّ المعروف كالمشروط"

(مجلة مجمع فقہ الاسلامی:العرف بين الفقہ:ج۲ص۱۱۱۳۶)

ظاہر الروایۃ اور عرف :

یہ ضروری نہیں ہے، کہ ظاہر الروایہ کی ترجیح عرف پر ہوگی، بلکہ مفتی یا قاضی کے لیے ضروری ہے، کہ عرف کو مد نظر رکھ کر فتویٰ یا فیصلہ صادر کرے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ رقمطراز ہے :

''قال رحمه الله تعالى: "قال في القنية": ليس للمفتي ولا للقاضي أن يحكما على ظاهرالمذهب ويتركا العرف ، ونقل المسألة عنه في "خزانة الروايات" كما ذكره البيرمي في "شرح الأشباه"------.وقال: "ليس للمفتي الجمود على المنقول في كتب ظاهر الرواية من غير مراعاة الزمان وأهله ، وألاّ يُضيِّع حقوقًا كثيرة ، ويكون

ضرره أعظم من نفعه .وقال: "النقول ونحوها دالّة على اعتبار العرف الخاص ، وإن خالف المنصوص عليه في كتب المذهب ما لم يخالف النصَّ الشرعيَّ" .وقال: "العرف يَثْبُتُ على أهله عامًّا أو خاصا،فالعرف العامُّ في سائر البلاد يَثْبُتُ حكمه على أهل سائر البلاد ، والخاصُّ في بلدة واحدة يَثْبُتُ حكمه على تلك البلدة فقط"وقال أيضًا: "المفتي لا بدَّ له من ضرب اجتهاد ومعرفة بأحوال الناس".وقال: "من لم يكن عالمًا بأهل زمانه فهو جاهل" .وقال: "اعلم أن المتأخرين الذين خالفوا المنصوص في كتب المذهب في المسائل السابقة لم يخالفون إلاَّ لتغيّر الزمان والعرف ، وعلمهم أن صاحب المذهب لو كان في زمنهم لقال بما قالوه"ونقل عن بعض علماء الحنفية قوله: من لم يكن عالمًا بأهل زمانه فهو جاهل"

کمیشن ایجنٹ (دلال) کے جواز کا حکم بھی فقہا کرام نے عرف میں مشہور ہونے اور لوگوں کی ضرورت کی بنا پر دیا ہے۔اس کے لیے متعین اجرت یا فیصدی حصہ دونوں طرح مقرر کرنا درست ہے۔اور چاہے وہ ایک طرف سے کمیشن لینا طے کرے اور یا دونوں طرف سے اجرت لینا طے کرے۔

قال فی التتارخانیۃ:

''وفی الدلال والسمساریجب اجر المثل،وماتواضعوا علیہ ان فی کل عشرۃ دنانیر کذا،فذک حرام علیھم ،وفی الحاوی :سئل محمدبن سلمۃ عن اجرۃ السمسار ،فقال:ارجوانہ لاباس بہ ،وان کان فی الاصل فاسدا؛لکثرۃ التعامل ،وکثیرمن ھذا غیرجائز،فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ کدخول الحمام وعنہ قال:رایت ابن شجاع یقاطع نساجا ینسج لہ ثیابا فی سنۃ۔''

(ردالمحتار:ج۶،ص ۶۳،ط:سعید)

قال فی البزازیۃ:

''السمسار والمنادی والحمامی والصکاک ،ومالایقدرفیہ الوقت ولاالعمل تجوزلماکان لناس بہ حاجۃ ویطیب الاجر الماخوذ لوقدراجرالمثل۔''

(الشامیۃ:باب اجارۃ الفاسدۃ:47/6،ط:دارالفکر،بیروت)

یاد رہے:

جو اجرت وکیل یا کمیشن ایجنٹ کے لیے مقرر کی جائے، وہی اس کو ملے گی، اگر وہ طے شدہ قیمت سے زائد میں چیز بیچ دے، تب بھی زائد رقم اصل مالک کو ملے گی۔اسی طرح بروکر پر ایک معاہدہ کے تحت ضمان کی شرط لگانا بوجہ عرف درست ہے۔

''لواعطی احدمالہ لدلال ،وقال :بعہ بکذادراھم فان باعہ الدلال بازیدمن ذلک فالفضل ایضا لصاحب المال،ولیس للدلال سوی الاجرۃ۔''

(مجلۃ الاحکام العدلیۃ: 107/1)

(کتاب النوازل: 358/12، بائع اور مشتری دونوں سے کمیشن لینا)

(دلالی اور کمیشن کے مسائل: مذکورہ بالاماخذ)

''سئل محمدبن سلمۃ عن اجرۃ السمسار،فقال:ارجو انہ لاباس بہ ،وان کان فی الاصل فاسدا؛لکثرۃ التعامل۔۔۔۔فجوزوہ لحاجۃ الناس الیہ۔''

(ردالمحتار،کتاب الاجارہ،مطلب:فی اجرۃ الدلال)

''الحاصل:ان الجہالۃ الیسیرۃ عفو فی ماجری بہ التعامل ؛لکونہالاتقضی الی النزاع عادۃ''

(اعلاالسنن،باب اجرۃ السمسرۃ،ج ۱۶،ص ۲۰۲)

''اجرۃ السمسار۔۔۔مما لاتقدیرفیہ للوقت ولامقدارلمااستحق بالعقد،وللناس فیہ حاجۃ،فکانت جائزۃ وان کان فی الاصل فاسدا؛لحاجۃ الناس الی ذلک۔''

(الفتاوی الولوجیۃ)

کمیشن ایجنٹ پر ضمان کی شرط لگانا:

کمیشن ایجنٹ کسی کے مال کی ضمانت لے سکتاہے۔

''قولہ:لانہ یصیر عاملالنفسہ؛اذلاولایۃ القبض لہ والضامن یعمل لغیرہ۔۔۔فلوان وکیل البیع ضمن الثمن لموکلہ وادی یرجع،ولوادی بلاضمان لایرجع کمافی الفصولین وقدمر۔''

(الشامیہ)

'' (قولہ:فیمالووکل بیعہ)الاولی ان یقول :ای ثمن ماوکل بیعہ،قیدبہ ؛لان الوکیل بقبض الثمن لوکفل بہ یصح۔''

(مطلب :فی تعلیق الکفالۃ)

لہٰذا:

- ازروئے شرع اس طرح کا معاملہ، جس میں ایک آدمی دوسرے کا مال تیسرے شخص کوفروخت کرنے کی ذمہ داری لینادرست ہے۔
    - اس عمل پر اس کا اجرت (کمیشن) لینا بھی درست ہے۔
    - اسی طرح کمیشن ایجنٹ کا اجرت دونوں پارٹیوں سے لینا بھی درست ہے۔
- تیسرے شخص کے فرار ہونے کی صورت میں اس کا رقم آدا کرنے کی ذمہ داری لینا بھی درست ہے۔

کمیشن ایجنٹ کا پہچان کی بناپرایک شریک سے پانچ فیصد کم لینا:

دوشریکوں کافروٹ یاسبزی میں شرکت عنان ہے،جس میں ہرایک شریک دوسرے کے لیے شریک ہونے کے ساتھ وکیل بھی ہے۔اوروکیل اپنے موکل کے حصہ میں امانت دارہوتاہے۔اس لیے اگرکمیشن ایجنٹ نے مشترکہ مال میں سے ایک شریک کو معرفت کی بناپرپانچ فیصد معاف کیا،تویہ معافی دونوں کے حق میں شمارہوگی۔

''وان اشتری احدهما بماله،وهلک مال الاخرفالمشتری بینهما)یعنی علی ماشرطا؛لان الملک حین وقع،وقع مشترکا بینهما؛لقیام الشرکۃ وقت الشراء،فلایعتبر الحکم بهلاک مال الاخر بعدذلک،بخلاف مابعدالخلط حیث یهلک علی الشرکۃ؛لانہ لایتمیز،فیجعل الهلاک من المالین۔''

(البحرالرائق،کتاب الشرکۃ:295/5ط:رشیدیہ)

'' (ومایشتریہ کل یقع مشترکا الاطعام اهلہ وکسوتهم)؛لان مقتضی عقد المساواۃ،وکل واحدمنهما قائم مقام صاحبہ فی التصرف،فکان شراء احدهماکشرائهماالامااستثناه فی الکتاب۔''

(مذکوره بالاماخذ:285/5)

مذکورہ بالاعبارات سے واضح ہوتاہے،کہ ایک شریک کے مال میں نقصان یاہلاک ہونے میں دوسراشریک بھی شامل ہوگا،اسی بناءپر نفع میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں گے۔

''وان حط البائع عن الوکیل بعض الثمن فانہ یحطہ عن الموکل۔۔۔ولووهب البائع بعض الثمن عن الوکیل یظہر ذلک فی حق الموکل حتی لم یکن للوکیل ان یرجع علی الموکل بذلک القدر۔''

(الهندیۃ،کتاب الوکالۃ،قبیل الباب الثالث فی الوکالۃ بالبیع:588/3)

''المال الذی قبضہ الوکیل والرسول من جہۃ الوکالۃ ومن جہۃ الرسالۃ امانۃ فی یدهما۔''

(دررالحکام شرح مجلۃ الحکام:الباب الاول فی بیان بعض الاحکام العمومیۃالمتعلقۃ بالامانات:مادۃ:768)

المال الذی قبضہ الوکیل بالبیع والشراوایفا الدین واستیفائہ،وقبض العین من جہۃ الوکالۃ فی حکم الودیعۃ فی یده۔''

(دررالحکام۔۔۔المادۃ:1463)

دیگرمسائل:

کفیل کااجرت طلب کرنا:

اگرکفیل (ضامن) نے کسی کی ضمانت پراجرت مانگی،توبوجہ ضرورت کفیل کواجرت دیاجاسکتاہے۔

''ان شرط الکفیل تقدیم مقابل،اواجرعلی کفالۃ،وتعذرعلی المکفول عنہ تحقیق مصلحۃ۔۔۔۔

جاز دفع الاجر؛للضرورة۔۔‘‘

(الفقہ الاسلامی وأدلتہ:ج۶،ص۴۱۷۸ط:دارالفکر)

کسی کے ضامن بننے پر اجرت لینا۔تفصیل کے لیے دیکھیے :

(فتاوی قاسمیۃ:455/24)

ایجنٹ نے محنت کی، لیکن مالک نے فروخت کی :

اس صورت میں عرف پر عمل ہوگا۔

’’واماالدلال فان باع العین بنفسہ باذن ربھا،فاجرتہ علی البائع،وان سعی بینھما وباع المالک بنفسہ ،یعتبر العرف ۔۔‘‘

(الدرالمختار:کتاب البیوع،مطلب ،فی حبس المبیع لقبض الثمن)

’’وفی الشامیۃ:تحت قولہ:یعتبرالعرف:فتجب الدلالۃ علی البائع اوالمشتری اوعلیھما بحسب العرف۔‘‘

(مذکورہ بالاماخذ)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی ۔

- ❖ جمہوری نظام شریعت کی زبان میں
- ❖ ووٹ شہادت وکالت اور سفارش ہے
- ❖ کیاانتخاب خلیفہ اجتہادی مسئلہ ہے؟
- ❖ خلیفہ اور امام میں فرق
- ❖ کیاامارت اسلامی صرف خلافت پر مبنی ہے؟
- ❖ خلیفہ کے لیے قریشی ہونے کی شرط
- ❖ جمہوریت کی جامع تعریف نہیں ہے
- ❖ جمہوری اصطلاحات سابقہ ادوار میں
- ❖ پاکستان کا دستور شریعت کی نگاہ میں
- ❖ کیادستور کے شرعی ہونے سے ملک دارالاسلام بنتاہے
- ❖ کیاشریعت میں اسلامی دستور کا نفاذ لازمی ہے؟
- ❖ امیدوار میں بہتر شخصیت کااعتبار ہے' یا پارٹی منشور؟
- ❖ موجودہ سیاسی حالات میں ازروئے شرع ووٹ کاسٹ کرنا

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

1---پاکستان کے جمہوری نظام کو اسلامی نظام کہنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

2---ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے؟کچھ علمائے کرام کا کہنا ہے: کہ ووٹ نہ گواہی ہے اور نہ ہی امانت ہے 'کیونکہ گواہ کے لیے لازمی ہے 'کہ کوئی مدعی آپ کو گواہ بنائے 'یا کوئی آپ کے پاس امانت رکھنے کا کہے 'تب گواہی اور امانت ثابت ہوں گی 'ورنہ نہیں

3---ان کا مزید کہنا ہے 'کہ شریعت میں گواہ کے لیے عادل اور نیک ہونا ضروری ہے 'جب کہ یہاں عادل 'ظالم 'نیک اور فاسق سب برابر ہیں؟

4---شریعت میں ایک مرد دو خواتین کے برابر ہے 'جب کہ یہاں مرد و زن میں کوئی فرق نہیں ہے؟

5---پاکستان کے آئین میں اللہ تعالیٰ کو حاکم مطلق مانا گیا ہے 'جب کہ اسلامی دفعات کو نافذ کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی تین تہائی 'یا سادہ اکثریت کا اتفاق ضروری ہے؟کیا اس کا مطلب یہ نہ ہوا: کہ پارلیمنٹرین (رکن اسمبلی) کو بالادستی کا اختیار دیا گیا ہے؟

6---ممبر (MNA...MPA) کے انتخاب میں کس چیز کو مدنظر رکھا جائے 'اس کی دیانت 'خدمت اور عدالت ؟اوریا پارٹی منشور کو مدنظر رکھا جائے 'کیونکہ بسا اوقات پارٹی کا منشور درست ہوتا ہے 'لیکن امیدوار پر کرپشن کا الزام نمایاں ہوتا ہے؟

7---مذہبی پارٹی کو جیتنے کے لیے جعلی ووٹ استعمال کرنا کیسا ہے؟ورنہ قوم پرست اور سیکولر پارٹی کے امیدواران مذہب کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں؟

8.---کچھ لوگوں کا کہنا ہے: کہ بلدیاتی انتخابات (LOCAL ELECTION) میں پارٹی منشور دیکھنا ضروری نہیں ہے 'کیونکہ چیئرمین 'یا کونسلر صرف اپنے حلقہ تک محدود ہوتے ہیں۔لہٰذا یہاں قوم پرست اور سیکولر پارٹی کے ممبر کو ووٹ دینا بہتر ہے جب ان کی خدمت اور رفاہی کام ایک عالم دین سے نمایاں ہو۔ان کا کہنا کیسا ہے؟

9--- موجودہ سیاسی صورت حال میں ووٹ استعمال کرنا ازروئے شرع کیسا ہے؟

الجواب حامداومصليا

اس میں کوئی شک نہیں ہے ،کہ سیاست دین اسلام کا حصہ ہے دین اور سیاست آپس میں جزلاینفک ہیں ،جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی چنگیزی ۔۔۔قرآن کریم اس پر گویاں ہے : کہ سیدنا حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی حکومت طلب کرنے کی دعافرمائی ہے

(قال رب اغفرلی وھب لی ملکا لاینبغی لاحد من بعدی انک انت الوھاب۔)

(سورہ ص : آیت : ۳۵)

جب سیدنا حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو ملک مصر نے اپنے مشیر خاص بننے کا کہا،توآپؑ نے فرمایا :

(اجعلنی علیٰ خزائن الارض انی حفیظ علیم ۔)

(سورہ یوسف : ص۵۵)

مجھے وزارت خزانہ مقرر کرے ،میں یقینا نگہبان اور علم رکھنے والا ہوں۔

یہاں سیاسی نکتہ یہ ہے ،کہ آپؑ نے مشیر بننے کے بجائے خزانہ کو ترجیح دی ،کیونکہ وزارت مال میں عوام الناس کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے اور انہیں اپنے اخلاق نبوی سے آراستہ وپیوستہ کرنا ہے ،جب کہ مشیر بننے کی صورت میں وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا تھا،بلکہ اس کے برعکس لوگ بادشاہ سے ناراض ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے مشیر کو بھی موردالزام ٹھہراتے ہیں۔

اور دوسرا یہ ہے کہ آپؑ نے کلیدی عہدہ کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا ،جس کو منصب کے اختیار کرنے کے لیے حجت قویہ کے طور پر پیش کیا جاسکتی ہے۔

مسلم ممالک میں نظام کے متعلق مختلف طبقات :

- مسلم ممالک میں کچھ ایسے مسلمان ہوتے ہیں جو مسلمان ہونے کے ناطے اسلام کا نام ضرور لیتے ہیں ،مگر اسلامی نظام سیاست وقضا تحکیم کا تصوران کے ذہنوں میں نہیں ہوتا ہے ،بلکہ وہ اسلامی سیاست کو اپنے گمان کے مطابق ترقی یافتہ دور میں روکاوٹ سمجھتے ہیں۔
- کچھ ایسے مسلمانوں کا طبقہ ہے ،جو اسلامی نظام سیاست وریاست کا تصور ذہن میں رکھتے ہیں ،البتہ ان کو اہم نہیں سمجھتے ہیں ،بلکہ ان کا دائر اسلام ایک مخصوص حد پر گردش کررہا ہے وہ زیادہ تر عبادات اور اخلاقیات ہی قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔

- ایک طبقہ ایسا بھی ہے 'جواسلامی نظام کا نفاذ سابقہ طرز وطور سے سمجھتے ہیں 'حالات کے بدلنے اور جدید آلات سے استفادہ کو غیر ضروری سمجھتے ہیں اور جدید سیاسی اور معاشی نظریات وافکار کو مسترد کرتے ہوئے نفاذ عمل کو اب سے صدیوں قبل کے ڈھانچے اور اسٹرکچر کے ساتھ دوبارہ مسلم معاشرے میں لانا ضروری سمجھتے ہیں۔
- ایک طبقہ ایسا ہے 'جو نفاذ اسلام میں شمشیر وسنان کو بھی ضروری سمجھتے ہیں اور ان کی راہ میں ہر روکاوٹ کو دعوت کے بعد مزاحمت سے ہٹاتے ہیں

مملکت خداداد پاکستان میں بنیادی نظریات: The basic theories in Pakistan

پاکستان میں بنیادی طور دو نظریے پائے جاتے ہیں 'سیکولر نظریہ ۔۔۔۔مذہبی نظریہ۔

سیکولر نظریہ: Scholar theory

سیکولر نظریہ والوں کا کہنا ہے 'کہ پاکستان آزاد اسٹیٹ ہونا چاہیے 'یہاں ہر ایک کو مکمل طور آزادی ہونی چاہیے اور مذہب انسان کا ذاتی مسئلہ ہے 'اس کا اثر اسٹیٹ اور ریاست پر نہیں ہونا چاہیے۔

یہ لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور یہ قائد محمد اعظم علی جناح کے وژن کے خلاف بھی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ ان کا اثر اور غلبہ زیادہ ہے۔

اسلامی نظریہ یا اسلامائزیشن: Isalmic theory

دینی طبقہ کے دیندار مسلمان مملکت پاکستان میں اسلام اور نظام اسلام کے نفاذ کے خواہاں ہیں۔البتہ ان کے طرز استدلال 'طریقہ نفاذ اور مذہب کی راہ میں روکاوٹ ڈالنے والوں کا دفاع اور حکمرانوں کے غیر شرعی فیصلوں کی صورت میں مزاحمت اور خروج میں بہت زیادہ فرق ہے۔یہ الگ بات ہے 'کہ ہر ایک اپنے بساط کے مطابق اسلام نظام کے نفاذ کو ضروری سمجھتے ہیں 'انہی کاوشوں اور تگ ودو میں زندگی گزارتے ہیں ۔نہ ان کی نیک نیتی پر بغیر کسی ثبوت شرعی شک وشبہ جائز ہے اور نہ ہی ان کے خلاف فتوی جھاڑنے کی گنجائش ہے۔ہر ایک نے اپنا مشن اور طرز استدلال کا جواب بارگاہ لم یزل کی عدالت میں دینا ہیں کہ وہ کتنے سچے تھے اور اخلاص 'للّٰہیت 'عشق الٰہی اور محبت رسول مقبول ﷺ میں کتنے کھرے تھے 'ہر تحریک وتنظیم اور جماعت کے قائدین اور پیروکار اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہ ہوں گے ۔بعض اوقات غلط فہمی میں 'یا کسی ایک تحریک سے محبت اور وابستگی کی بنیاد پر 'یا اس تحریک کے مشن (Mission) اور (view point) معلوم نہ ہونے پر اور یا ڈر اور خوف کی وجہ سے غلط فتویٰ اور حکم لگانے سے انسان آنجانے میں ایک عظیم بہتان اور گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوجاتا ہے۔

راقم الحروف ہر طبقہ کا مختصر طرز استدلال ذکر کرے گا :

طبقہ اول :

جمہوریت ایک سراب ہے 'اس کا شریعت میں نہ ثبوت ہے اور نہ ہی جمہوری نظام میں اسلام کے نفاذ کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔

جمہوریت (Democracy) اسلام میں نہیں ہے :

- جمہوریت میں حاکم اعلیٰ اور قانون ساز عوام ہوتے ہیں۔
- اسلام میں نظام مملکت خلافت ہے 'جمہوریت نہیں ہے۔
- جمہوریت میں کثرت رائے پر عمل ہوتا ہے 'جب کہ اسلام میں حق پر فیصلہ ہوتا ہے۔
- جمہوریت میں اکثریت کی صورت میں فیصلہ صادر کرنے پر وزیراعظم یا صدر مملکت مجبور محض ہوتے ہیں 'جب کہ اسلام میں خلیفہ کو ہر قسم فیصلہ صادر کرنے کا اختیار ہے۔

ان کے نزدیک سے جمہوریت مسئلہ کا حل ہی نہیں ہے اور خاص کر جب ملک پر براجماں طبقہ دین سے دور ہو 'تو پھر نظام کے بدلنے کی ہر ممکن شرعی کوشش لازمی ہے۔

شہادت اور ووٹ کا تقابلی جائزہ :

- ✓ گواہی کے لیے گواہ کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ ووٹ کے لیے نہیں۔
- ✓ مجنون گواہی نہیں دے سکتا ہے 'جب کہ مجنون شناختی کارڈ رکھنے کی صورت میں ووٹ ڈال سکتا ہے۔
- ✓ گواہ کا بینا ہونا ضروری ہے 'ووٹ کے لیے ضروری نہیں ہے۔
- ✓ گواہ گونگا نہیں بن سکتا ہے 'جب ووٹ استعمال کر سکتا ہے۔
- ✓ گواہ کے لیے عادل ضروری ہے 'جب کہ ووٹ فاسق بھی دے سکتا ہے۔
- ✓ باپ بیٹے کے لیے گواہ نہیں بن سکتا ہے 'جب کہ ووٹ دے سکتا ہے۔
- ✓ بیوی شوہر کے حق میں اور شوہر بیوی کے حق میں گواہ نہیں بن سکتا ہے 'جب کہ ووٹ دے سکتا ہے۔
- ✓ گواہی کے لیے دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں ضروری ہیں 'جب کہ ووٹ کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔

- ✓ گواہی میں نیابت جائز ہے 'جب کہ ووٹ میں درست نہیں ہے۔
- ✓ گواہی میں خصم کی حاضری ضروری ہے 'جب ووٹ میں ضروری نہیں ہے۔

مذکورہ بالاوجوہات کی بنیادپر معلوم ہوا 'کہ ووٹ اور شہادت میں بہت بڑافرق ہے۔

اسی طرح ووٹ وکالت بھی نہیں ہے۔کیونکہ :

- ✓ وکالت کے لیے باقاعدہ ایجاب اور قبول شرط ہیں 'کہ موکل کسی کو وکیل مقرر کرے اور وکیل اس کو قبول بھی کرے۔
- ✓ وکیل کے مرنے سے وکالت ختم ہوجاتی ہے 'جب کہ ووٹ کاسٹ کرنے کے بعد بعض اوقات ووٹر مر بھی جاتاہے مگرامیدوار کی وزارت.برقرار رہتی ہے۔
- ✓ وکیل کے مرتد (العیاذ باللہ) ہونے سے وکالت ختم ہوجاتی ہے 'جب کہ ووٹر کے ارتداد سے امیدوار کی سیٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتاہے۔

ووٹ وکالت نہیں ہے :

وکالت کے لیے ایجاب وقبول رکن ہیں۔

''امابیان رکن التوکیل:فھوالایجاب والقبول،فالایجاب من المؤکل ان یقول :وکلتک بکذا اوافعل کذا،او اذنت لک ان تفعل کذا ،ونحوہ ۔والقول من التوکیل ان یقول:قبلت ،ومایجری مجراہ ۔فمالم یوجد الایجاب والقبول لایتم العقد۔''

(بدائع الصنائع :)

''وتبطل الوکالۃ بموت الوکیل۔''

(ملتقی الابحر : باب عزل الوکیل)

''للمؤکل عزل وکیلہ۔''

(ملتقی الابحر : باب عزل الوکیل)

مذکورہ بالاوجوہات کی بنیادپر ووٹ پر وکالت کا حکم لگانا درست نہیں ہے۔

اسی طرح امیدوار کا انتخاب بھی مروجہ جمہوری طریقہ سے درست نہیں ہے' کیونکہ :

امیر کا انتخاب :

امیر کا انتخاب کرنے والے کے لیے تین شرطیں ہیں (۱) عادل ہو۔ (۲) اس کے پاس ایسا علم ہو' جس کے ذریعے یہ پہچان سکے 'کہ کون امیر بننے کا اہل ہے۔ (۳) رائے اور حکمت کے ذریعے ایسے شخص کا انتخاب کرے' جو فائدہ پہنچانے والا ہو اور مصلحت شناس ہو۔

''اما اهل الاختيار فيعتبر فيهم ثلاث شروط:احدها العدالة،والثانی :العلم الذی تيوصل به الی معرفة من يستحق الامامة ،والثالث:ان يكون من اهل الرای والتدبير المؤديين الی اختيارمن هوللامامة اصلح۔''

(الاحکام السلطانیۃ : ص ۱۹' ط : دار الکتب العلمیہ ۹' بحوالہ : ووٹ کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ : ص ۵۰)

اسی طرح زیر اقتدار طبقہ جب شریعت کے خلاف کوئی حکم صادر کرے' یا خود گناہ اور فسق کا مرتکب ہو جائے' تو ان کو سنوارنے کا کیا طریقہ ہے اور نہ سدھرنے پر حکومت کے خلاف بغاوت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

کیا حکومت کے خلاف بغاوت واجب ' جائز اور یا حرام ہے؟

- اگر حکمران کفر اور ارتداد کا ارتکاب کرے ' یا اسلامی شعار کا نفاذ غیر ضروری قرار دے اور یا اس کی تبدیلی کی کوشش کرے ' تو پھر اس کو معزول کرنا واجب ہے اگرچہ بغاوت خروج کی صورت پیش آئیں۔
- اگر حکمران ظلم اور عوام کے ساتھ جابرانہ اور تشدد کی پالیسی اپنائے ' تو وہاں کے مظلوم عوام کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہے 'کہ وہ ہر ممکن کوشش سے اپنے اوپر ظلم کا خاتمہ کریں اور حکومت کا اس ظالمانہ رویہ ملیا میٹ کریں۔اور اس صورت میں دیگر مسلمانوں کے لیے حکمران طبقہ کی مدد ناجائز ہے 'کیونکہ ظالم کو طاقتور بنانا شریعت میں کسی طرح درست نہیں ہے 'بلکہ اس کے برعکس انہیں مظلوم کا ساتھ دینا چاہیے۔
- اگر حاکم فسق اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے' تو ان کے خلاف مسلح جدوجہد جائز نہیں ہے۔
- اور اگر حاکم دیندار ہو' احکام اسلام نافذ کرتا ہو' تو ان کے خلاف بغاوت اور خروج حرام ہے۔

حکومت سے خروج اور بغاوت کی صورتیں حضرت تھانویؒ کی زبانی:

حکومت کے خلاف خروج:

- حکمران کا فسق اس کی ذات تک محدود ہو۔مثلا: شراب نوشی وغیرہ۔

حکم: اگر فتنہ کے بغیراس کا جدا کردینا ممکن ہو،جدا کردیا جائے اور اگر فتنے کا اندیشہ ہو صبر کیا جائے۔

- اگر فسق دوسروں تک متعدی ہو لیکن اس میں جواز کا اشتباہ بھی ہو۔ جیسے : ریاست کے نام پر ٹیکس وغیرہ وصول کرنا۔

حکم: اطاعت واجب ہے ،خروج جائز نہیں ہے۔

- ایسا مالی ظلم کرے ،جو صریح ظلم ہو۔

حکم : اپنے اوپر ظلم کا دفع کرنا اگرچہ قتال کی نوبت آجائے ،جائز ہے ،البتہ صبر غالبا اولیٰ ہے۔

- لوگوں کو معصیت پر مجبور کرے ،مگر منشا دین کا استخفاف ،یا کفر ومعصیت کی پسندیدگی نہ ہو۔

حکم : اکراہ کے احکام جاری ہوں گے ،لیکن خروج جائز نہیں ہے۔

- لوگوں کو معصیت پر مجبور کرے اور اس کا منشا دین کا استخفاف اور توہین ہو۔

حکم : بشرط قدرت جدا کردینا علی الاطلاق واجب ہے۔

نوٹ : یہ احسن الفتاوی کی تحریر کا خلاصہ ہے ،جس میں حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے جزل الکلام فی عزل الامام کا خلاصہ بحث لکھا ہے۔

تفصیل کے لیے : (احسن الفتاوی : ج٦،ص ١٣٩،ط : ایچ ایم سعید)

حکومت کے غیر شرعی قوانین اور اقدامات کے خلاف چارہ کار :

اگرحکومت کے غیر اسلامی اقدامات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں جہاں حکومت کے خلاف خروج (مسلح بغاوت) جائز ہو جائے ،وہاں خروج کے احکام جاری ہوں گے۔

(احسن الفتاوی : ج٦،ص ١٣٥،ط : ایچ ایم سعید)

دارالاسلام اوردارالحرب کی تعریف :

دارالاسلام : جس ملک میں عملااحکام اسلام کا نفاذ ہو وہ دارالاسلام ہے۔

دارالمسلمین : جس ملک میں احکام اسلام کا نفاذ نہ ہو، مگر تنفیذاحکام پر قدرت ہو وہ دارالمسلمین ہے ،اس حکومت کو حکومت اسلامیہ نہیں کہاجاسکتاہے۔

دارالامن : جہاں احکام اسلام کی تنفیذ پر قدرت نہ ہواور مسلمانوں کی جان ،مال اور عزت محفوظ ہواور عبادت محضہ پر کوئی پابندی نہ ہو،تو یہ دارالامن ہے۔

دارالحرب : جہاں احکام اسلام کی تنفیذ پر قدرت نہ ہو وہ دارالحرب ہے۔

(تفصیل کے لیے احسن الفتاوی : ج ٦ ،کتاب الجہاد)

یہ اس طبقہ کی دلائل ہیں ،جن کا کہناہے ،کہ جمہوریت اسلام سے متصادم ہے ، یہ نظام محض انسانی آزادی ، مردوزن مساوات اورسرمایہ کاری کو تحفظ دینے کے لیے روبہ عمل لایا گیاہے۔

طبقہ دوم :

ان کا کہناہے : کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط اورانقلاب فرانس کے بعد دنیاپر جمہوریت کا غلبہ ہوگیااور تقریبا بہت سارے اسلامی ممالک میں جمہوریت کا راج ہے ،لہٰذا جمہوری اصطلاحات کو مد نظر رکھ کراسلام نافذالعمل ہونا چاہیے ،انہی اصطلاحات کو شریعت کا لبادہ پہنانا چاہیے ۔ان کو الفقہ الواقع کانام بھی دیا جاتاہے۔کہ موجودہ حالات اوراصطلاحات کے اندراسلامی دستور اورآئین کا نفاذ ہونا چاہیے اوراگرکسی ملک کاآئین ودستوراسلامی دفعات پر مشتمل ہو،اگرچہ کسی جگہ اسلام کی سابقہ اصطلاحات موافق نہ آتی ہوں ، وہ اسلامی ریاست اوردارالاسلام ہے ،ان کے خلاف ہونا بغاوت اورخروج کے زمرے میں آتاہے۔دستوراورآئین کو دیکھ کر فتوی دینا چاہیے۔

لہٰذا مملکت خداداد پاکستان کاآئین اوردستور اسلامی ہے ، یہ دارالاسلام ہے۔ترقی یافتہ ممالک کی طرح یہاں بھی جمہوری نظام رائج ہونا چاہیے ۔اور اگر کبھی حکمران نے شریعت کے خلاف آرڈر جاری کیا ،تب بھی اصلاح سے کام لینا چاہیے اور بصورت دیگر صبر کادامن تھامنا چاہیے ۔ریاست کے خلاف قدم اٹھانا نہ صرف ناجائز ہے ،بلکہ خروج اور بغاوت بھی ہے۔اگرچہ وہ مسلح جدوجہد شریعت اوراسلام کے دائرہ کے اندر کیوں نہ ہو۔اوراگر سیکولر طبقہ کی حکومت آئی اورانہوں نے اسلامی دفعات کا نفاذ روک دیا

'تب بھی ریاست اوراسٹیٹ اسلامی دستور اور شرعی آئین کی بناپر دارالاسلام ہوگی۔ لہٰذا اسلامی جمہوری نظام میں حکمران اگر ناجائز فیصلہ صادر کرے 'تو آئین کے اندر ان کے خلاف جمہوری حق استعمال کیا جائے اور الیکشن ہی کے ذریعہ ووٹ اقتدار پر براجمان طبقہ اپنے منصب سے ہٹایا جائے۔

اس طبقہ میں الشیخ محمد مصطفیٰ الزرقاؒ 'الشیخ وہبۃ الزوہلیؒ اور مودودی وغیرہ شامل ہیں۔اسی طرح پاکستان میں جمہوریت اورآئین کے تحت الیکشن میں حصہ لینے والی مذہبی پارٹیوں کے بہت سے پیروکار اور وفاق المدارس العربیہ کے تحت بہت سے مدارس کے اہلیان بھی تقریبا اسی نظریہ کے حامی ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں :

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اوراسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے 'اس کا نظام اسلامی اصول کے مطابق شورائی ہی ہوسکتا ہے 'لیکن سابقہ امریت نے ۵۶ء کے دستور کو منسوخ کر کے ملک کو ایک بار پھر ۱۹۴۷ء کی سطح کی طرف دھکیل دیا ہے 'سوشلسٹ عناصر روز اول ہی سے پاکستان میں دستور اسلامی اور قانون اسلامی کے نفاذ کی مخالفت کرتے چلے آئے ہیں۔

(جواہر الفقہ : ج۵ 'ص۱۲۶ 'ط : مکتبہ دارالعلوم کراچی)

''فان دار الاسلام اسم لموضع الذی یکون تحت ید المسلمین ،وعلامۃ ذلک ان یامن فیہ المسلمون۔''

(شرح السیر الکبیر 'شمس الائمۃ السرخسیؒ : باب قسمۃ الغنائم : ج۱ 'ص ۱۲۵۳ 'بحوالہ : اسلام اور جمہوریت)

''کل موضع لہ امیر وقاض یقدر علی اقامۃ الحدود لیس المراد تنفیذ جمیع الاحکام بالفعل اذالجمعۃ اقیمت فی عہد اظلم الناس ،وھو الحجاج وانہ ماکان ینفذ جمیع الاحکام ،بل المراد واللہ اعلم اقتدارہ علیٰ ذلک ۔''

(ردالمحتار ' باب الجمعۃ : ج ۲ 'ص ۱۳۸ 'ط : دار الفکر)

حضرت مفتی تقی صاحب لکھتے ہیں :

کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لیے اصل اہمیت اس بات کی ہے 'کہ اس پر مسلمانوں کا اقتدار اور قبضہ مکمل ہے ' یا نہیں ؟ اگراقتدار مکمل ہے 'تو اس کو دارالاسلام کہاجائے گا اور اس پر دارالاسلام کے احکام جاری ہوں گے 'اگرچہ مسلمان حکمرانوں کی غفلت سے وہاں شریعت کا مکمل نفاذ نہ ہوسکا ہو۔

(اسلام اورسیاسی نظریات : ص ۳۲۷ '۳۲۶ 'ط : معارف القرآن)

ان کا کہنا ہے : کہ اسلامی طرز حکومت میں جمہوری اصطلاحات کی بہت ساری جگہوں میں مثالیں ملتی ہیں ، جمہوریت کا لفظ لغوی معنی میں قدیم زمانہ سے استعمال ہوتا آرہاہے ، جس کا معنی ہے عوام۔۔۔ہم فقہ کی کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں ، کہ جمہور فقہائے کرام کا یہ فتویٰ ہے۔اگر کوئی اصطلاحی لفظ بناکر الگ تعریف کرے ، تواس سے لغوی معنی مراد لینا ناجائز اور حرام نہ ہوگا۔اور خاص کر جب اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت کی ذاتیات میں بہت فرق ہو۔

اسلامی حکومت کی بنیادیں :

حکومت اسلامی کی درجہ ذیل بنیادیں ہیں :

- حکومت کا قیام عوام کی مرضی سے ہوگا۔
- خلیفہ یا حکمران حاکم مطلق نہ ہوگا بلکہ وہ قرآن اور سنت کا پابند ہوگا۔
- قرآن اور سنت کی صریح احکام کے مقابلہ میں عوامی رائے کا اعتبار نہ ہوگا۔
- حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہے اور عوام کو حکومت کے احتساب کا حق حاصل ہے۔
- مسلم حکمران دینی احکام و قوانین کے نفاذ اور سیاسی ، انتظامی و عسکری امور کی انجام دہی میں جناب نبی کریم ﷺ کی نائب اور ان کے احکام کے پابند ہے۔

ایسی حکومت کا قیام شرعا مسلمانوں پر فرض ہے۔اس نوعیت کی حکومت اور اس کے سربراہ کے لیے کوئی بھی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے۔

عوام کی نمائندگی :

ایسے مسائل جن کا تعلق اجتہادی مسائل سے نہیں ہیں ، بلکہ انتظامی معاملات میں سے ہیں ، وہاں ہر کسی کی رائے کو ترجیح دی جائے گی ۔ جیسا کہ غزوہ احد کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے مشورہ لیا کہ مدینہ کے اندر جنگ لڑی جائے ، یا باہر کھلے میدان میں کفار سے جنگ کی جائے ، خود آپ ﷺ کی رائے مدینہ کے اندر لڑائی کی تھی ، جب کہ اکثر صحابہ کرامؓ کی رائے مدینہ سے باہر لڑنے کی تھی ، تب آپ ﷺ نے اکثریت پر فیصلہ فرمایا۔

اسی طرح غزہ حنین میں جب کثیر مقدار میں اموال غنائم حاصل ہوئے ، قصہ طویل ہونے کے بعد جب بنو ہوازن نے اپنے قیدی اور اموال واپس لینے کا مطالبہ کیا ، آپ ﷺ نے دونوں میں سے ایک دینے کا فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے غزوہ حنین میں شریک

تقریبا بارہ ہزار لشکر سے فرمایا: جو شخص اپنے حصہ کا قیدی بخوشی دینا چاہیے 'تو بہتر ہے ورنہ اگلی دفعہ مال غنیمت حاصل ہونے کے بعدان کو اولین ترجیح دی جائے گی 'تمام صحابہ کرام نے قیدی واپس کرنے کی رضامندی ظاہر کی 'تب آپ ﷺ نے فرمایا:

''ارجعوا حتی یرفع الینا عرفاؤکم امرکم''اوکماقال علیہ الصلوٰۃ والسلام:

(بخاری: ج ۲'ص ۲۱۸)

یعنی آپ لوگ واپس اپنی جگہوں پر تشریف لے جائیں' یہاں تک کہ تمھاری رائے آپ کے نمائندے پیش کریں۔

شروحات والوں نے عریف کا ترجمہ نمائندہ سے کیا ہیں۔

اسی طرح بیعت عقبہ کے دوران اوس اور خزرج کے نمائندگی کرنے والے نمائندوں نے جب آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔تو نمائندے ہونے کے ناطے یہ سب کی بیعت شمار ہوگئی۔

(مجمع الزوائد: ج٦'ص ۴۸)

حضرت عمرفاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قاضی شریح رحمہ اللہ کو خط بھیجا:

اگر آپ کے پاس کوئی مسئلہ آئے تو سب سے پہلے کتاب اللہ سے حل تلاش کرے'اگر وہاں نہ ملے تو سنت کی روشنی میں فیصلہ کرے'اگر وہاں نہ ملے تو صالحین اور ائمہ عدل کے فیصلوں کو بنیاد بنائے اور اگر وہاں بھی نہ ملے تو اپنی رائے اور اجتہاد کرے۔

(مفتاح الجنۃ للسیوطی: ص ۳۳'بحوالہ اسلام اور جمہوریت: ص۵٦)

یعنی نظام اسلامی میں درجہ ذیل اصولوں کو مد نظر رکھ فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔اب اگر اس کو کوئی جمہوری حکومت اور یا عوام کی حکومت کا نام دیدے'تو ناجائز نہ ہوگا۔

- کتاب اللہ۔
- سنت رسول اللہ ﷺ ۔
- خلفائے راشدین کے فیصلے۔
- اجماع امت۔
- صلحائے امت کے فیصلے۔

لہٰذا اگر کوئی جزئیہ مذکورہ بالا ماخذ میں نہ ملے'تو اس کی دو صورتیں ہوں گی: شرعی مسئلہ ۔۔۔انتظامی مسئلہ۔

شرعی مسائل کا تعلق علمائے کرام سے ہیں'جب کہ انتظامی امور میں عوام کی رائے قابل قبول ہے۔

ووٹ کی شرعی حیثیت :

کسی مجلس کی ممبری کے انتخابات کے لیے امیدوار کھڑا ہوتا ہے 'گویا وہ دو چیزوں کا مدعی ہے :

میں اس کا قابل اور اہل ہوں۔

میں دیانت دار ہوں۔

یعنی میں قوم کی خدمت کرنے کا اہل بھی ہوں اور اس پر امین بھی ہوں۔ ووٹر اس دعوی کی تصدیق کرتا ہے۔ گویا یہ ایک شہادت ہے۔اور ساتھ ساتھ سفارش بھی کرتا ہے 'کہ میری رائے میں یہ امیدوار قوم کا خیر خواہ ہے 'لہٰذا اس کو مطلوبہ عہدہ دینے کی میں سفارش کرتا ہوں۔اور اس پر مزید یہ ہے کہ امیدوار میری طرف سے وکیل بھی ہے 'جو بیت المال میں میرے حقوق ہیں 'یہ امین ہے 'مجھے میرا حق پہنچائے گا۔ گویا کہ یہ میری طرف سے وکیل ہے۔

اب ووٹ بیک وقت شہادت 'سفارش اور وکالت تینوں چیزیں ہیں۔

تفصیل کے لیے : (جواہر الفقہ : ج۵'ص ۵۳۵'ط : مکتبہ دارالعلوم)

اب اگر کوئی غلط گواہی دیدے 'یا حق کے ضائع ہونے پر گواہی چھپائے اور یا جھوٹی سفارش کرے اور یا کسی چور 'ڈاکو اور لٹیرے کو وکیل بنائے 'تو اس کا وبال خود پر اس پر آئے گا۔

(من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها۔)

ترجمہ : جو اچھی سفارش کرتا ہے 'اس میں سے اس کا بھی حصہ ہے اور جو جھوٹی سفارش کرتا ہے اس میں سے اس کو بھی حصہ ملتا ہے۔

اسی طرح حق دیکھ کر بھی گواہی چھپانا گناہ ہے۔

(ولاتكتموا الشهادة ومن يكتمهافانه آثم قلبه والله بماتعملون خبير۔)

(سورہ آل عمران : آیت : ۲۸۳)

الكبائر:الاشراک بالله وقتل النفس وعقوق الوالدين ويمين الغموس وشهادة الزور۔

کبیرہ گناہیں : اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا‘ناحق قتل کرنا‘والدین کی نافرمانی کرنا‘جھوٹی قسم کھانا اور جھوٹی گواہی دینا وغیرہ ہیں۔گناہ کبیرہ کی تعریف میں علمائے کرام کا اختلاف ہے۔

تفصیل کے لیے : (شرح العقائد : ص ۸۲)

طبقہ سوم :

ان کے نزدیک مروجہ جمہوری اصطلاحات اور قوانین اسلامی اصطلاحات سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ نظام اسلام اور نفاذ اسلام کے لیے مناسب ہیں ‘البتہ کوشش یہی ہونی چاہیے ‘کہ سابقہ اسلامی اصطلاحات : مثلا : امیر ‘حاکم ‘دارالاسلام ‘جہاد ‘دارالحرب ‘جزیہ ‘خروج وبغاوت وغیرہ اصطلات استعمال ہوں۔لیکن جب جمہوری نظام ہم پر مسلط کر دیا گیا اور اس میں نفاذ اسلام کی گنجائش ہو ‘تو ایک عبوری اور عارضی حیثیت سے اس کو قبول کرنا چاہیے اور اگر اس سے بہتر نظام (جہاں اسلام کے جامع خدوخال اور اصطلاحات میسر ہوں)‘تو اس کے قبول کرنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیے۔اور اگر تیر وسنان اور جہاد اسلامی کی ضرورت پڑی تب بھی جہاد ہی کے ذریعے نظام حکومت کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا چاہیے۔

ان کے ہاں صرف آئین اور دستور کے اسلامی ہونے سے ریاست دارالاسلام نہیں بنتی ہے ‘بلکہ اسلامی دفعات کا نافذ العمل بھی ضروری ہے اور اگر کئی پر سیکولر طبقہ کی حکومت آئی اور انہوں نے احکام اسلام کے اجراء کو غیر ضروری قرار دیا ‘یا اسلام کے کسی حکم کے خلاف قانون جاری کیا اور اسلامی دفعہ اور شق میں تبدیلی کی ‘تو یہ ریاست دارالاسلام نہ کہلائے گی ‘بلکہ دارالمسلمین ہو گی

اس طبقہ بھی میں دیوبند کے بہت سارے مشائخ وعلمائے کرام شامل ہیں۔ان میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں ‘جنہوں نے تقسیم پاک وہند سے قبل ہی جمہوری نظام کو بطور مجبوری قبول کیا اور پاکستان بننے کے بعد انہوں نے پاکستان کے اسلامی آئین اور دفعات میں تعاون بھی کیا اور جمہوری نظام کے حصہ بھی بنے۔مگر جب انہیں اسلامی نظام وانصرام صرف کاغذ کی شکل میں نظر آیا اور حکمران طبقہ کا نافذ العمل ہونے کی قدرت کے باوجود بھی مسئلہ جوں کا توں تھا ‘تو انہوں نے اس ریاست کو دارالمسلمین کہا ‘البتہ دارالاسلام کہنے سے رجوع کیا۔

(بصائر وعبر : ج ۲ ‘ص ۱۱۸ ‘ط : بینات کراچی)

کسی ملک کے دارالاسلام بننے کا مدار کس چیز پر ہے؟ تمام علمائے امت کا اتفاق ہے ‘کہ کسی خطہ کے زمین کے دارالاسلام بننے کا مدار اس بات پر نہیں ‘کہ وہاں کے مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کیا ہے ‘بلکہ اس کا مدار قانون اسلام کے نفاذ پر ہے۔

(ماخوذ از بینات : قانون کا بنیادی مقصد : ستمبر 2019)

دارالاسلام وہی ہو سکتا ہے اور اسلامی مملکت وہی ہو سکتی ہے جہاں اسلام کی ہمہ گیر فرمانروائی ہو اور جہاں اسلام کے وہ تمام احکام و قوانین جاری ہوں جن کی تفصیلات کتاب و سنت اور فقہ اسلامی میں موجود ہیں۔

(ماخوذ از بینات : قانون کا بنیادی مقصد : ستمبر 2019)

مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ لکھتے ہیں :

پاکستان مسلمانوں کا ملک ضرور ہے ' مگر اس سے اسلامی ریاست ' یا دارالاسلام نہیں کہہ سکتے ' کیونکہ یہاں قوانین اسلامی رائج نہیں ہیں۔

(آپ کے مسائل اور ان کا حل : ج۸ ' ص ۶۳۳ ' ط : مکتبہ لدھیانوی کراچی)

<u>دینی طبقات کے مختصر تذکرے کے بعد پہلے جمہوریت اور خلافت کی تعریف ضروری ہیں اور دوسرا یہ ہے کہ کیا اسلامی نظام سیاست و قضاء میں اجتہاد کی گنجائش ہے ' یا نہیں ہے ' اس کے بعد مسئولہ صورتوں کا جواب آسان ہوگا۔</u>

<u>خلافت (Caliph) کی تعریف :</u>

خلافت : خلف یخلف کا مصدر ہے ' جس کا معنی ہے کسی اور کے بعد آنا۔

"ھی الرئاسۃ العامۃ فی التصدی لاقامۃ الدین باحیاء العلوم الدینیۃ واقامۃ ارکان الاسلام ،والقیام والجھاد ،ومایتعلق بہ من ترتیب الجیوش ،والفرض للمقاتلۃ ،واعطائھم من الفیئ ،والقیام بالقضاءواقامۃ الحدود ،ورفع المظالم ،والامر بالمعروف والنھی عن المنکر،نیابۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم "

ترجمہ : سرور کائنات ﷺ کا نائب ہو کر علوم دینیہ کے ذریعے دین قائم کرنا ' اسلامی ارکان قائم کرنا ' جہاد اور اس سے متعلق لشکروں کی ترتیب ' ان کو وظائف دینا مال فیئ میں سے انہیں حصہ دینا ' قضا اور حدود قائم کرنا ' مظالم کا خاتمہ کرنا ' نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا کا سربراہ بننا۔

(ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء : ج ۱ ' ص ۱۳ ' ط : قدیمی)

خلافت جناب نبی کریم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے ملت اسلامیہ میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری ' انتظامی ' عسکری اور سیاسی امور کی انجام دہی کا نام ہے۔

(تاریخ ابن خلدون : ج ۱ ' ص ۳۳۹)

(ازالۃ الخفاء : ص ۲۸)

جمہوریت کی تعریف :

الجمہور: الرمل الکثیرالمتراکم الواسع۔

جمہوریت کی جامع مانع تعریف میں اختلاف :

الحکم الجمہوری ان یکون الحکم بیداشخاص تنتخبہم الامۃ علی نظام خاص ،ویکون للامۃ رئیس ینتخب لمدۃ محدودۃ ۔

الجمہوریۃ دولۃ یراسہا حاکم منتخب من الشعب او من ممثلیہ ،وتکون ریاستہ لمدۃ محدودۃ ۔

(معجم الوسیط : ابراہیم احمد زیات ،بحوالہ اسلام اور جمہوریت : ص ۵۷)

جناب احمد مختار کے نزدیک :

دولۃ یراسہا حاکم منتخب من الشعب او من ممثلیہ ،وتکون ریاستہ لمدۃ محدودۃ ،ینص علیہا دستورالبلاد۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے نزدیک :

جمہوریت نام ہے اسی تصور کا جس میں انسان اپنے آپ پر کسی شخص یا گروہ کی حکمرانی تسلیم کرتا ہے ،لیکن اس طرح نہیں کہ فرد یا گروہ اس پر زبردستی مسلط ہو جائے۔

حضرت مولانا مفتی تقی صاحب کے نزدیک :

ایسانظام حکومت جس میں عوام یا عوام کی رائے کو کسی نہ کسی شکل میں حکومت کی پالیسیاں طے کرنے کے لیے بنیاد بنایا گیا ہو۔

جناب محمد صلاح الدین شہیدؒ کے نزدیک :

جمہوریت ایسے طرز حکومت کا نام ہے ،جس میں اقتدار ان افراد ،سیاسی جماعت یا جماعتوں کو سونپا جاتا ہے ،جن کو رائے دہندگان کی اکثریت نے اپنی آزادانہ مرضی سے اپنا نمائندہ منتخب کیا ہو۔

حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب کے نزدیک :

جمہوریت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ،کیونکہ جمہوریت ایک طرز حکومت ہے اور اسلام آئین حکومت ہے۔

پروفیسر شاہ فریدالحق کے نزدیک :

جمہوریت عوام کی ایسی حکومت ہے ،جس میں وہ اپنی بساط کے مطابق پوری خوداعتمادی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔

ارسطو کے نزدیک :

جمہوری طرز حکومت میں اقتدار ایک ہجوم کے ہاتھوں میں ہوتاہے۔

لارڈ برناس کے نزدیک :

یہ نظام حکومت غالب اکثریت کی حکمرانی قائم کرتاہے اورافراد کے مخصوص گروہ کے ہاتھوں میں اقتدار نہیں ہوتاہے۔

گیٹیل یوں اظہار کرتاہے :

ایسا طرز حکومت جس میں آبادی کا ایک بڑا حصہ اقتدار کے اختیارات کے استعمال میں شرکت کا حق رکھتاہے۔

ابراہم لنکن جمہوریت کی تعریف یوں کرتاہے :

عوام کی حکومت عوام کے لیے اور عوام کے ذریعے سے ہوتی ہے۔

تفصیل کے لیے : (سلام اور جمہوریت : ص ۵۹)

خلافت وامامت میں فرق :

اہلسنت والجماعت کے نزدیک خلافت کا انتخاب سرور کائنات ﷺ نے اپنی زندگی میں نہیں کیاہے۔

چنانچہ مسلم شریف میں مذکور ہے : کہ آقائے نامدار ﷺ نے خلیفہ کے انتخاب کا ارادہ فرمایا : پھر یہ فرماکرارادہ ترک کیا :

"یأبی الله والمؤمنون الاابابکر۔۔"

ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ کسی اور کو خلیفہ بنانے سے اللہ تعالیٰ بھی انکار کرتاہے اور مومن بھی راضی نہیں ہوتے ہیں۔یہ جناب نبی کریم ﷺ کی طرف سے امت کی اجتماعی صوابدید پراعتماد کا اظہار تھا۔چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کا انتخاب عوامی رائے سے ہوابلکہ اچھی خاصی عوامی بحث ومباحثہ کے بعد ہوا۔اس کے برعکس شیعوں کے ہاں امام کا تقرر خود آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں کیا،اس لیے وہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصی کہتے ہیں۔

- ✓ شیعوں کے نزدیک امام کسی کے ہاں جواب دہ نہیں ہوتا ہے۔
- ✓ شیعوں کے ہاں امام معصوم ہوتا ہے۔
- ✓ شیعوں کے ہاں امام نسبی اور خاندانی ہوتا ہے۔

❖ مذکورہ بالا تحریر سے راقم الحروف کے نزدیک اتنی بات ثابت ہوگئی ،کہ اسلام کا نظام سیاست وخلافت اجتہادی ہے ،اور جمہوریت کی تعریف بھی صرف وہ نہیں ہے ،جو زبان زد عام ہے : کہ جمہوریت میں عوام کی حکومت عوام کے ذریعے عوام پر ہوتی ہے۔

جو لوگ جمہوریت کو کفر سمجھتے ہیں انہوں نے اسی تعریف کو بنیاد بنا کر فتویٰ جھاڑ دیا ہے۔اوراسی طرح وہ لوگ نظام سیاست صرف خلافت میں محصور سمجھتے ہیں۔حالانکہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔بلکہ خلافت میں بھی شریعت نے ہمیں عزیمت اور رخصت کی راہ دکھائی ہے۔خلفائے راشدین کو خلافت راشدہ کہاجاتاہے اوراس کو عزیمت کانام بھی دیاجاتاہے اورامیر المومنین حضرت معاویہ اور سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت کوخلافت عادلہ کہاجاتاہے اوراس کو رخصت کا نام بھی دیا جاتا ہے اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت بھی عادلہ کہلاتی ہے۔اب اگرنظام شریعت صرف خلافت میں محصور ہو ،تو حدیث کی روشنی کے مطابق خلافت تو صرف تیس سال ہے ،اس کے بعد ملوکیت اور کاٹنے والی بادشاہت ہوگی ، پھراب کی دنیا میں خلافت کا مطالبہ کیسا ممکن ہے ؟

اسی طرح رائے عامہ کو نظام اسلامی میں بہت دخل ہے۔جیسا کہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مہاجرین وانصار کی کافی بحث ہوگئی۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی زندگی میں جانشین کا انتخاب نہیں فرمایا ،بلکہ اس کو شوریٰ کے حوالہ کردیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا : کہ اگر تمہارا اتفاق نہ ہوسکے ،تو کثرت رائے پر فیصلہ کریں۔اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتخاب میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر عام وخاص سے مشورہ طلب کیا ، یہاں تک کہ عورتوں سے بھی رائے لی گئی ،جن میں اکثریت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انتخاب کیا۔

اور پھر فرمایا :

"رایت الناس لایعدلون بعثمان۔"

(صحیح البخاری ،کتاب الاحکام ، باب : کیف یبایع الامام الناس)

امیدوار یا کونسلر:

اسی طرح امیدوار کا ثبوت بھی ہے ٗجس کو بیعت عقبہ میں نقباء کا لقب دیا گیا ہے اور یا غزوہ حنین میں عرفاء کہا گیا۔

اسی طرح مروجہ اصطلاحات میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے ٗبلکہ امارت اسلامی افغانستان میں بھی ایک حدتک یہی جمہوری اصطلاحات کا اطلاق کیا جاتا ہے ۔ جیسے : وزیر اعظم ٗوزیر خارجہ ٗوزیر داخلہ اور وزیر دفاع وغیرہ۔

یہاں تک امارت اسلامیہ بھی ایرانی جمہوریت کے قریب خلافت اور جمہوریت کا مجموعہ ہے ٗاس لیے یہاں ووٹ کے بجائے طاقت سے فاسد حکومت کا خاتمہ ہوا ٗجب کہ جمہوریت میں ووٹ اور رائے کے ذریعے اقتدار کا انتقال ہوتا ہے ٗمگر امیر المومنین کے پاس سپریم اختیارات کے باجود مذاکرات اور بیرون ممالک کے وزرا اور سفرا سے ملاقات میں وزیر اعظم اور وزیر خارجہ کا کردار پیش پیش ہیں۔ جو ایک گونہ ایرانی جمہوریت سے قریب ہے۔ کیونکہ :

ایران کا دستور امامت کی بنیاد پر ترتیب شدہ ہے ٗکہ امام غائب کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ولایت فقیہ کو ان کو نمائندہ کی حیثیت دی گئی ہے اور ولایت فقیہ کے طور پر آیت اللہ خمینی اور اس کے بعد آیت اللہ خامنائی اس منصب پر فائز ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایک شوری نگہبان ہے اور ولایت فقیہ وشوریٰ نگہبان کو دستوری طور یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان کے فیصلے حکومت ٗپارلیمنٹ ٗعدالت اور دیگر تمام شعبوں پر بالادستی رکھتے ہیں اور وہ ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی منسوخ کرسکتے ہیں۔

یعنی یہ بات ثابت ہوگئی ٗکہ منصب خلافت کا انتخاب اجتہادی ہے اور جمہوریت کی جامع اور مانع تعریف نہیں ہوسکتی ہے ٗاگر پھر بھی کوئی انکار کرے ٗتو یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا ٗکہ جن مذہبی پارٹی والوں نے جمہوریت میں حصہ لیا ہیں وہ جمہوریت کی اپنی اصطلاح باندھ کر تعریف کرتے ہیں۔ ورنہ محمود غزنویؒ ٗعالمگیر اورنگزیبؒ اور ملا محمد عمرؒ کی خلافت پر بھی سوال ہوگا ٗکہ وہ قریشی نہیں تھے۔اور خلافت کے متعین زمانہ کے بعد دنیا میں آئے ہیں۔

''ثم هذاکله اذا وجد فی قریش من ہو اہل للخلافة ،اما اذالم یوجد فیہم من یستجمع الاوصاف المطلوبة ،فلاجواز فی عقد الخلافة لغیر القریشی۔''

(تکملة فتح الملہم ٗکتاب الامارۃ ٗباب الناس تبع لقریش ٗوالخلافة فی قریش : ج ۳ ٗص ۲۷۸۔۲۸۲)

اسی طرح اسلامی حکومت صرف نظام خلافت پر حصر کرنا درست نہیں ہے۔ ورنہ مدت خلافت تو ختم ہوچکی ہے۔

''عن سفینة (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)قال:سمعت رسول اللہ ﷺ خلافة النبوة ثلاثون سنة ثم یؤتی اللہ الملک من یشاء او ملکہ من یشاء''اوکماقالﷺ:

(سنن ابی داؤد : باب الخلفاء)

''عن سفینۃ ؓ قال :سمعت رسول اللہ ﷺ یقول :الخلافۃ ثلاثون عاما ،ثم یکون بعدھاالملک ۔قال السفینۃؓ: امسک خلافۃ ابی بکر سنتین وخلافۃ عمرعشرسنین وخلافۃ عثمان اثنتی عشرۃ سنۃ وخلافۃ علی ست سنین۔''اوکماقالﷺ:

(مسندالامام حمد بن محمد بن حنبل : حدیث ابی عبدالرحمٰن سفینۃ مولی رسول اللہ ﷺ،بحوالہ اسلام اور جمہوریت : ص ۲۷)

اسی طرح پورے عالم میں ایک خلیفہ کا ہونا ضروری ہے۔لیکن اس کے باوجود فقہائے کرام نے یوں فتوی دیا ہیں :

''مسلمانوں اور زمانہ کے تغیر اور حالات کو دیکھ کر علمائے کرام نے ایک خلیفہ اور حاکم کے ہونے کو متعذر اور مشکل قرار دے کر مختلف علاقوں میں الگ الگ حاکم کے تقرر کو جائز کہاہیں۔''

(ماثرالاناقۃ فی معالم الخلافۃ : ج ۲،ص ۲۵۵،بحوالہ اسلام اور جمہوریت : ص ۳۳)

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں :

''اب عام اجتماع تو مشکل ہے،اس لیے وہ لوگ ان کے قائم مقام ہوں گے جن کو عام مومنین سمجھیں گے کہ یہ ہمارے بڑے ہیں۔''

(حسن العزیز، باب سوم : ص ۱۷۳،بحوالہ : اسلام اور جمہوریت : ص ۳۷)

''ہر ملک ہر قوم کا علیحدہ علیحدہ امیر بنانے کی رسم چل گئی،تو مسلمانوں نے اس کا تقرر اسی اسلامی نظریہ کے تحت جاری رکھا،کہ ملک کے مسلمانوں کی اکثریت جس کو امیر منتخب کرے،وہ اس ملک کا امیر اوالامر کہلائے،قرآن مجید کے ارشاد :

(وامرھم شوریٰ بینہم) کے عموم سے اس پر استدلال کیاجاسکتاہے،اسمبلیاں اسی طرز عمل کاایک نمونہ ہے۔''

(معارف القرآن : ج۱،ص ۱۸۶،ط : ادارۃ المعارف ،کراچی)

اسی طرح ووٹ پر بھی شہادت ،وکالت کی بالکل وہی عبارتیں چسپاں کرنا مناسب نہیں ہے،جو فقہائے کرام نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں،بلکہ ووٹ دینے والے کا مقصد یہ ہوتاہے،کہ جس کو میں ووٹ دیتاہوں،وہ میرے علم کے مطابق پاکستان کے بیت المال میں موجود میرا حق دلوانے میں دیانت دار ہے،اور حق وصول کرنے کی قابلیت اور اہلیت بھی رکھتاہے،اس پر میں گواہی بھی دیتاہوں اور اس کے منتخب ہونے کی سفارش بھی کرتاہوں۔

اسی طرح کافر کی رائے بھی بعض صورتوں میں قبول کی جائے گی اور پھر خاص کرجب وہ کسی مذہبی پارٹی کے اسلامی نظام کا حامی بھی ہو۔

کافر کی گواہی عندالاحناف بعض اوقات جائز ہوتی ہے :

واعلم ان فی ابی داؤد ۔۔۔عن ابی ہریرةؓ مایدل علی قبول شہادة الکافر ،ولایجوز ذلک عندالشافعیؒ ،وجائزعندنا فی بعض الصور۔

(العرف الشذی ' باب رجم اہل الکتاب : ج۱'ص ۲۶۸'۲۶۷'ط : قدیمی)

اسی طرح عورت کی حاکمیت بھی بعض فقہائے کرام نے نزدیک درست ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیمؒ لکھتے ہیں :

''واماسلطنتها فصحیحۃ ،وقدولی مصرامراۃ تسمی شجرۃ الدر۔''

(البحرالرائق : کتاب القضاء)

''وقدروی عن عمربن الخطاب:انہ ولی الشفاءٔ امراۃ من قومہ۔فان قیل :قدقال رسول اللہ ﷺ :''لن یفلح قوم اسندوا امرھم الی امراۃ'' ۔قلنا:قال ذلک رسول اللہ ﷺ فی الامر العام الذی ہو الخلافۃ۔''

(المحلیٰ بالآثار 'کتاب الشادۃ : ج۸'ص ۵۲۷'بحوالہ : اسلام اور جمہوریت : ص۲۰۳)

لہٰذا جمہوری نظام کو یکسر کفر قرار دے کر غلط کردینا کسی طرح درست نہیں ہے۔تاہم اس میں بہت زیادہ خامیاں بھی ہیں۔

مثلا :

- ✓ ہر کسی کی زبان زدعام جمہوری طرز سیاست ہے 'گولی کے بجائے بولی اور بولٹ کے بجائے بیلٹ سے نظام خلافت یکسر طور مسدود ہوچکاہے ۔جمہوری ملکوں میں رہنے والے مسلمان خلافت 'امیرالمومنین اوراسلامی فوجداری ودیوانی مقدمات وغیرہ یاتوضروری نہیں سمجھتے ہیں اور یاان کا نفاذ ناممکن سمجھتے ہیں۔
- ✓ جمہوریت میں کیفیت کے بجائے کمیت کا اعتبار ہے 'اس میں شیخ الحدیث ' عالم دین ' دیندار لوگوں کا ووٹ جاہل 'بدمعاش اور بدکرادر کے برابر ہوتاہے۔جمہوریت میں بندوں کوگنا کرتے ہیں 'تولانہیں کرتے ہیں۔
- ✓ دستور اورآئین میں صحیح طور عدم نفاذ ہے 'نافذ العمل ہونے کے لیے اکثریت لازمی ہے۔ورنہ دستوراسلامی ہونے کے باوجود نافذ نہیں ہوسکتاہے۔

- ✓ جمہوریت میں اکثریت پر فیصلہ ہوتا ہے 'عوام کی لاشعوریت اور جہالت سے صحیح امیدوار کا انتخاب نہیں ہو سکتا ہے۔
- ✓ شفاف انتخابات کا فقدان ہے۔ جس میں ایک دوسرے کی کردار کشی 'اور ایک دوسرے پر جھوٹا اور فراڈی 'خائن جیسے مکروہ الزامات لگائے جاتے ہیں
- ✓ امیدوار سیٹ کو اپنا حق سمجھتا ہے 'یہاں تک کہ مذہبی پارٹیوں میں سیٹ نہ دینے پر دیندار لوگ رفوچکر ہو جاتے ہیں۔
- ✓ شریعت میں عہدہ ایک امانت ہے 'جب کہ جمہوریت میں لوگ اس کو حق سمجھتے ہیں 'امانت سے لوگ ڈرتے ہیں 'جب کہ حق کے حصول کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔
- ✓ دستور شرعی ہونے کے باوجود غیر نافذ العمل ہے۔مثلا :

دستور میں غیر شرعی امور مثلا : سود کا خاتمہ شامل ہےاور وفاقی شرعی عدالت نے ۲۳دسمبر ۱۹۹۹ نے اپنے تاریخ ساز فیصلے میں سود کو غیر قانونی اور اسلامی احکامات کے منافی قرار دیا۔

(سود پر تاریخی فیصلہ : ص ۷'۲'ط : مکتبہ معارف القرآن 'کراچی)

- ✓ یہاں آئین صرف کاغذات تک محدود ہے 'نافذ کرنے کے لیے ایک تہائی اکثریت 'یا سادہ اکثریت لازمی ہے 'جو پاکستان کی تاریخ میں اب تک ایسی صورت سامنے نہیں آئی ہے 'جس میں مکمل شریعت نافذ ہو چکی ہوں۔
- ✓ بہت سے ناروا اور حرام امور کو نافذ کرنے کے لیے پارلیمنٹ کا سہارا ضروری ہے 'ورنہ آئین اور دستور سے بغاوت شمار ہو گی۔
- ✓ دفعہ نمبر : ۴۵

صدر مملکت کسی کو دی گئی عدالتی سزا معاف یا تبدیل کرنے کا اختیار آئینی طور پر رکھتا ہے۔

حالانکہ شریعت میں حدود اور قصاص میں کسی کو معافی کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

- ✓ دفعہ نمبر : ۲۴۸

صدر اور گورنر کو ان کے عہدے کے دوران فوجداری مقدمات کے تحت سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔

نوٹ : بعض فقہائے کرام کے نزدیک اس طرح کرنا درست ہے ' کیونکہ صدر کو سزادینے کی صورت میں مزید خلفشار پیداہوتاہے۔لیکن یہاں کے جمہوری نظام میں یہ آئین کا حصہ ہے 'اگرچہ وہاں حاکم کی معزولی میں خلفشار ' فتنہ اور فساد رونما ہوں۔

حکمرانوں کے توہین امیز جملے۔مثلا :

- ✓ گورنر جنرل غلام محمد کا قول :

مولانا (حضرت شبیراحمد عثمانیؒ)آپ کو اپنا روش بدلناپڑے گی ورنہ نوجوان بھڑک اٹھیں گے اور کہیں پاکستان کا معاملہ اسپین والا معاملہ نہ ہو۔

- ✓ وزیر اعظم لیاقت علی خان کا قول :

مولانا (شبیراحمد عثمانیؒ) ٹخنے کٹا پاجامہ نہیں چلے گا۔

- ✓ پاکستان کے اول تینوں افواج کے کمانڈر غیر مسلم تھے :

بری فوج کا سربراہ : جنرل میسروی 'فضائیہ کا سربراہ : ایل آر ایچرے اور بحری فوج کا سربراہ : ڈجیمز ولفریڈ تھے۔

لہٰذا مذکورہ بالا مفاسد کو بھی سامنے رکھ کر فتوی صادر کرنا چاہیے ' کہیں ایسا نہ ہو 'کہ ہم محبت کی آڑ میں ایک غیر شرعی عمل کو شرعی نہ کہے اور یا ڈر اور خوف کی وجہ سے کسی ناروا عمل کو روا کہے۔ ورنہ شریعت اور ان پر چلنے والوں کی جھلسی لاشیں قیامت کے دن ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔

بنابراین ہمیں جب مروجہ جمہوریت میں کوئی خاطر خواہ کامیابی نظر نہیں آتی ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے ' کبھی حقوق نسواں بل کے نام زن آزادی ' کبھی میرا جسم میری مرضی کی آواز لگانے والوں کے ساتھ حکومت کا شانہ بشانہ ہونا ' کبھی ٹرانس جینڈر بل میں حکومت کی حمایت شامل حال ہونا اور کبھی ویلنٹائن ڈے منانے میں مرد اور عورت کا آزادانہ طور ملنے کو جمہوری حق کہنا۔اسی طرح آئے روز جمہوری آزادی کے نام پر ہر روز نئے فتنہ کا ظاہر ہونا زندگی کا جزء لاینفک بن چکاہے۔ اور دوسری طرف مذہبی طبقہ کی جمہوری طریقے سے ان مفاسد کا ازالہ کرنا بھی سب کے سامنے ہے 'کہ ان کو کس قدر کامیابی نصیب ہوئی ہے اور قانون نے کس کو تحفظ دیاہے ؟اور یہ کہنا کہ ہم صرف محنت کے مکلّف ہیں ' نتیجہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے

یہ کہنا بھی اس لیے درست نہ ہوگا ،کہ جب کوئی نظام کئی سالوں سے مسلط کیا گیا ہو اور اس کو بار بار آزمانے کے بعد بھی نتیجہ حاصل نہ ہو ،تو پھر اس کے متبادل پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

اگر اسی جمہوری نظام میں ہوتے ہوئے ہمیں متبادل صورت تلاش کرنا پڑے ،تو شاید مشکل نہ ہو۔

مثلا : ہر عہدہ پر براجماں ملازم یہ عہد کرے ،کہ ہمیں کسی صورت حکومت کے نارواامور میں **مداخلت منظور نہیں**۔جہاں کرپشن کا مسئلہ ہو ،ناجائز ٹیکس کا فیصلہ ہو اور یا حکومت کا کوئی بھی ظالمانہ رویہ ہو ،اس کے سامنے حق کا اظہار بیانگ دہل کروں گا ،اگر عہدہ سے سبکدوش ہونا پڑے ،تو اس سے جوتے کی نوک پر رکھوں گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب یوں رقمطراز ہے :

''واما المبدء الثانی:فھوانہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق ،فلایطاع امیر ولاامام ان امربماھومعصیۃ ،وان ھذالمبدا لو عمل بہ فی بلاد المسلمین الیوم لاغنی عن کثیرمن الاضراب و الاضطرابات الجاریۃ فی کثیر من البلدان ولاضطرت بہ الحکومات علی تطبیق الشریعۃ الاسلامیۃ فی جمیع نواحی الحیاۃ ۔فلو امتنع القضاۃ عن اصدارحکم لایوافق شرع اللہ ،وامتنع المؤظفون من امتثال الاوامر المصادمۃ لاوامراللہ ،وامتنع اصحاب البنوک من التمویل علی اساس الربا المحرم شرعا ،وامتنع العامۃ من ایداع اموالھم فی البنوک الربویۃ ،وامتنع کل مسلم عن الخضوع للاحکام الصادمۃ للشریعۃ الغراء ۔لاضطرت الحکومات الی الغائ القوانین الوضعیۃ التی لاتوافق الشریعۃ الاسلامیۃ ۔وھذا ہوالطریق المشروع للضغط علی الحکومات فی سبیل اقامۃ شرع اللہ ،وتطبیق احکامہ واما ماتعلمہ الناس من الغرب من وسائل الضغط علی الحکومات ،کالاضرابات والمظاھرات ،وسدالشوارع ،وسفک الدماء ،وتخریب العمران ،فلیس من الاسلام فی شیئ ۔''

(تکملۃ فتح الملہم : باب وجوب طاعۃ الامرائ فی غیر معصیۃ ،و تحریمھا فی معصیۃ : ج ۳ ،ص ۱۸۳)

علامہ ابن تیمیہؒ فرلکھتے ہیں :

''فالواجب علی المسلم ان یجتھد فی ذلک بحسب وسعہ ،فمن ولی ولایۃ یقصدبھا طاعۃ اللہ واقامۃ مایمکنہ من الواجبات ،واجتناب ما یمکنہ من المحرمات ،لم یؤاخذ بمایعجز عنہ ؛فان تولیۃ الابرار للامۃ خیر من تولیۃ الفجار۔''

(مجموعۃ الفتاوی ،فصل : ولایۃ الامر من اعظم واجبات الدین)

سوال : اگر کوئی کہے ،کہ مروجہ جمہوری نظام ہم پر مسلط کیا گیا ہے ،اس لیے دو مصیبتوں میں آسان مصیبت اختیار کرنی چاہیے۔

اس کا جواب حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے یوں دیا ہے :

اھون البلیتین :

دو مصیبتوں میں سے ہلکی مصیبت کو اختیار کرنے کی گنجائش دو صورتوں میں ہیں :

جو علوم اسلامیہ میں پوری مہارت رکھتا ہو' دین اور تقویٰ میں بھی اعلیٰ مقام رکھتا ہو۔

اس کی وضاحت بار بار کی جائے 'کہ یہ کام ناجائز ہے 'مگر شرعی ضرورت کے تحت اختیار کیا گیا ہے۔ ورنہ عامۃالمسلمین اس گناہ کو گناہ نہ سمجھیں گے۔

تفصیل کے لیے : (احسن الفتاوی : ج٦'ص ٤٢' ط : ایچ ایم سعید کراچی)

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی مسئولہ صورتوں کے جوابات :

❖ **پاکستان کے جمہوری نظام کو اسلامی نظام کہنا :**

1۔۔۔پاکستان کے جمہوری نظام میں اکثر دفعات اسلامی ہیں۔

❖ **ووٹ کو شہادت یا سفارش کہنا :**

2۔۔۔ووٹ دینے کے دوران ووٹر اپنے حق میں منتخب امیدوار برحق سمجھتا ہے۔اس کے لیے ووٹ امانت بھی ہے' شہادت بھی ہے اور سفارش بھی ہے۔

❖ **ووٹ میں عادل اور فاسق کی گواہی کا ایک ہونا :**

3۔۔۔یہ کہنا کہ شریعت میں گواہ کے لیے عادل اور نیک ہونا ضروری ہے' جب کہ یہاں عادل 'ظالم 'نیک اور فاسق سب برابر ہیں' درست ہے 'لیکن یہاں وہ شہادت مراد نہیں ہے 'جس میں باقاعدہ مدعی اور مدعی علیہ ہو۔بلکہ امیدوار کا یہ دعوی ہے کہ میں عوام کی خدمت کروں گا اور دستور کے دائرے میں اپنا ہر آئینی حق عوام کو دوں گا۔اور آپ صرف یہ گواہی دیتے ہو' کہ شرعی نظام نافذ کرنے میں اور میرا حق وصول کرنے میں یہ امیدوار حق بجانب ہے۔اب اگر کوئی غلط امیدوار کا انتخاب کرے' جس پر کرپشن کا الزام ہو' ماضی داغدار ہو اور یا دینی احکام نافذ ہونے کا خیر خواہ نہ ہو' تو اس وقت آئین کے عدم نفاذ کا سوال امیدوار اور ووٹر سے ہوگا' آئین اور دستور کے غلط ہونے کا الزام درست نہ ہوگا۔

❖ جمہوری نظام میں مرد وزن کی گواہی میں مساوات :

4۔۔۔انتظامی امور میں ایک مرداور عورت کی رائے اگر برابر ہو جائے ،توشرعا حرج نہیں ہے۔کیونکہ دستور اورآئین مکمل طور موجودہے ،ہاں اگردستور میں ترمیم ہواوریاغیر شرعی دفعات کاآئین میں اضافہ کرنا ہو،توایسی صورت میں مرد اور عورت دنوں کی رائے سے نو منتخب امیدوار کے گناہ میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔یعنی یہ کوئی ایسی گواہی نہیں ہے ،جس میں مدعی کو حق دلوانے کے لیے باقاعدہ دوگواہوں (دومرداوریاایک مرددوعورتیں) کاہوناضروری ہیں۔اگردوگواہ ایک مرداور عورت کی صورت میں مل جائیں ،تو مدعی کے حق میں فیصلہ ہوکرمدعی علیہ کا حق ضائع ہوگا۔بلکہ نظام مملکت چلانے کے لیے ،یا عوامی خدمت کے لیے پارلیمنٹ میں رائے طلب کی جاتی ہے ،جس میں ہرایک کے یکساں ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتاہے اورنہ ہی اس سے کسی کا حق ضائع ہوتاہے۔کیونکہ اس ووٹ (شہادت) سے صرف چیف الیکشن سے اپنی پسندیدہ امیدوار کے انتخاب کی سفارش ہے اوراس کی بہتری کی شہادت ہے۔اس کے باجوداگرکوئی امیدوار کرپشن کرے ،یااقرباپروری کرے ،توگناہ گار وہ خود ہوگا۔اسی بنیاد پر چیف الیکشن کمیشن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بغیرکسی امتیاز کے مردوں ،عورتوں اوریہاں تک کے بچوں سے بھی خلافت کے انتخاب میں رائے طلب کی۔

’’ثم نهض عبدالرحمن بن عوف رضی الله عنہ يستشير الناس فيهماويجمع رای المسلمين برای رؤس الناس واقيادہم جميعا واشتاتا،مثنیٰ وفرادیٰ،ومجتمعين سراوجهرا حتى خلص الى النسائ المخدرات فی حجابهن ،وحتى سأل الولدان فی المكاتب وحتى سأل من يرد من الركبان والاعراب الى المدينۃ فی مدة ثلاثۃ ايام بلياليها،فلم يجد اثنين يختلفان فی تقدم عثمان بن عفان ،الامابنقل عن عمار والمقداد انهما اشارا بعلی بن ابی طالب ۔‘‘

(البدایۃ والنھایۃ ،خلافۃ امیر المؤمنین عثمان بن عفانؓ)

اوراگراسلامی دفعات کی بات ہو،تو تقریبا بہت سارے اسلامی دفعات تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام کی مشاورت سے دستور کا حصہ بن چکا ہیں۔

❖ پاکستان کی آئین میں حاکم مطلق اور مقتدراعلیٰ اللہ پاک کی ذات ہے :

5۔۔۔یہ بات درست ہے کہ پاکستان کے آئین میں اللہ تعالیٰ کو حاکم مطلق مانا گیاہے ،جب کہ اسلامی دفعات کو نافذ کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی تین تہائی ،یا سادہ اکثریت کا اتفاق ضروری ہے ،لیکن اس وقت اگرکوئی شخص اپنی ساری توانائیاں اس پر خرچ کرے ،کہ پارلیمنٹ میں دیندارلوگوں کی کثرت ہو،توشاہد اس گناہ سے چھوٹ جائے اوراگراکثریت نہ ہو،تب بھی اپنے بساط کے مطابق کوشش جاری وساری ہو توامید ہے کہ عنداللہ ماخوذ نہ ہو۔

❖ امیدوار کے منتخب ہونے میں بنیاد پارٹی منشور ہے :

6۔۔۔ممبر (MNA...MPA) کے انتخاب میں اس کی دیانت ،خدمت اور عدالت کے ساتھ پارٹی منشور بھی ضروری ہے ،کیونکہ اگر منشور اور موقف سیکولرازم ہو اوریا صرف ایک مخصوص قوم پر سیاست کا دائرہ مرکوز ہو،تو یہ دیانت ،خدمت اور عدالت نہیں ،بلکہ محض لفظوں کی جمع پونجی ہیں ،اس لیے کہ جب بنیادی عقائد اوراسلامی جذبہ سے سرشاری نہ ہو،تو پھر نفس اور شیطان کا حملہ بہرصورت میں شامل حال ہوتاہے۔اور پاکستان کے دستور میں موجوداسلامی دفعات میں ترمیم کاامکان بھی پیدا ہوسکتاہے۔

❖ مذہبی پارٹی کی جیت کے لیے جعلی ووٹ :

7۔۔۔مذہبی پارٹی کو جیتنے کے لیے جعلی ووٹ استعمال کرنادرست نہیں ہے ،بلکہ ترغیب وعظ اور نصیحت کے ذریعے راہ ہموار کی جائے ،اس طرح کرنے سے مذہبی پارٹی پر سوال اٹھے گا ،کہ حق کے دعویدار اپنے کردار میں اتنے کھوکھلے کیوں ہیں ،جس میں وہ جعل سازی سے کام لیتے ہیں۔یہاں تک فقہائے کرام نے اپنا حق کے ضائع ہونے کے باجود صریح جھوٹ کو حرام قرار دیاہے ،بلکہ توریہ کا فتوی دیا ہیں ۔

❖ بلدیاتی انتخابات میں ووٹ دینے کی ترجیحی معیار :

8 .۔۔۔ بلدیاتی انتخابات (LOCAL ELECTION) میں پارٹی منشور دیکھناضروری ہے ،کیونکہ چیئرمین اور کونسلرز کے جیتنے میں وہاں کے پارٹی والے اپنے جھنڈے ،پوسٹرز اوروال چاکنگ کرتے ہیں ،جن سے پارٹی صوبائی اور ملکی سطح پر مضبوط ہوتی ہے اور پھر اپنے غلط مشن کا پرچار کرنے لگتی ہے۔اوراسی طرح قوم پرست ،یا سیکولر پارٹی کا چیئرمین اور کونسلرز اپنے مخصوص حلقے میں ڈھول ،باجے اور گانے اور سرود وغیرہ کا پرچار بھی کرتے ہیں ،جس کا مذہب اجازت نہیں دیتاہے۔

❖ موجودہ سیاسی حالات میں ووٹ کاسٹ کرنا :

9۔۔۔ووٹ بہرحال استعمال کرنا چاہیے ،نیک دیندار اوراسلامی مشن اپنانے والی پارٹیوں کو اپنی قیمتی رائے دینی چاہیے اور ساتھ ساتھ نظام اسلام کے نفاذ اوراسلامی شعار واقدار کے تحفظ کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اوراگر جمہوری طرز سے مسئلہ حل پذیر نہ ہو،توپھر مفتیان کرام ،اکابر ،شیوخ اور مملکت کے دیندار مسلمانوں کے مشورہ سے کوئی بھی ایسالائحہ عمل اپنانا

چاہیے ،جس سے اسلام کو تقویت ملے اسلام بول بالا ہو جائے۔اورالاسلام یعلو ولایعلی کی صدا ایک دفعہ پھر دنیا کے ایوانوں میں گونج اٹھے۔۔۔۔ حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں ۔۔۔ طعنہ دیں گے کفر کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں۔

خلاصہ :

- انتخاب خلیفہ اجتہادی مسئلہ ہے۔
- جمہوریت کی جامع تعریف نہیں ہے۔
- ووٹ اصطلاحی معنی میں شہادت ،وکالت اور یاامانت نہیں ہے ،بلکہ یہ شہادت کی طرح ہے۔
- ووٹ چونکہ عین شہادت نہیں ہے اس کے لیے شہادت (گواہی) کی فضیلت اور وعید استعمال کرنا درست نہیں ہے۔
- ووٹ کو "شہادت تزکیہ سرا" بھی کہا جاسکتا ہے ،کیونکہ ہر ایک امیدوار کے لیے خفیہ رائے استعمال کرتا ہے۔
- وزیر اعظم ،صدر ،وزیر دفاع ،وزیر خارجہ اور وزیر داخلہ وغیرہ اصطلاحات رکھنے میں گنجائش ہیں۔
- کونسلر یا نمائندہ سابقہ ادوار میں بھی تھا۔
- پاکستان دارالاسلام ہے۔
- خاتون وزیر بن سکتی ہے۔
- کافر کی گواہی عندالاحناف بعض صورتوں میں درست ہے۔
- انتظامی امور میں مرد اور خاتون کی گواہی میں فرق نہ کرنے کی گنجائش ہے۔
- وزارت کے لیے دیندار شخص کا انتخاب ضروری ہے۔
- مروجہ جمہوری روایات : جلوس ،مظاہرے ،وہیل جام اور شٹر ڈاؤن ہڑتال (جن سے عام وخاص کو اذیت پہنچتی ہو) شریعت سے متصادم ہیں۔
- جمہوری نظام سے شریعت کا نفاذ نہ ہو سکتی ہوں ،تو مسلمانوں کے لیے قدرت اور طاقت کے ساتھ متبادل نظام کے لیے جدوجہد ضروری ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

شرکت فاسدہ کی مروجہ صورت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیافرماتے ہیں علماء کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں :

زید نے عمرو سے ایک ڈیمپر گاڑی خرید لی اور ڈرائیور (خالد) کو اس طور پر دی 'کہ آپ گاڑی چلاتے رہے 'گاڑی کی جتنی کمائی آتی رہے گی اس سے پندرہ ہزار (15000) آپ بطور تنخواہ لیتے رہے اور جتنے پیسے بچ گئے وہ عمرو (بائع) کو اس کے دین کی آدائیگی کے لئے دیا کرے 'جب آپ گاڑی کی آدھی قیمت آدا کریں گے تو پھر آپ (خالد) میرے (زید) ساتھ شریک ہو جائیں گے 'کل گاڑی میں نصف حصہ آپ کا ہوگا اور نصف میرا ہوگا۔ تو کیا شریعت کی رو سے مذکورہ معاملہ درست ہے؟

الجواب حامداومصليا

سوال میں مذکور معاملہ فقہاء کرام کے نزدیک فاسد ہے۔

صورت مسئولہ شرکت 'مضاربت اوراجارہ میں سے کسی بھی ایک کے تحت نہیں آسکتی ہے 'کیونکہ شرکت دونوں شریکوں کے درمیان معاملہ سرمایہ اور منافع میں منعقد ہوتا ہے جو کہ یہاں نہیں ہے۔

کمافی" التنویر":

"الشركة عبارة عن عقدبين المتشاركين فى الاصل والربح ـ"

(كتاب الشركة :۳/۳۶۴)

اجارہ کی صورت میں بھی فساد لازم آتا ہے۔

"دفع بقرة الى رجل على ان يعلفها ومايكون من اللبن والسمن بينهما انصافا فالاجارةفاسدة ،وعلى صاحب البقرة للرجل اجرقيامه ،وقيمة علفه ان علفها من علف هو ملكه ـ"

(الفتاوى الهندية،كتاب الاجارة،الباب الخامس عشر:5/445)

مضاربہ کی صورت بھی یہاں بن سکتی ہے 'کیونکہ مضاربہ کے لیے ایک طرف سرمایہ جب کہ دوسری طرف سے محنت شرط ہے 'وہ بھی بایں صورت کہ منافع فیصد کے اعتبار سے تقسیم ہو۔ (مثلا: آدھا حصہ 'یاایک تہائی وغیرہ)۔

"(هي) لغة مفاعلة من الضرب في الأرض وهو السير فيها وشرعا(عقد شركة في الربح بمال من جانب رب المال (وعمل من جانب) المضارب."

(الدرالمختار،کتاب المضاربۃ)

اسی طرح ڈرائیور سے یہ کہنا کہ کمائی سے آپ پندرہ ہزار لیتے جائے یہ قفیزالطحان کی صورت بنتی ہے جو ناجائز ہے۔

"صورة قفيز الطحان ان يستأجرمن آخرثورا ليطحن لہ الحنطۃ على ان يكون لصاحبها قفيزمن دقيقها أويستأجرانسان ليطحن لہ الحنطۃ بنصف دقيقهاأوثلثہ أوماأشبہ ذلک فذلک فاسد۔"

(الفتاوى الهنديۃ:كتاب الاجارة ،الباب الخامس عشر،444/ 4)

تاہم اگر کمائی کے ساتھ مقید نہ کیاجائے ،مطلق تنخواہ کا تقرر کیاجائے ،بعد میں اگر کمائی سے دیاجائے تو حرج نہیں ہے۔

کمافی "الفقہ الاسلامی وأدلتہ":

"شركات السيارات: كثيراً ماتنعقد الشركة في ملكية سيارة شاحنة أو صغيرة سياحية أو لنقل الركاب، ويكون بعض الشركاء ملاَّكاً لحصص معينة، وواحد منهم سائق للسيارة وشريك يملك بعض الأسهم معاً، ويتقاضى السائق عادة أجراً أو راتباً شهرياً معيناً، وقد يوافق مالك السيارة على أن يتنازل عن ربعها مثلاً للسائق على أن تسدد قيمة الربع من الأرباح في المستقبل. وهذا كله جائز لتعارف الناس؛ لأن الشركة تنعقد على حسب العادة، وهي مبنية على التوسع والمسامحة، وتنعقد أيضاً على الضمان أو على ذمم الشركاء أو على عملهم، والشركة تنبني على الوكالة أو على الوكالة والكفالة. ويأخذ السائق حصته من الأرباح، كما يتقاضى الأجر المتفق عليه، ولا مانع من أن يكون الأجر مقطوعاً محدداً أو مسمى، أو جزءاً نسبياً من الربح. وقد بينت في بحث شركة المساهمة وشركة التضامن أنه لا مانع شرعاً من اعتبار مدير الشركة أجيراً موظفاً على العمل. ولا مانع من وجود صفتي الشركة والإجارة، في شيء واحد،في رأي المالكية والشافعية قياساً على المزارعة والمساقاة، ولأن المنع من وجود عقدين في عقد أو شرطين في عقد يزول إذا زالت علته أو حكمته وهو عدم إثارة النزاع والجدال، وعدم المنازعات جرى عليه العرف والعادة، فلم يعد الشرط مفسداً، وللناس فيها حاجة."

(الفقہ الاسلامی ،شركات السيارات:۵/۳۰۷۷،ط: رشيديہ كويتہ)

مذکورہ بالاسوال کے مطابق کتاب الفتاوی :

اس طریقہ کو بعض فقہاء نے جائز قرار دیاہے کہ ڈرائیورکچھ عرصہ گاڑی چلاکرپھرمالک اس کو گاڑی میں چوتھے حصہ کا مالک اورشریک ٹھہراسکتاہے۔۔۔البتہ اس کے لیے معمولی سی تنخواہ مقرر ہو،تاکہ قفیزالطحان میں داخل نہ ہوجائے۔

(کتاب الفتاوی : باب شرکت الفاسدۃ : 3/194)

اس کا آسان طریقہ گاڑی کا مالک ڈرائیور کو شروع ہی سے اپنا شریک بنادے باین طور کہ آدھاحصہ قسطوں پر بیچ دے اور قسطوں کی آدائیگی کے لیے ایک معین تاریخ مقرر کردے ،اس سے ڈرائیوراورمالک کے درمیان شرکت قائم ہوجائے گی

،اس کے بعد مالک ڈرائیور سے کہے : کہ اب آپ گاڑی کو چلاتے رہے 'مثلا: کل منافع میں سے 55 فیصد ڈرائیور کے ہوں گے اور 45 فیصد مالک کے ہوں گے۔ یا پھر ڈرائیور کے لیے باقاعدہ ایک مناسب تنخواہ مقرر کیا جائے۔

کمافی "فقہ البیوع ":

"ویجب لصحتہ أن یکون الأجل معلوما ،فان کان الأجل فیہ الجہالۃ تفضی الی النزاع فسدالبیع---ولانعلم فی اشتراط العلم فی الجملۃ اختلافافأما کیفیتہ فانہ یحتاج أن یعلمہ بزمان بعینہ لایختلف ـ"

(١/٥٣٨،البیع المؤجل ط:معارف القرآن)

وقال "العلامۃ الشامی رحمہ اللہ" :

"لانہ بالبیع صار بینہما شرکۃ ملک حتی لایجوز لأحدہما أن یتصرف فی نصیب الأخر ثم بالعقد بعدہ صارت شرکۃ عقد ،فیجوزلکل منہما التصرف۔"

(ردالمحتار:کتاب الشرکۃ : ٦/٤٧٦،ط: رشیدیہ)

یادرہے : شریک کواجیر بنانادرست ہے۔

(احسن الفتاویٰ : کتاب الاجارہ : ٧/٣٢١ 'ط : ایچ ایم سعید)

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- مزارعت کی شرعی حیثیت
- مزارعت میں زمین پر ہل چلانے کا خرچہ
- مزارعت میں ندی اور نالے وغیرہ کا خرچہ مزدور پر
- مزارعت میں کسی ایک پر خرچہ کی شرط لگانا
- مزارعت میں پانی کا حصہ مقرر کرنا

’’(و) اعلم أن (نفقة الزرع) مطلقا بعد مضي مدة المزارعة (عليهما بقدر الحصص) وأما قبل مضيها فكل عمل قبا انتهاء الزرع كنفقة بذر ومؤنة حفظ وكري نهر على العامل ولو بلا شرط فإذا تناهى بقي مالا مشتركا بينهما فتجب عليهما مؤنته كحصاد ودياس كذا حرره المصنف وحمل عليه أصل صدر الشريعة فليحفظ(فإن شرطاه على العامل فسدت) كما لو شرطاه على رب الأرض (بخلاف ما لومات رب الأرض۔۔‘‘

(شامية:كتاب المزارعہ)

’’ (وصح اشتراط العمل) كحصاد ودياس ونسف على العامل (عند الثاني للتعامل وهو الأصح) وعليه الفتوى

(شامية:كتاب المزارعہ)

’’ومنها شرط التبن لمن لم يكن البذر من قبله ومنها أن يشترط صاحب الأرض على المزارع عملا يبقى أثره ومنفعته بعد مدة المزارعة كبناء الحائط والشرفة واستحداث حفر النهر ورفع المسناة ونحو ذلك مما يبقى أثره ومنفعته إلى ما بعد انقضاء المدة وأما الكراب فإن شرطاهفي العقد مطلقا عن صفةالتثنية قال عامتهم: لا تفسد المزارعة وهوالصحيح وإن شرطاه مع التثنية فسدت المزارعة لأن التثنية إما أن تكون عبارة عن الكرابمرتين مرة للزراعة ومرة بعد الحصاد ليرد الأرض على صاحبها مكروبة وهذا شرط مفسدلا شك فيه لأن الكراب بعد الحصاد ليس من عمل هذه السنة وإما أن تكون عبارة عنا لكراب مرتين قبل الزراعة فإنه عمل يبقى أثره ومنفعته إلى ما بعد المدة فكان مفسدا حتى لو كان في موضع لا تبقى منفعته لا تفسد. ‘‘

(الهندية:شرعية المزارعة وتفسيرها)

’’ (وكذا) صحت (لو كان الأرض والبذر لزيد والبقر والعمل للآخر) أو الأرض له والباقي للآخر(أو العمل له والباقي للآخر) فهذه الثلاثة جائزة (وبطلت) في أربعة أوجه (لو كان الأرض والبقر لزيد أو البقر والبذر له والآخران للآخر) أو البقر أو البذر له (والباقي للآخر) فهي بالتقسيم العقلي سبعة أوجه لأنه إذا كان من أحدهما أحدها والثلاثة من الآخر فهي أربعة وإذا كان من أحدهما اثنان واثنان من الآخر فهي ثلاثة ومتى دخل ثالث فأكثر بحصة فسدت وإذا صحت فالخارج على الشرط ولا شيء للعامل إن لم يخرج شيء‘‘

(الشامية،كتاب المزارعة)

<u>حیقیقت مزارعہ :</u>

مزارعت شروع میں اجارہ کی حیثیت سے منعقد ہوجاتی ہے‘اورآخر میں شرکت کی صورت اختیار کرجاتی ہے۔

اوردوسری بات یہ ہے:کہ مزارعت میں چارعناصرہوتے ہیں :زمین ۔بیج ۔جوتنے کا آلہ (جانوریامشین اورٹریکٹروغیرہ)۔کاشتکار۔

اجارہ کے لیے ضروری ہے کہ عوض لے کر منفعت کا مالک بنایا جائے۔اس لیے اجارہ کا معنی وہاں پورا ہوگا'جہاں عقد بالذات زمین یا عامل کے منافع پر واقع ہو۔

صرف بیج 'یا جوتنے کے آلہ پر مزارعت منعقد نہ ہوگی' مگر یہ یہ چیزیں تبعاملائی جائیں۔

ان اصولی نکات کی بناپر درجہ ذیل صورتیں درست ہیں :

نمبر شمار	مالک زمین کی طرف سے	کاشت کار کی طرف سے	حکم
۱	زمین 'بیج 'آلہ کاشت	عمل	جائز
2	زمین 'بیج	عمل 'آلہ کاشت	جائز
۳	زمین	بیج 'عمل 'آلہ کاشت	جائز
۴	زمین 'آلہ کاشت	عمل 'بیج	ناجائز عندابی یوسفؒ جائز
۵	زمین 'عمل	بیج 'آلہ کاشت	ناجائز عندابی یوسفؒ جائز
۶	زمین 'عمل 'آلہ کاشت	بیج	ناجائز عندابی یوسفؒ جائز
۷	زمین 'بیج 'عمل	آلہ کاشت	ناجائز عندابی یوسفؒ جائز

''أحدهما أن تكون الأرض لأحدهما والثاني أن تكون الأرض لهما فإن كانت الأرض لأحدهما فهو على وجهين: أحدهما أن يكون البذر من أحدهما، والثاني أن يكون البذر منهما فإن كانت الأرض لأحدهما والبذر من أحدهما فهو على ستة وجوه: ثلاثة منها جائزة وثلاثة منها فاسدة أما الثلاثة الأول: فأحدها أن تكون الأرض من أحدهما والبذر والبقر والعمل من الآخر وشرطا لصاحب الأرض شيئا معلوما من الخارج جاز لأن صاحب البذر يكون مستأجرا الأرض بشيء معلوم من الخارج.والثاني أن يكون العمل من أحدهما والباقي من الآخر فهو جائز؛ لأن صاحب البذر يصير مستأجرا للعامل بشيء معلوم من الخارج ليعمل في أرضه ببقره وبذره، والثالث أن تكون الأرض والبذر من أحدهما والعمل والبقر من الآخر فذلك جائز لأن

صاحب الأرض يصير مستأجرا للعامل ليعمل العامل ببقره لصاحب الأرض رو البذر وأما الثلاثة الفاسدة فأحدها أن تكون الأرض والبقر من أحدهما والباقي من الآخرفذلك فاسد وعن أبي يوسف - رحمه الله تعالى - أنه يجوز لمكان العرف والفتوى على ظاهر الرواية لأن منفعة الأرض لا تجانس منفعة البقر فإن منفعة الأرض إنبات البذرةلقوة في طبعها ومنفعة البقر العمل.فإن لم تكن منفعة البقر من جنس منفعة الأرض لا يكون البقر تبعا للأرض فيبقى استئجار البقر مقصودا بشيء من الخارج وذلك فاسد كما لو كان لأحدهما البقر فقط والثاني أن يكون البذر من أحدهما والباقي من الآخر وذلك فاسد لأن صاحب البذر يصير مستأجرا الأرض فلا بد من التخلية بينه وبين الأرض وهي في يد العامل لا في يد صاحب البذر وعلى هذا لو اشترك ثلاثة أو أربعة ومن البعض البقر وحده أو البذر وحده كان فاسدا والثالث أن يكون البذر والبقر من واحد والعمل والأرض من الآخر وإنه فاسد هذا إذا كانت الأرضلأحدهما والبذر من أحدهما. ''

(الباب الثانی فی بیان انواع المزارعة)

- مزارعت (بٹائی سسٹم) میں جس عمل کا تعلق فصل کے پکنے کے زمانہ تک ہو، وہ کاشتکار کا ذمہ ہے۔
- اور جن امور کا تعلق فصل پر ہونے والے اخراجات کے ساتھ ہو، جیسے: کھاد آبیانہ، فصل کی کٹائی اور تھریش وغیرہ۔یہ تمام اخراجات مالک زمین اور کاشتکار پر حصوں کے تناسب سے تقسیم ہوں گے۔
- کھیتی سے متعلق اخراجات، جیسے: کھاد، کٹائی، بار برداری، وغیرہ کے اخراجات دونوں کے فریق اپنے حصے کے تناسب سے برداشت کریں گے۔
- پیداوار کی صورت میں مالک زمین اور کاشتکار کو تناسب کے مطابق حصے ملیں گے،البتہ اگر پیداوار نہ ہو، تو دونوں کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔
- زمین کو ہموار کرنا، ندی، نالوں کی تعمیر کرنے سے اگر کاشتکار انکار کرے، تو کرنے پر مجبور کیا جائیگا۔
- بیج مالک زمین ، یا کاشتکار میں سے کسی کا بھی ذمہ لینا درست ہے، تاہم اگر تخم میں شرکت کی شرط لگائی گئی، تومزارعت فاسدہ ہوگی۔اس وقت پیداوار برابر تقسیم ہوگی، مزید کاشتکار کے لیے کوئی اجرت نہ ہوگی،البتہ کسان کے ذمہ زمین کی مزدوری دینی لازم ہوگی۔
- تاہم اگر بیج مشترکہ ہونے کے ساتھ عمل بھی دونوں مشترک کریں، بایں صورت کہ یاتو خود زمیندار عمل کرے، یا کسی مزدور کو کسان کے ساتھ کردے، تومعاملہ درست ہوگا اور یا کاشتکار کو اپنے حصہ کی اجرت مثل (مزدور کا خرچہ) دیدے، تب بھی معاملہ درست رہے گا۔
- بیج مالک زمین کے پر ہو اور ٹریکٹر، پانی ،اور تھریشر، کھادوغیرہ کا خرچہ دوسرے شخص کے ذمہ ہوتو، تب بھی عقدمزارعت درست رہے گا۔

یادرہے:

- مزارعت انتہاء کے اعتبار سے شرکت ہے، جن چیزوں سے شرکت فاسد ہوتی ہے، انہی چیزوں سے مزارعت فاسد ہوتی ہے۔
- لہٰذا ایک کا غلہ لینا اور دوسرے کا بھوسہ لینا درست نہیں ہے۔
- ایک شخص کا صرف پانی ہو اور پانی کا حصہ اپنے لیے متعین کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ عقد مزارعت زمین اور محنت پر پورا ہوتا ہے۔
- لہٰذا پانی والے کے لیے فصل کا خرچہ برداشت کرنا اور برداشت نہ کرنا، دونوں صورتیں درست نہیں ہیں۔ تاہم اگر پانی کی اجرت متعین کرے، مثلا: ایک دفعہ کھیت سیراب کرنے پر معلوم اجرت مقرر کرے، تو معاملہ درست ہوگا۔

تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل عربی عبارتیں:

''وَلَوْ دَفَعَ الْمُزَارِعُ الْأَرْضَ إلَى غَيْرِهِ عَارِيَّةً لِيَزْرَعَهَا لِنَفْسِهِ كَانَتْ الْإِعَارَةُ جَائِزَةً، وَإِذَا زَرَعَهَاالْمُسْتَعِيرُ سَلَّمَ الْخَارِجَ لَهُ، وَيَغْرَمُ الْمُزَارِعُ الْأَوَّلُ لِرَبِّ الْأَرْضِ أَجْرَ مِثْلِ جَمِيعِ الْأَرْضِ وَلَوْ كَانَالْبَذْرُ مِنْ رَبِّ الْأَرْضِ لَيْسَ لَهُ أَنْ يَدْفَعَ إلَى آخَرَ مُزَارَعَةً لَكِنْ لَهُ أَنْ يَسْتَأْجِرَ الْأُجَرَاءَ بِمَالِهِفَلَوْ دَفَعَ مَعَ هَذَا مُزَارَعَةً مِنْ غَيْرِ إذْنِ رَبِّ الْأَرْضِ فَالْمُزَارَعَةُ جَائِزَةٌ بَيْنَ الْمُزَارِعِ الْأَوَّلِ وَالثَّانِي،وَالْخَارِجُ بَيْنَهُمَا عَلَى مَا شَرَطَا، وَلَا شَيْءَ لِرَبِّ الْأَرْضِ، وَ لِرَبِّ الْأَرْضِ وَالْبَذْرِ أَنْ يُضَمِّنَ بَذْرَهُ أَيَّهُمَاشَاءَ إنْ ضَمَّنَ الْأَوَّلَ لَا يَرْجِعُ عَلَى الثَّانِي، وَإِنْ ضَمَّنَ الثَّانِي رَجَعَ عَلَى الْأَوَّلِ فَإِنْ انْتَقَصَتْ الْأَرْضُ ضَمَّنَ النُّقْصَانَ الثَّانِيَ بِالْإِجْمَاعِ، وَلَيْسَ لَهُ أَنْ يُضَمِّنَ الْأَوَّلَ عِنْدَ أَبِي حَنِيفَةَ وَأَبِي يُوسُفَ عَلَى الْقَوْلِ الْآخَرِ. هَذَا إذَا لَمْ يَأْذَنْ لَهُ رَبُّ الْأَرْضِ أَمَّا إذَا أَذِنَ لَهُ فِي ذَلِكَ إمَّا نَصًّا أَوْ دَلَالَةً بِأَنْ قَالَهُ اعْمَلْ فِيهِ بِرَأْيِك فَدَفَعَ لِعَامِلٍ آخَرَ مُعَامَلَةً فَعَمِلَ فِيهِ فَمَا خَرَجَ فَهُوَ لِصَاحِبِ النَّخِيلِ،وَلِلْعَامِلِ أَجْرُ الْمِثْلِ عَلَى الْعَامِلِ الْأَوَّلِ. وَلَوْ هَلَكَ الثَّمَرُ فِي يَدِ الْعَامِلِ الْآخَرِ مِنْ غَيْرِ عَمَلِهِ، وَ هُوَعَلَى رُءُوسِ النَّخِيلِ لَا يَضْمَنُ، وَإِنْ هَلَكَ الثَّمَرُ مِنْ عَمَلِ الْآخَرِ فِي أَمْرٍ خَالَفَ فِيهِ الْآمِرَ الْأَوَّلَ فَالضَّمَانُ لِصَاحِبِ النَّخِيلِ عَلَى الْعَامِلِ الْأَخِيرِ، وَلَا يَضْمَنُ الْعَامِلُ الْأَوَّلُ. ''

(مجمع الضمانات:باب فی المزارعۃ والمساقا ت والشرب:ج۲،ص۳۲۲)

''إذَا مَاتَ رَبُّ الْأَرْضِ بَعْدَمَا نَبَتَ الزَّرْعُ قَبْلَ أَنْ يُسْتَحْصَدَ، وَالْبَذْرُ مِنْ الْمُزَارِعِ يَبْقَىالْعَقْدُ إلَى أَنْ يُسْتَحْصَدَ الزَّرْعُ اسْتِحْسَانًا. هَذَا إذَا قَالَ الْمُزَارِعُ أَنَا لَا أَقْلَعُ الزَّرْعَ، وَإِنْ رَضِيَ الْمُزَارِعُ بِقَلْعِ الزَّرْعِ فَإِنَّهُ لَا يَبْقَى عَقْدُ الْمُزَارَعَةِ، وَإِذَا اخْتَارَ الْمُزَارِعُ الْقَلْعَ فَلِوَرَثَةِرَبِّ الْأَرْضِ خِيَارَاتٌ ثَلَاثٌ، إنْ شَاءُوا قَلَعُوا الزَّرْعَ وَالْمَقْلُوعُ بَيْنَهُمْ، وَإِنْ شَاءُوا أَنْفَقُوا عَلَى الزَّرْعِ بِأَمْرِ الْقَاضِي حَتَّى يَرْجِعُوا عَلَى الْمُزَارِعِ بِجَمِيعِ النَّفَقَةِ، وَإِنْ شَاءُوا غَرِمُوا حِصَّةَ الْمُزَارِعِ مِنْ الزَّرْعِ وَالزَّرْعُ لَهُمْ، فَإِنْ مَاتَ بَعْدَ الْمُزَارَعَةِ قَبْلَ النَّبَاتِ اخْتَلَفَ الْمَشَايِخُ فِيهِ، وَلَوْ لَمْ يَمُتْ لَكِنَّ الْمُزَارِعَ أَخَّرَ الزِّرَاعَةَ حَتَّى انْقَضَتْ السَّنَةُ وَالزَّرْعُ بَقْلٌ فَأَرَادَ رَبُّ الْأَرْضِ أَنْ يَقْلَعَ الزَّرْعَ، وَأَبَى الْمُزَارِعُ لَيْسَ لِرَبِّ الْأَرْضِ أَنْ يَقْلَعَ، وَيَثْبُتُ بَيْنَهُمَا إجَارَةٌ فِي نِصْفِ السَّنَةِ حَتَّى يُسْتَحْصَدَ، وَالْعَمَلُ بَيْنَهُمَا

نِصْفَانِ حَتَّى يُسْتَحْصَدَ، وَهَذَا إذَا لَمْ يُرِدْ الْمُزَارِعُ الْقَلْعَ فَإِنْ أَرَادَ الْقَلْعَ فَلِرَبِّ الْأَرْضِ خِيَارَاتٌ ثَلَاثٌ عَلَى مَا ذَكَرْنَا، وَإِذَا أَنْفَقَ بَعْدَ انْتِهَاءِ الْمُدَّةِ بِأَمْرِ الْقَاضِي رَجَعَ عَلَى الْمُزَارِعِ بِنِصْفِ النَّفَقَةِ. وَلَوْ انْقَضَتْ مُدَّةُ الْمُعَامَلَةِ، وَالثَّمَرُ لَمْ يُدْرِكْ، وَأَبَى الْعَامِلُ الصَّرْمَ فَإِنَّهُ يُتْرَكُ فِي يَدِهِ بِغَيْرِ إجَارَةٍ.----

إذَا هَرَبَ الْمُزَارِعُ فِي وَسَطِ السَّنَةِ، وَالزَّرْعُ بَقْلٌ فَأَنْفَقَ عَلَيْهِ رَبُّ الْأَرْضِ حَتَّى اسْتَحْصَدَ يَرْجِعُ عَلَى الْعَامِلِ بِمَا أَنْفَقَ بَالِغًا مَا بَلَغَ، وَالْقَوْلُ قَوْلُ الْمُزَارِعِ فِي قَدْرِ النَّفَقَةِ مَعَ يَمِينِهِ عَلَى عِلْمِهِ. ''

(مجمع الضمانات:باب فی المزارعۃ والمساقا ت والشرب:ج۲،ص۳۲۲)

''لَوْ دَفَعَ أَرْضًا وَبَذْرًا مُزَارِعَةً بِالنِّصْفِ فَزَرَعَ الْعَامِلُ فَنَبَتَ أَوْ لَمْ يَنْبُتْ ثُمَّ سَقَاهُ وَقَامَ عَلَيْهِ رَبُّ الْأَرْضِ حَتَّى اسْتَحْصَدَ بِغَيْرِ أَمْرِ الْمُزَارِعِ يَكُونُ الْخَارِجُ بَيْنَ رَبِّ الْأَرْضِ وَالْمُزَارِعِ وَلَوْ لَمْ يَزْرَعْ حَتَّى زَرَعَهُ رَبُّ الْأَرْضِ وَسَقَاهُ حَتَّى نَبَتَ ثُمَّ قَامَ عَلَيْهِ الْمُزَارِعُ حَتَّى اسْتَحْصَدَ فَالْخَارِجُ لِرَبِّ الْأَرْضِ، وَالْمُزَارِعُ مُتَطَوِّعٌ لِأَنَّ رَبَّ الْأَرْضِ بِالتَّدْبِيرِ وَالسَّقْيِ صَارَ مُسْتَرِدًّا لِلْبَذْرِ،وَنَاقِضًا لِلْمُزَارَعَةِ فَانْتَقَضَتْ حُكْمًا لِعَمَلِهِ لَا قَصْدًا كَرَبِّ الْمَالِ إذَا أَخَذَ رَأْسَ الْمَالِ بِغَيْرِ إذْنِ الْمُضَارِبِ، وَتَصَرَّفَ فِيهِ وَرَبِحَ، صَارَ نَاقِضًا لِلْمُضَارَبَةِ، وَلَوْ لَمْ يَسْقِهِ، وَلَمْ يَنْبُتْ فَسَقَاهُ الْمُزَارِعُ وَقَامَ عَلَيْهِ حَتَّى اسْتَحْصَدَ فَالْخَارِجُ نِصْفَانِ لِأَنَّ سَقْيَ الْمَزَارِعِ حَصَلَ بِإِذْنِ رَبِّ الْأَرْضِ فَلَا يَصِيرُ نَاسِخًا لِلْمُزَارَعَةِ السَّابِقَةِ فَوَقَعَ عَمَلُهُ عَلَى الْمُزَارَعَةِ فَنَبَتَ الزَّرْعُ مُشْتَرَكًابَيْنَهُمَا، وَرَبُّ الْأَرْضِ لَا يَصِيرُ نَاسِخًا لِلْمُزَارَعَةِ بِالْبَذْرِ بِدُونِ السَّقْيِ بِغَيْرِ أَمْرِ الْعَامِلِ لِأَنَّهُ غَائِبٌ،وَفَسْخُ الْعَقْدِ حَالَ غَيْبَةِ الْمُزَارِعِ لَا يَصِحُّ قَصْدًا، وَدَلَالَةً كَمَا فِي الْوَكِيلِ بِالْبَيْعِ، وَلَوْ كَانَ الْبَذْرُ مِنْ قِبَلِ الْمُزَارِعِ فَبَذَرَ، وَلَمْ يَسْقِ، وَلَمْ يَنْبُتْ حَتَّى سَقَاهُ رَبُّ الْأَرْضِ وَقَامَ عَلَيْهِ حَتَّى اسْتَحْصَدَ أَوْ بَذَرَهُ رَبُّ الْأَرْضِ، وَلَمْ يَنْبُتْ، وَلَمْ يَسْقِهِ حَتَّى سَقَاهُ الْمُزَارِعُ وَقَامَ عَلَيْهِ فَالْخَارِجُ بَيْنَهُمَا، وَلَوْ كَانَ رَبُّ الْأَرْضِ بَذَرَهُ وَسَقَاهُ حَتَّى نَبَتَ ثُمَّ قَامَ عَلَيْهِ الْمُزَارِعُ وَسَقَاهُ فَهُوَ لِرَبِّ الْأَرْضِ، وَيَضْمَنُ الْبَذْرَ، وَالْمُزَارِعُ مُتَطَوِّعٌ فِي سَقْيِهِ، وَخُرُوجُ الطَّلْعِ فِي النَّخْلِ كَخُرُوجِ الزَّرْعِ وَنَبَاتِهِ فِي الْمُزَارَعَةِ حَتَّى لَوْ سَقَى صَاحِبُ النَّخْلِ نَخْلَهُ بِغَيْرِ أَمْرِ الْعَامِلِ وَقَامَ عَلَيْهِ حَتَّى طَلَعَ طَلْعُهُ ثُمَّ سَقَاهُ الْعَامِلُ وَقَامَ عَلَيْهِ حَتَّى صَارَ تَمْرًا فَجَمِيعُ ذَلِكَلِصَاحِبِ النَّخْلِ. ''

(مجمع الضمانات:باب فی المزارعۃ والمساقا ت والشرب:ج۲،ص۳۲۲)

''ومنها أن يشترط صاحب الأرض على المزارع عملا يبقى أثره ومنفعته بعد مدة المزارعة كبناءالحائط والشرفة واستحداث حفر النهر ورفع المسناة ونحو ذلك مما يبقى أثره ومنفعته إلى ما بعد انقضاء المدة وأما الكراب فإن شرطاه في العقد مطلقا عن صفة التثنية قال عامتهم:لا تفسد المزارعة وهو الصحيح وإن شرطاه مع التثنيةفسدت المزارعة لأن التثنية إما أن تكون عبارة عن الكراب مرتين مرة للزراعة ومرة بعد الحصاد ليرد الأرض على صاحبها مكروبة وهذاشرط مفسد لا شك فيه لأن الكراب بعد الحصاد ليس من عمل هذه السنة وإما أن تكون عبارة عن الكراب مرتين قبل الزراعة فإنه عمل يبقى أثره ومنفعته إلى ما بعد المدة فكان مفسدا حتى لو كان في موضع لا تبقى منفعته لا تفسد. ''

(الفتاوى الهندية:الباب الاول شرعية المزارعة وتفسيرها)

'' (وأما) (أحكامها) منها أن كل ما كان من عمل المزارعة مما يحتاج الزرع إليه لإصلاحه فعلى المزارع وكل ما كان من باب النفقة على الزرع من السرقين وقلع الحشاوة ونحو ذلك فعليهما على قدر حقهما وكذلك الحصاد والحمل إلى البيدر والدياس۔''

(الفتاوى الهندية:الباب الاول شرعية المزارعة وتفسيرها)

’’ومنها ولاية جبر المزارع على الكراب وعدمها وهذا على وجهين: إما أن شرطا الكراب في العقدأو سكتا عن شرطه فإن شرطاه يجبر عليه وإن سكتا عنه ينظر إن كانت الأرض مما تخرج الزرع بدون الكراب زرعا معتادا يقصد مثله في عرف الناس لا يجبر المزارع عليه وإن كانت لا تخرج أصلا أو تخرج شيئا قليلا لا يقصد مثله بالعمل يجبر على الكراب۔‘‘

الفتاوی الهندية:الباب الاول شرعية المزارعة وتفسيرها)

’’فإن كانت الأرض لأحدهما وشرطا أن يكون البذر منهما إن شرطا العمل على غير صاحب الأرض وشرطا أن يكون الخارج بينهما نصفين كانت فاسدة لأن صاحب الأرض يصير قائلا للعامل: ازرع أرضي ببذري على أن يكون الخارج كله لي وازرع ببذرك على أن يكون الخارج كله لك كان فاسدا لأن هذه مزارعة بجميع الخارج بشرط إعارة نصف الأرض من العامل وكذلك لو شرطا أن يكون الخارج بينهما أثلاثا ثلثاه للعامل وثلثه لصاحب الأرض أو على العكس كان فاسدا لأن فيه إعارة الأرض. وإذا فسدت المزارعة كان الخارج بينهما على قدر بذرهما ويسلم لصاحب الأرض ما أخذ من الخارج لأنه نماء ملكه حصل في أرضه وله على الآخر أجر مثل نصف الأرض لأن الآخر استوفى منفعة أرضه بعقد فاسد وما أخذ من الخارج يطيب له مقدار بذره ويرفع من الباقي أجر نصف الأرض وما أنفق أيضا. ‘‘

(الباب الثانی فی بيان انواع المزارعة)

’’ولو كانت الأرض والبذر منهما وشرطا العمل عليهما على أن يكون الخارج بينهما نصفين جاز لأن كل واحد منهما عامل في نصف الأرض ببذره فكانت هذه إعارة نصف الأرض لا بشرط العمل له۔‘‘

(الباب الثانی فی بيان انواع المزارعة)

’’ولو كانت الأرض والبذر منهما وشرطا العمل على أحدهما على أن يكون الخارج بينهما نصفين جاز ويكون غير العامل مستعينا في نصيبه۔‘‘

(الباب الثانی فی بيان انواع المزارعة)

’’ولو كانت الأرض والبذر منهما وشرطا للدافع ثلث الخارج والثلثين للعامل لا يجوز في أصح الروايتين لأن الخارج نماء بذرهما فإذا كان البذر منهما كان الخارج مشتركا بينهما فصاحب الثلثين إنما يأخذ الزيادة بحكم العمل ومن عمل في محل مشترك لا يستوجب الأجر۔۔‘‘

(الباب الثانی فی بيان انواع المزارعة)

’’وحكي عن القاضي الإمام عبد الواحد أنه قال: إن شرط على المزارع جاز من أيهما كان البذر وإن شرط على رب الأرض إن كان البذر من العامل لا يجوز كما لو شرط الكراب على رب الأرض والبذر من المزارع وإن كان البذر من رب الأرض يجوز كذا في الخلاصة. ‘‘

(الباب الثالث فی المشروط فی المزارعة)

’’إذا شرط رب الأرض والبذر من المزارع أن يسرقنها قيل: تفسد المزارعة عند المتقدمين ولا تفسد عند المتأخرين والفتوى على قول المتأخرين قال الخجندي وعزيز بن أبي سعيدكذا في جواهر الأخلاطي. ‘‘

(الباب الثالث فی المشروط فی المزارعة)

’’ولو شرط الدولاب والدالية على أحدهما فهو كاشتراط البقر على أحدهما لأن الداليةوالدولاب آلة السقي والسقي على المزارع فإن كان مشروطا على المزارع فهي جائزة من أيهما كان البذر، وإن كان مشروطا على رب الأرض والبذر من العامل فهي فاسدة، وإن كان البذر من رب الأرض فهي جائزة كما في اشتراط البقر، فأما إذا شرط الدابة التي يستقى بها مع العلف على أحدهما فإن شرط الدابة مع العلف على المزارع جازت من أيهما كان البذر كما في اشتراط البقر وإن شرط ذلك على رب الأرض فإن كان البذر من قبل المزارع فهي فاسدة وإن كان البذر من قبل رب الأرض فهي جائزة كما في اشتراط البقر وأما إذا شرطت الدابة على أحدهما والعلف على غير صاحبها فهي فاسدة كذافي محيط السرخسي. ‘‘

(الباب الثالث فی المشروط فی المزارعۃ)

’’ (ومنها) : أن يشترك جماعة من أحدهم الأرض ومن الآخر البقر ومن الآخر البذر ومن الرابع العمل، وهذا لا يجوز؛ أيضا لما مر، وفي عين هذا ورد الخبر بالفساد، فإنه روي أن أربعة نفر اشتركوا على عهد رسول الله - ﷺ -على هذا الوجه فأبطل رسول الله - ﷺ -مزارعتهم، وعلى قياس ما روي عن أبي يوسف يجوز.‘‘

(بدائع الصنائع:فصل فی بیان انواع المزارعۃ)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- شہر یا بڑی بستی (قریہ کبیرہ) سے کتنے دور رہنے والوں پر نماز جمعہ کے لیے شرکت لازمی ہے۔؟
- شہر یا بڑی بستی سے کتنے دور رہنے والے عید کی نماز سے قبل قربانی کر سکتے ہیں؟
- فنائے مصر کی شرعی حد کیا ہے؟
- کیا فنائے مصر کا شہر سے متصل ہونا ضروری ہے؟
- اگر عرف اور حکومت کی طرف سے متعین کردہ حدود میں تعارض ہو، تو ترجیح کس کو دی جائے گی؟
- کیا جمعہ کی نماز فرض ہے، یا واجب اور سنت ہے؟
- نماز جمعہ کی شرائط کیا ہیں؟
- ضروریات زندگی سے کیا مراد ہے؟
- مسافر یا دیہاتی کا جمعہ کے زوال کے بعد شہر میں حاضر ہونا۔
- کیا قریہ کبیرہ کے لیے بھی فناء ہے؟
- جمعہ واجب نہ ہونے کے باوجود نماز جمعہ پڑھنا۔
- کیا اقامت جمعہ کے لیے خلیفہ کا ہونا ضروری ہے؟

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

- شہر یا بڑی بستی (قریہ کبیرہ) سے کتنے دور رہنے والوں پر نماز جمعہ کے لیے شرکت لازمی ہے۔؟
- شہر یا بڑی بستی سے کتنے دور رہنے والے عید کی نماز سے قبل قربانی کر سکتے ہیں؟
- فنائے مصر کی شرعی حد کیا ہے؟
- کیا فنائے مصر کا شہر سے متصل ہونا ضروری ہے؟
- اگر عرف اور حکومت کی طرف سے متعین کردہ حدود میں تعارض ہو، تو ترجیح کس کو دی جائے گی؟
- کیا جمعہ کی نماز فرض ہے، یا واجب اور سنت ہے؟
- نماز جمعہ کی شرائط کیا ہیں؟
- ضروریات زندگی سے کیا مراد ہے؟
- مسافر یا دیہاتی کا جمعہ کے زوال کے بعد شہر میں حاضر ہونا۔
- کیا قریہ کبیرہ کے لیے بھی فناء ہے؟
- جمعہ واجب نہ ہونے کے باوجود نماز جمعہ پڑھنا۔
- کیا اقامت جمعہ کے لیے خلیفہ کا ہونا ضروری ہے؟
- جمعہ کے جائز اور واجب ہونے میں فرق۔

نماز جمعہ میں شرکت :

امام شافعیؒ وابو یوسفؒ: اَلْجُمُعَۃُ عَلَی مَنْ آوَاہُ اللَّیْلُ ۔ یعنی جو جمعہ اداء کرنے کے بعد رات سے پہلے پہلے اپنے گھر واپس پہنچ سکے اُس پر جمعہ میں حاضر ہونا لازم ہے۔ مالکیہ و حنابلہ : جس کو اذانِ جمعہ سنائی دیتی ہو اُس پر جمعہ میں حاضر ہونا لازم ہے۔ امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی نقل کیا گیا ہے۔ (درسِ ترمذی : 265/2) امام ابو حنیفہؒ : فناءِ مصر۔ یعنی شہر کی ضروریات جہاں تک پوری ہوتی ہیں۔

اب کس قول کو ترجیح دی جائے کتابوں کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے نزدیک نماز جمعہ اور عیدین چار جگہوں میں واجب ہیں: شہر (مصر)۔ فنائے مصر۔ بڑی بستی جہاں ضرورت کی چیزیں میسر ہوں۔ وہ بستی جہاں انسانی آبادی تقریباً تین ہزار پر مشتمل ہو۔ اگر مذکورہ بالا چار جگہوں میں سے علاوہ رہنے والے ہو تو ان پر جمعہ اور عیدین کی نماز واجب نہیں ہے۔ چاہے وہاں آذان پہنچتی ہو، یا وہاں کے لوگ اسی شہر و فناء شہر سے ضرورتیں پوری کرتا ہو اور یا وہاں کے لوگ نماز جمعہ کی نماز پڑھ کر باسانی گھر پہنچ سکتے ہوں۔ اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

"لایعمل بما قیل الخ قال فی الشرح قد علمت بنص الحدیث والا ثرو الروایۃ عن ائمتنا ابی حنیفۃ وصا حبیہ واختیار المحققین من اھل الترجیح انہ لا عبرۃ ببلو غ الند اء ولا بالغلوۃ والا میال وانہ لیس بشیئی فلا علیک من مخالفۃ غیرہ وان ذکر تصحیحہ فمنہ مافی البدائع انہ ان امکن ان یحضر الجمعۃویبیت باھلہ من غیر تکلف یجب علیہ الخ ای لان من جاوز ھذا الحد بنیۃ السفر کان مسافراً فلووجبت ثمہ لوجبت علیٰ المسافر و ھو خلاف النص۔"

(طحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۲۹۳۔۲۹۳)

"وفناء المصر ہو الموضع المعد لمصالح المصر متصل بہ ومن کان مقیما في عمران المصر وأطرافہ ولیس بین ذلک الموضع وبین المصر فرجۃ فعلیہ الجمعۃ، ولو کان بین ذلک الموضع وبین عمران المصر فرجۃ من مزارع ومذارعٍ کالقلع ببخاري لاجمعۃ علی أہل ذلک الموضع وإن سمعوا النداء والغلوۃ والمیل والأمیال لیس بشرط رويَ الفقیہ أبوجعفرؒ، ہذا عن أبي حنیفۃؒ، وأبي یوسفؒ وہو اختیار شمس الأئمۃ الحلوائي۔ "

(خلاصۃ الفتاوی، کتاب الصلاۃ، الفصل الثالث والعشرون في صلاۃ الجمعۃ)

بڑی آبادی سے ملحق علاقوں (جنہیں اصطلاح میں فناء شہر کہاجاتاہے) میں جمعہ کا قیام درست ہے، اور اس کے لئے آبادی کا اتصال ضروری نہیں ہے۔

بخلاف الجمعۃ فتصح إقامتہا فی الفناء ولو منفصلاً بمزارع لأن الجمعۃ من مصالح البلد۔(الشامیہ)

قریہ کبیرہ اور صغیرہ کے متعلق فتاوی دارالعلوم دیوبند میں لکھتے ہیں :

"دیہات دو قسم کے ہیں قریہ کبیرہ اور قریہ صغیرہ، قریہ کبیرہ کو بحکم قصبہ و شہر قرار دے کر فقہانے اس میں وجوب جمعہ کا فتوی دیا ہے، کما فی الشامی۔ وتقع فرضاً فی القصبات والقری الکبیرۃ التی فیھا اسواق الخ ص ۷ ۵۳ جلد اول۔ اور قریہ صغیرہ میں باتفاق فقہاء حنفیہؒ جمعہ صحیح نہیں ہے، کما فی الشامی وفیما ذکرنا اشارۃ الی انہ لا تجوز فی الصغیرۃ الخ وفی باب العیدین من الدر المختار وفی القنیۃ صلوٰۃ العید فی القری تکرہ تحریماً ای لانہ اشتغال بما لا یصح لان المصر شرط الصحۃ وفی الشامی قولہ صلوٰۃ العید ومثلہ الجمعہ الخ باقی رہا یہ کہ جس قریہ میں دو ہزار آدمی آباد ہوں اور وہاں دوکانیں بھی ہوں تو اگر اس کو قریہ کبیرہ قرار دیا جائے تو مستبعد نہیں ہے۔ تین چار ہزار آدمی آباد ہوں تو اس کے قریہ کبیرہ ہونے میں شبہ نہیں معلوم ہوتا۔ اکبر مساجد میں وہاں کے مکلفین کے نہ سمانے کی تعریف ضعیف ہے جیسا کہ شارح منیہ نے اس کو بیان فرمایاہے کہ یہ تعریف خود حرمین شریفین کی مسجدوں پر صادق نہیں آتی۔ کما ہو ظاہر ۔ اور حنفیہؒ کو بمذہب دیگر ائمہ اس مسئلہ میں عمل کرنے کی فقہاء نے اجازت نہیں دی۔ اور ہم لوگ پابند ہیں اس امر کے کہ جس جگہ اور جس مسئلہ میں ہمارے فقہاء نے فتوی غیر کے مذہب پر دے دیا ہے اس پر عمل کیا جائے گا ورنہ نہیں۔ زوجہ مفقود

الخبر کے بارے میں فقہاء حنفیہؒ نے فتویٰ امام مالک رحمۃ اللہ کے مذہب پر دے دیا ہے اس پر عمل کیا جاوے گا۔ اسی طرح جس مسئلہ میں تصریح فقہاء کی ہے وہاں عمل کر سکتے ہیں اور جس جگہ تصریح ان حضرات کی نہیں ہے وہاں عمل نہیں کر سکتے۔"

(فتاوی دارالعلوم دیوبند)

فناء شہر کی تعریف :

فناء کا اطلاق آبادی کے ارد گرد ان جگہوں پر ہوتا ہے جن سے شہر کی ضروریات وابستہ ہوتی ہیں، مثلاً گھوڑ دوڑ کا میدان، صنعتی کار خانے وغیرہ۔

تعریف الفناء: وہو ما أعد لحوائج أہل المصر۔

(عنایۃ ۲،۵۱)

فناء ہ وہو ماحولہ اتصل بہ أولا لأجل مصالحہ۔

(تنویر الأبصار مع الدر المختار علی الشامي زکریا ۳،۷)

وفناء البلد عندالفقہاء ہو المکان المعد لمصالح البلد کرکض الدواب ودفن الموتی وإلقاءالتراب ونحو ذلک۔

(الموسوعۃ الفقہیۃ ۲۲،۸۸)

فناء المصر وہو الموضع المعد لمصالح المصر المتصل بہ.....

(البزازیۃ ۴،۷۴)

وأما الفناء: وہو المکان المعد لمصالح البلد کرکض الدواب ودفن الموتی.....

(الشامیۃ: ۲،۵۹۹ زکریا)

فناء کا شہر سے دور ہونا :

فناء مصر کا شہر سے نہ ہی متصل ہونا ضروری ہے اور نہ ہی اس کی کوئی حد مقرر ہے ،بلکہ یہ شہر کے بڑے اور چھوٹے ہونے سے بڑا اور چھوٹا بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی رشید احمدؒ سے جب رائیونڈ اجتماع میں جمعہ کے متعلق پوچھا گیا، کہ وہاں باغات اور خالی زمین ہونے کے باوجود نماز جمعہ آدا کی جاتی ہے۔ تو آپؒ نے جواب دیا: کہ یہ فنا مصر (رائیونڈ) ہے ،جس مقام سے لوگوں کی ضرورتیں وابستہ ہوں تو فصل اور باغات ہونے کے باوجود بھی وہ فنائے مصر کہلایا جائیگا۔

فناءِ مصر کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے : "فناء مصر وہ مقام ہے جو شہر کی ضروریات کے لئے متعین ہو، مثلاً : قبرستان، کوڑا ڈالنے یا گھوڑ دوڑ یا جنگی مشق یا فوجی اجتماع وغیرہ کے لئے میدان، ہوائی اڈہ اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ۔ فناء کا شہر سے اتصال ضروری نہیں اور نہ ہی اس کی مسافت اور وسعت کی کوئی تحدید ہے بلکہ شہر کی حیثیت کے مطابق اس کی فناء مختلف ہوگی"۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : (احسن الفتاوی: 133/4)

حدود شہر :

آج کل جس طرح شہروں کی آبادیاں وسیع تر رقبے تک پھیلتی جارہی ہیں، ان کا تصور فقہاء متقدمین کے زمانہ میں نہ تھا، اس لئے فقہی کتابوں میں اس کے متعلق صریح جزئیہ ملنا دشوار ہے، اسی بنابر یہ مسئلہ ایک عرصہ سے مفتیان کرام کے لئے موضوع بحث بنا ہوا ہے، تاہم اصول سے قریب یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آبادی کی تحدید میں اتصال مکانات کو بنیاد بنانے کے بجائے عرف کو بنیاد بنایا جائے، یعنی جس آبادی پر لوگوں کے عرف اور سرکاری حد بندیوں کے اعتبار سے ایک آبادی ہونے کا حکم لگایا جاتا ہو اسے متصل آبادی سمجھا جائے، اور جس جگہ سے عرف میں دوسرا شہر ہوجاتا ہو اسے دوسری آبادی قرار دیا جائے، اگرچہ دونوں کی آبادیاں متصل ہوں۔

(مستفاد : احسن الفتاویٰ ۴؍۷۵، فتاویٰ رحیمیہ ۶؍۳۶۳، انوار رحمت ۸۱ -۸۳)

والأصل في ذٰلک ما روي عن علي رضي الله عنہ أنہ خرج من البصرة يريد السفر فجاء في وقت العصر فأتمها، ثم نظر إلى ''خص'' أمامہ فقال: أما لو كنا جاوزنا ہذا الخص لقصرنا۔

(أخرجہ عبد الرزاق في مصنفہ ۲؍۵۲۹ رقم: ۴۳۱۹، المحيط البرہاني ۲؍۳۸۷ إدارة القرآن كراتشي)

من خرج من عمارة موضع إقامتہ۔ (درمختار)

''وأشار إليہ أنہ يشترط مفارقة ماكان من توابع موضع الإقامة كربض المصر، وہو ماحول المدينةمن بيوت ومساكين، فإنہ في حكم المصر، وكذا القرى المتصلة بالربض في الصحيح بخلاف بساتين، ولومتصلة بالبناء لأنہا ليست من البلدة وأما الفناء: وہو المكان المعد لمصالح كركض الدواب و دفن الموتىٰ وإلقاء التراب فإن اتصل بالمصر اعتبر مجاوزتہ و إن انفصل بغلوة أو مزرعة فلا ۔''

(الفتاوى الشامية)

''والقرية المتصلة بالفناء دون الربض لا تعتبر مجاوزتہا على الصحيح كما في شرح المنية ۔''

(الشامية)

''إن كان بين المصر وفنائہ أقل من قدر غلوة و لم يكن بينہما مزرعۃ يعتبر مجاوزة الفناء أيضا و إن كان بينہما مزرعۃ أو كانت المسافۃ بين المصر وفنائہ قدر غلوة يعتبر مجاوزة عمران المصر و لا يعتبرفي مجاوزة الفناء .''

(فتاویٰ قاضی خاں ۱،۱۶۵)

چنانچہ حضرت مولانااشرف علی تھانویؒ نے بھی ایک فتوی کے مطابق یہی فرمایاہے،جب ان سے فاصلہ پر بنے مکانات کے متعلق پوچھاگیا،توآپؒ نے فرمایا: اگرعرف میں ان مکانات کو متعلقہ بستی کا حصہ سمجھاجاتا ہے ،تو فصل ہونے کے باوجودوہ اسی بستی کا حصہ ہوگا۔

(تفصیل کے لیے امدادالفتاویٰ)

"فناؤه وهو ماحولہ اتصل بہ أولا كما حرره ابن كمال وغيره لأجل مصالحہ كدفن الموتى وركض الخيل(ردالمختار) وفي الشاميۃ: قولہ كما حرره ابن الكمال: حيث قال: واعتبر بعضہم قيد الاتصال وقد خطأه صاحب الذخيرة قائلاً، فعلى قول ہذا القائل لا تجوز إقامۃ الجمعۃ ببخاري في مصلى العيد؛ لأن بين المصلى وبين المصر مزارع، ووقعت ہذه المسئلۃ مرة، وأفتىٰ بعض مشايخ زماننا بعدم الجواز؛ ولكن ہذا ليس بصواب، فإن أحدًا لم ينكر جواز صلاة العيد في مصلى العيد ببخاري لا منالمتقدمين ولامن المتأخرين، وكما أن المصر أوفناء ه"

- کیاجمعہ کی نمازفرض ہے،یاواجب اورسنت ہے؟
- نمازجمعہ کی شرائط کیاہیں؟
- ضروریات زندگی سے کیامرادہے؟
- مسافریادیہاتی کاجمعہ کے زوال کے بعد شہر میں حاضر ہونا۔
- کیاقریہ کبیرہ کے لیے بھی فناء ہے؟
- جمعہ واجب نہ ہونے کے باوجود نمازجمعہ پڑھنا۔
- کیااقامت جمعہ کے لیے خلیفہ کاہوناضروری ہے؟
- جمعہ کے جائزاورواجب ہونے میں فرق۔

کیاجمعہ فرض ہے یاواجب اورسنت ہے؟

عام طورپرفقہ کی کتابوں جمعہ واجب لکھاہوتاہے،جس سے مرادہ فرض ہی ہے،گویاکہ واجب فرض عملی ہے۔چنانچہ علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں:

''واعلم ان الجمعۃ فريضۃ محكمۃ بالكتاب والسنۃوالاجماع يكفرجاحدها۔''

(فتح القدير:ج٢،ص٤٧)

''وهي فرض عين كذا في التهذيب ثم لوجوبها شرائط في المصلي وهي الحرية والذكورة والإقامة والصحة كذا في الكافي والقدرة على المشي كذا في البحر الرائق والبصر هكذا في التمرتاشي۔۔''

(الفتاوى الهندية:ج١،ص١٤٤)

فقہی کتابوں میں بعض اوقات فرض کے لیے واجب کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جس سے واجب کا لغوی معنی یعنی لازم اور ضروری مراد ہے۔

قال فی الشامية:

''(هي فرض) عين (يكفر جاحدها) لثوبتها بالدليل القطعي كما حققه الكمال وهي فرض مستقل آكد من الظهر وليست بدلا عنه كما حرره الباقاني معزيا لسري الدين بن الشحنة وفي البحر وقد أفتيت مرارا بعدم صلاة الأربع بعدها بنية آخر ظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة وهو الاحتياط في زماننا وأما من لا يخاف عليه مفسدة منها فالأولى أن تكون في بيته خفية۔۔''

(كتاب الجمعة)

نماز جمعہ کی شرطیں :

''فصل وأما بيان شرائط الجمعة فللجمعة شرائط بعضها يرجع إلى المصلي وبعضهايرجع إلى غيره أما الذي يرجع إلى المصلي فستة العقل والبلوغ والحرية والذكورة والإقامة وصحة البدن فلا تجب الجمعة على المجانين والصبيان والعبيد إلا بإذن مواليهم والمسافرين والزمنى والمرضى ۔۔وأما الشرائط التي ترجع إلى غير المصلي فخمسة في ظاهر الروايات:

المصر الجامع

والسلطان

والخطبة

والجماعة

والوقت''

ضروریات زندگی کا مطلب اور فناء کا شہر سے دور ہونا :

فناء کی تعریف میں ضرورت اور مصلحت کا ذکر ہے اب سوال یہ ہے کہ کیاہر ضرورت اور مصلحت مراد ہے ، یا اس میں کوئی تخصیص ہے؟

فقہی کتابوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتاہے کہ ضرورت خاص مراد ہے :

باغات اور فصلیں ضروریات زندگی سے ہیں، لیکن فقہاء نے فناء مصر کے لیے ان کو مانع قرار دیاہے۔ہر قسم کی ضروریات میں جنگل اور پہاڑ بھی فناء میں شامل ہوں گے،کیونکہ جنگل سے لکڑیاں لانااوریاپہاڑ سے تعمیراور مقبرہ وغیرہ کے لیے پتھر لانا بھی ضروریات میں شامل ہیں ،حالانکہ فقہاء نے جنگل اور پہاڑ کو فنامیں شامل نہیں کیاہے۔گنجان آبادی میں بھٹہ اور دیگر کارخانے شہر سے بہت دور اس بناپر باہر کردیے جاتے ہیں ،کہ اس سے پھیلنے والے زہرآلود گیسیں انسانی صحت کے لیے خطرناک ہوتی ہیں،لیکن ضرورت پھر بھی اس سے وابستہ ہے۔لہٰذاضرورتوں سے مراد سکنی اور رہائش سے وابستہ ضرورتیں ہیں۔

(تفصیل کے لیے امدادالاحکام)

"وفناء المصر ہو الموضع المعد لمصالح المصر متصل بہ ومن كان مقيما في عمران المصر وأطرافہ وليس بين ذلك الموضع وبين المصر فرجۃ فعليہ الجمعۃ، ولو كان بين ذلك الموضع وبين عمران المصر فرجۃ من مزارع ومذارعٍ كالقلع ببخاري لاجمعۃ على أہل ذلك الموضع وإن سمعوا النداء والغلوة والميل والأميال ليس بشرط روي الفقيہ أبوجعفرؒ، ہذا عن أبي حنيفۃؒ، وأبي يوسفؒ وہو اختيار شمس الأئمۃ الحلوائي۔ "

(خلاصۃ الفتاوى، كتاب الصلاة، الفصل الثالث والعشرون في صلاة الجمعۃ)

فناء مصر کا شہر سے نہ ہی متصل ہوناضروری ہے اورنہ ہی اس کی کوئی حد مقرر ہے ،بلکہ یہ شہر کے بڑے اور چھوٹے ہونے سے بڑااور چھوٹا بھی ہوتاہے۔

چنانچہ حضرت مفتی رشیداحمدؒ سے جب رائیونڈاجتماع میں جمعہ کے متعلق پوچھاگیا،کہ وہاں باغات اورخالی زمین ہونے کے باوجود نماز جمعہ آداکی جاتی ہے۔تواپؒ نے جواب دیا: کہ یہ فنامصر(رائیونڈ)ہے ،جس مقام سے لوگوں کی ضرورتیں وابستہ ہوں توفصل اور باغات ہونے کے باوجود بھی وہ فنائے مصر کہلایاجائیگا۔

فناءِ مصر کی تعریف یہ کی جاسکتی ہے : "فناء مصر وہ مقام ہے جو شہر کی ضروریارت کے لئے متعین ہو،مثلًا: قبرستان، کوڑاڈالنے یا گھوڑ دوڑ یا جنگی مشق یا فوجی اجتماع وغیرہ کے لئے میدان، ہوائی اڈہ اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ۔فناء کا شہر سے اتصال ضروری نہیں اور نہ ہی اس کی مسافت اور وسعت کی کوئی تحدید ہے بلکہ شہر کی حیثیت کے مطابق اس کی فناء مختلف ہوگی"۔

(احسن الفتاوی:133/4)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:(احسن الفتاوی)

مسافر جمعہ کے دن زوال کے بعد شہر میں موجود ہو، تو جمعہ کا حکم:

جمعہ کی نماز صحیح ہوجائے گی اور نماز ظہر ان کے ذمہ سے ساقط ہوجائے گی۔

''والدليل على أنه لا جمعة على هؤلاء ما روي عن جابر عن رسول الله أنه قال من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فعليه الجمعة إلامسافرا أو مملوكا أو صبيا أو امرأة أو مريضا ثم هؤلاء الذين لا جمعة عليهم إذا حضروا الجامع وأدوا الجمعة فمن لم يكن من أهل الوجوب كالصبي والمجنون فصلاة الصبي تكون تطوعاولا صلاة للمجنون رأسا ومن هو من أهل الوجوب كالمريض والمسافر والعبد والمرأةوغيرهم تجزيهم ويسقط عنهم الظهر لأن امتناع الوجوب عليهم لما ذكرنا من الأعذاروقد زالت وصار الإذن من المولى موجودا دلالة۔۔۔''

(بدائع الصنائع:فصل :وامابيان شرائط الجمعة،ج١)

شامی میں ہے:

''ان المسافر لما التزم الجمعة صارت واجبة عليه ولذاصحت امامته' فيها....۔''

(الشامية:ج١،ص ٧٦٧ باب الجمعة)

''ومن هو من أهل الوجوب كالمريض والمسافر والعبد والمرأة وغيرهم تجزيهم ويسقط عنهم الظهر لأن امتناع الوجوب عليهم لما ذكرنا من الأعذار وقد زالت۔۔۔''

(بدائع:ج١،ص٢٥٩)

''ثم هؤلاء الذين لا يجب عليهم الجمعة إذا حضروا الجمعة وصلوا فإنه يجزئهم ويسقط عنهم فرض الوقت لأن امتناع الوجوب للعذر قد زال۔۔''

(تحفة الفقهاء:ج١،ص١٦٢)

مالابدمنہ میں ہے:

اگر جماعت مسافران در مصر نماز جمعہ گذارند درآنہا مقیم کسے نباشد نزد امام اعظمؒ جمعہ صحیح باشد الخ (ص۵٦ فصل در نماز جمعہ)

تاہم مسافر کے علاوہ چاہے دیہات کا ہو یا شہر کا رہنے والا ہو، اگر جمعہ کے دن زوال کے بعد وہ ایسی جگہ ہو، جہاں جمعہ واجب ہو، تو ان پر جمعہ واجب ہے، ورنہ واجب نہیں ہے۔ (تفصیل کے لیے فتاوی دارالعلوم دیوبند)

کیا قریہ کبیرہ (بڑا گاؤں) کے لیے فنا ہے؟

عام طور کتب فقہیہ میں فنا مصر کا ذکر ہے، چونکہ قریہ کبیرہ میں جواز جمعہ کی وجہ وہاں پر ضروری اشیاء کا وجود (مثلا: دکانیں، میڈیکل اور دیگر خورد و نوش کی چیزیں) ہے، اس لیے وہاں جمعہ کی اجازت حکما مصر کے قائم مقام ہونے کی بنا پر دی گئی ہے۔ لہٰذا فناء بھی حکما معتبر ہو گا۔

"جمعہ کی ادا اور وجوب کے لئے عند الحنفیہ مصر (شہری آبادی) شرط ہے اور مصر شہر اور قصبہ کو کہتے ہیں جہاں بازار اور کوچے ہوں اور ہر قسم کی دوکانیں ہوں۔ اور بڑے قریہ کو بھی حکم مصر کا دیا گیا ہے۔۔۔"

(فتاوی دار العلوم دیوبند)

یاد رہے: دار العلوم کے ویب سائیٹ پر بھی بڑے گاؤں کے لیے فنا کا ذکر موجود ہے۔

جمعہ کی شرطیں موجود نہ ہونے کے باوجود جمعہ پڑھنا:

جس گاؤں میں جمعہ کی شرائط نہیں پائی جاتی ہیں، وہاں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں، جو شخص اس جگہ جمعہ پڑھ لے تو اس سے وقت کا فریضہ ساقط نہیں ہوگا، اس کے ذمہ ظہر کی ادائیگی لازم رہے گی۔

(فتاویٰ محمودیہ ڈابھیل۸،۱۲۳، امداد الاحکام ۲،۳۳۹، امداد المفتیین ،۳۹۴)

’’وتقع فرضاً فی القصبات والقریٰ الکبیرة التی فیہا أسواق وفیما ذکرنا إشارة إلی أنہا لا تجوز فی الصغیرة۔‘‘

(شامی زکریا ۳،۷)

’’ألا تری أن فی الجواہر لو صلوا فی القریٰ لزمہم أداء الظہر۔‘‘

(شامی زکریا ۳،۷)

’’عن حذیفة رضی اللہ تعالی عنہ قال: لیس علی اہل القری جمعة، إنما الجمع علی أہل الأمصار مثل المدائن۔‘‘

(المصنف لابن أبي شیبة ۴،۴۶ رقم: ۵۱)

’’وتقع فرضاً فی القصبات والقری الکبیرة التی فیھا اسواق الی ان قال وفیما ذکرنا اشارة الی انھا لا تجوز فی الصغیرة الخ۔‘‘

جہاں مسلمانوں کا خلیفہ نہ ہو وہاں اقامت جمعہ کا حکم:

امام کا ہونا صرف رفع تنازع کے لئے ہے بالذات شرط نہیں دیکھئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایام فتنہ میں خود فتوی دیا تھا امام جابر کے ساتھ جمعہ صحیح ہونے کا حالانکہ وہ خلیفہ شرعی نہ تھا (حسن العزیز ج ۴ ص ۱۵) (اشراف الاحکام ص: ۱۲۵)

(و) الثاني (السلطان) ولو مغلبا أو امرأة فيجوز أمرها بإقامتها لا إقامتها۔

(الشامية:كتاب الجمعة)

اگر سلطان یا نائب سلطان نباشد درامصار جمعہ واجب است۔ کما صرح بہ الشامی۔ درانجا مسلمین امامے معین و مقرر سازند اینہم کافی است

(فتاوی دارالعلوم دیوبند: ج ۵)

''فأما السلطان فشرط أداء الجمعة عندنا حتى لا يجوز إقامتها بدون حضرته أو حضرة نائبهوقال الشافعي السلطان ليس بشرط لأن هذه صلاة مكتوبة فلايشترط لإقامتها السلطان كسائر الصلوات ولنا أن النبي شرط الإمام لإلحاق الوعيد بتارك الجمعة بقوله في ذلك الحديث وله إمام عادل أو جائرروي (وروي)) عن النبي أنه قال أربع إلى الولاة وعد من جملتها الجمعةولأنه لو لم يشترط السلطان لأدى إلى الفتنة لأن هذه صلاة تؤدى بجمع عظيم والتقدم على جميع أهل المصر يعد من باب الشرف وأسباب العلو والرفعة فيتسارع إلى ذلك كل من جبل على علو الهمة والميل إلى الرئاسة فيقع بينهم التجاذب والتنازع وذلك يؤدي إلى التقاتل والتقالي ففوض ذلك إلى الوالي ليقوم به أو ينصب من رآه أهلا له فيمتنع غيره من الناس عن المنازعة لما يرى من طاعة الوالي أو خوفا من عقوبته ولأنه لو لم يفوض إلى السلطان لا يخلو إما أن تؤدي كل طائفة حضرت الجامع فيؤدي إلى تفويت فائدة الجمعة وهي اجتماع الناس لإحراز الفضيلة على الكمال وإما أن لا تؤدى إلا مرة واحدة فكانت الجمعة للأولينوتفوت عن الباقين فاقتضت الحكمة أن تكون إقامتها متوجهة إلى السلطان ليقيمها بنفسه أو بنائبه عند حضور عامة أهل البلدة مع مراعاة الوقت المستحب والله تعالى أعلم هذا إذا كان السلطان أو نائبه حاضرا فأما إذا لم يكن إمام (إماما) بسبب الفتنةأو بسبب الموت ولم يحضر وال آخر بعد حتى حضرت الجمعة ذكر الكرخي أنه لا بأس أن يجمع الناس على رجل حتى يصلي بهم الجمعة وهكذا روى عن محمد ذكره في العيون لما روى عن عثمان رضي الله عنه أنه لما حوصر قدم الناس عليا رضي الله عنه فصلى بهم الجمعة...''

(بدائع الصنائع:ج ۱ ،ص ۲۶۱)

''(قَالَ) وَالسُّلْطَانُ مِنْ شَرَائِطِ الْجُمُعَةِ عِنْدَنَا خِلَافًا لِلشَّافِعِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَقَاسَهُ بِأَدَاءِ سَائِرِ

الْمَكْتُوبَاتِ فَالسُّلْطَانُ وَالرَّعِيَّةُ فِي ذَلِكَ سَوَاءٌ .(وَلَنَا) مَا رَوَيْنَا مِنْ حَدِيثِ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ { وَلَهُ إمَامٌ جَائِرٌ أَوْ عَادِلٌ } فَقَدْ شَرَطَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْإِمَامَ لِإِلْحَاقِهِ الْوَعِيدَ بِتَارِكِ الْجُمُعَةِ وَفِي الْأَثَرِ { أَرْبَعٌ إلَى الْوُلَاةِ مِنْهَا الْجُمُعَةُ } وَلِأَنَّ النَّاسَ يَتْرُكُونَ الْجَمَاعَاتِ لِإِقَامَةِ الْجُمُعَةِ وَلَوْلَمْ يُشْتَرَطْ فِيهَا السُّلْطَانُ أَدَّى

إِلَى الْفِتْنَةِ لِأَنَّهُ يَسْبِقُ بَعْضُ النَّاسِ إِلَى الْجَامِعِ فَيُقِيمُونَهَا لِغَرَضٍ لَهُمْ وَتَفُوتُ عَلَى غَيْرِهِمْ وَفِيهِ مِنْ الْفِتْنَةِ مَا لَا يَخْفَى فَيُجْعَلُ مُفَوَّضًا إلَى الْإِمَامِ الَّذِي فُوِّضَ إلَيْهِ أَحْوَالُ النَّاسِ وَالْعَدْلُ بَيْنَهُمْ لِأَنَّهُ أَقْرَبُ إلَى تَسْكِينِ الْفِتْنَةِ.''

(المبسوط:شرائط الجمعہ ج۲،ص۳۱۶)

جمعہ کے جائز یا واجب میں فرق:

جہاں جمعہ کی شرطیں نہ پائی جائیں، وہاں جمعہ پڑھنے سے نماز ظہر ساقط نہ ہوگی، اسی طرح شرائط موجود ہونے کے باوجود ظہر کی نماز باجماعت پڑھی گئی، تو نماز مکروہ تحریمی ہوگی۔ تاہم فاسد نہ ہوگی، عدم فساد کی وجہ فقہاء یہ لکھتے ہیں: کہ اس نے ظہر کی نماز پڑھی اگر کہا جائے قضا ضروری ہے، تو قضا اس وقت ہوگی جب وقت پر نماز نہ پڑھی گئی ہو، حالانکہ اس نے نماز ظہر آدا کی۔

قال: "فإن صلى الإمام بأهل المصر الظهر يوم الجمعة أجزأهم وقد أساؤوا في ترك الجمعة" أما الجواز فلأنهم أدوا أصل فرض الوقت ولو لم نجوزها لهم أمرناهم بإعادة الظهر بعد خروج الوقت والأمر بإعادة الظهر عند تفويتها في الوقت وما فوتوها وأما الإساءة فلتركهم أداء الجمعة بعد ما استجمعوا شرائطها وفي حديث ابن عمرقال رسول الله ﷺ: "من ترك ثلاث جمع تهاونا بها طبع على قلبه".

(المبسوط:ج۲،ص۴۵)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- ہمارے عرف میں منگنی نکاح ہے یا وعدہ نکاح ہے
- رخصتی کے دوران نکاح جدید کی شرعی حیثیت
- نکاح ثانی میں مقررہ مہر کا حکم
- مہر کی زکوۃ کس کا ذمہ ہے؟
- نکاح خوانی پر اجرت لینا
- وکیل نکاح سے گواہ طلب کرنا
- بیوی کے علاج و معالجہ کا خرچہ کس کے ذمہ ہے؟
- مہر میں کچھ رقم لینا اور بقیہ سامان شوہر کے ذمہ لگانا

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

کیافرماتے ہیں علماء کرام درج ذیل کے بارے میں:

- کیا منگنی میں باقاعدہ ایجاب وقبول اور خطبہ سے نکاح منعقد ہوگا؟
- اگر نکاح درست ہے، توشادی کے دوران نکاح جدید کی کیاحیثیت ہے؟
- منگنی اور شادی میں مہر کی تبدیلی سے کس مہر کا اعتبار ہوگا؟
- اور مہر کی رقم میں زکوۃ کا کیا حکم ہے؟
- کیاشادی سے قبل علاج معالجہ میں شوہر کی اجازت ضروری ہے؟اور خرچہ ونفقہ کس پر ہوگا؟
- نکاح فیس کس کے ذمہ ہے؟
- اور وکیل بالنکاح پر گواہاں بنانا کیساہے؟گواہوں کو رقم بطوراجرت دینا کیساہے؟
- لڑکی والوں کا یہ کہنا: دولاکھ نقد کی صورت میں ہمیں دےاور گھر کا سامان بھی آپ کے ذمہ ہوگا،تواس صورت میں حق مہر دولاکھ ہے، یا گھریلوسامان بھی مہر میں شامل ہے؟

الجواب حامداومصليا

منگنی میں باقاعدۃ ایجاب وقبول اور خطبہ نکاح:

نکاح کا دارومدارایجاب وقبول اور گواہوں پر ہے، لہٰذااگر نکاح میں مذکورہ چیزیں ہوں تونکاح منعقد ہوجاتاہے،البتہ جہاں یہ عرف ہوکہ منگنی میں صرف وعدہ نکاح ہو،جس میں باقاعدہ ایجاب،قبول وغیرہ کے الفاظ نہ ہواوریاہومگرصرف ایک طرف سے ہو،تونکاح شرعی نہ ہوگا،جب کہ ہمارا عرف ایسانہیں ہے۔اس لیے منگنی سے باقاعدہ نکاح شرعی منعقد ہوگا۔

"(الحنفية - قالوا : للنكاح شروط بعضها يتعلق بالصيغة وبعضها يتعلق بالعاقدين وبعضها يتعلق بالشهود فأما الصيغة - وهي عبارة عن الإيجاب والقبول - فيشترط فيها شروط : أحدها أن تكون بألفاظ مخصوصة وبيانها أن الألفاظ التي ينعقد بها النكاح إما أن تكون صريحة و إما أن تكون كناية . فالصريحة هي ما كانت بلفظ تزويج وانكاح أي ما اشتق منهما كزوجت وتزوجت وزوجني ابنتك مثلا أو زوجيني نفسك فتقول : زوجت أو قبلت أو سمعا وطاعة . ويصح النكاح بلفظ المضارع إذا لم يرد به طلب الوعد فلو قال : تزوجني بنتك فقال : زوجتك صح أما إذا نوى الاستيعاد - أي طلب الوعد - فإنه لا يصح ...."

(الدرالمختار:كتاب النكاح)

نکاح جدید کی شرعی حیثیت:

پہلی صورت کے حوالوں سے واضح ہوا، کہ نکاح اول کا انعقاد ہو گیا ہے، اب دوبارہ نکاح ضروری نہیں ہے صرف احتیاط پر مبنی ہے۔

"وإن جدد النكاح للاحتياط لا يلزم الزيادة بلا نزاع لأن الفرض إبقاء الأول---"

(الفتاوى البزازية:الملف الثانى)

"لو جدد النكاح لمنكوحته بمهر لم يلزمه ؛ لأن النكاح الثاني لم يصح ، فلم يلزم ما في ضمنه من المهر ."

(الموسوعة الفقهية)

تاہم دور حاضر میں دین سے دوری کی وجہ سے بعض اوقات نازیباالفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں، جس سے عقد نکاح کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔اس لیے دوران رخصتی دوبارہ ایجاب وقبول مستحب ہے۔

"ولو زوجها لنفسه فسكوتها رد بعد العقد لا قبله ولو استأذنها في معين فردت ثم زوجها منه فسكتت صح في الأصح بخلاف ما لو بلغها فردت ثم قالت رضيت لم يجز لبطلانه بالرد ولذا استحسنوا التجديد عند الزفاف لأن الغالب إظهار النفرة عند فجأة السماع..."

(الدرالمختار:باب الولى)

نکاح جدید میں مہر کا اعتبار:

نکاح جدید میں اگراز سر نو مہر رکھا جائے، تو اس کی تین صورتیں ہیں:

* مہر میں اضافہ کرنا ہو۔ تو شوہر زیادت مہر کا پابند ہوگا، تاہم اگر دخول سے قبل طلاق کی نوبت آئیں، تو قدیم مہر کا اعتبار ہوگا۔
* مہر میں کمی کرنا ہو، تو بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔
* مہر میں تبدیلی مقصد نہ ہو، صرف احتیاط کی بناپر عقد نکاح کی تجدید مراد ہو، تو سابق مہر کا اعتبار ہوگا۔

في القنية: جدد للحلال نكاحا بمهر يلزم إن جدده لأجل الزيادة لا احتياطا اهـ أي لو جدده لأجل الاحتياط لا تلزمه الزيادة بلا نزاع كما في البزازية.

(الدرالمختار:مطلب: فى حط المهروالابراء منہ)

وإن جدد النكاح للاحتياط لا تلزمه الزيادة بلا نزاع، كذا في الوجيز للكردري

(الفتاوى الهندية:الفصل السابع فى الزيادة فى المهروالحط)

وفي القنية جدد للحلال نكاحا بمهر يلزم إن جدده لأجل الزيادة لا احتياطا اهـ.وفي الظهيرية تزوجها بألف ثم جدد النكاح بألفين المختار عندنا أن لا تلزمه الألف الثانية؛ لأنها ليست بزيادة لفظا ولو ثبتت الزيادة إنما تثبت في حق ضمن النكاح فإذا لم يصح النكاح لم يصح ما في ضمنه اهـ.

(البحرالرائق: باب المهر)

(تفصیل کے لیے فتاوی عثمانیہ: کتاب النکاح)

حق مہر کی زکوۃ کس کا ذمہ؟

مہر وصول ہونے سے قبل بیوی کے ذمہ زکوۃ واجب نہ ہو گی۔جب کہ شوہر کے ذمہ دین ہے، مہر مؤجل ہو، یا معجّل ہو دونوں صورتوں میں شوہر کے ذمہ دین ہے۔ لہٰذا اس کا حکم بھی عام دیون کی طرح ہے۔

مہر مؤجل و معجّل میں فرق: جو مہر رخصتی سے پہلے دیا جاتا ہے وہ معجّل ہے اور رخصتی کے بعد دیا جانے والا مہر مؤجل ہے۔

(فتاوی قاسمیہ)

"زكاة صدقة المرأة:ذهب أبو حنيفة إلى أن صداق المرأة لا زكاة فيه، إلا إذا قبضته، لانه بدل عما ليس بمال، فلا تجب فيه الزكاة قبل القبض، كدين الكتابة.ويشترط بعد قبضه أن يبلغ نصابا، ويحول عليه الحول، إلا إذا كان عنها نصاب آخر سوى المهر، فإنها إذا قبضت من الصداق شيئا ضمته إلى النصاب، وزكته بحوله."

(فقہ السنۃ:زکوٰۃ الحلی)

"وأما سائر الديون المقر بها فهي على ثلاث مراتب عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى - ضعيف، وهو كل دين ملكه بغير فعله لا بدلا عن شيء نحو الميراث أو بفعله لا بدلا عن شيء كالوصية أو بفعله بدلا عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لا زكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا ويحول عليه الحول. ووسط، وهو ما يجب بدلا عن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة وثياب البذلة إذا قبض مائتين زكى لما مضى في رواية الأصل وقوي، وهو ما يجب بدلا عن سلع التجارة إذا قبض أربعين زكى لما مضى كذا في الزاهدي."

(الفتاوی الھندیۃ:الباب الاول فی تفسیرالزکوٰۃ وصفتھا)

"أو مؤجلا ولو صداق زوجته المؤجل..."

(الدرالمختار:کتاب الزکوٰۃ)

مہر چونکہ شوہر کے ذمہ دین ہے، لہٰذا اس کی رقم زکوۃ سے منہا ہو گی۔

"وكذلك المهر يمنع مؤجلا كان أو معجلا؛ لأنه مطالب به كذا في محيط السرخسي. وهو الصحيح على ظاهر المذهب وذكر البزدوي في شرح الجامع الكبير قال مشايخنا - رحمهم الله تعالى - في رجل عليه مهر مؤجل لامرأته، وهو لا يريد أداءه: لا يجعل مانعا من الزكاة لعدم المطالبة في العادة، وأنه حسن أيضا هكذا في جواهر الفتاوى."

(الفتاوی الھندیۃ:الباب الاول فی تفسیرالزکوٰۃ وصفتھا)

رخصتی سے قبل علاج معالجہ، شوہر کی اجازت اور نفقہ:

بیماری و مرض کے علاج کا خرچہ شرعاً خاوند کے ذمہ نہیں۔

"وعليه ما تقطع به الصنان لا الدواء للمرض ولا أجرة الطبيب ولا الفصاد ولا الحجام..."

(الدرالمختار،مطلب:لاتجب على الاب نفقة زوجہ ابنہ)

ولا يجب الدواء للمرض، ولا أجرة الطبيب، ولا الفصد، ولا الحجامة كذا في السراج الوهاج...

(الفتاوى الهنديہ:الفصل فى نفقة الزوجة)

(کذا فی فتاوی حقانیہ: 4\440)

(ھکذا فی خیر الفتاوی: 4\568)

(کذا فی دارالعلوم دیوبند: جلد11)

تاہم فتاوی دارالعلوم زکریا کے مطابق یہ اخراجات اساسی ضروریات میں شمار ہوگئے ہیں،اس لیے بمطابق عرف بذمہ شوہر ہے۔

(تفصیل فتاوی دارالعلوم زکریا، باب حقوق الزوجین: 4\416)

سوال کا تعلق اجازت سے بھی تھا،اس کی تفصیل یوں ہے:

- شوہر مہر دینے میں ٹال مٹول کر رہاہے،تو نفقہ خاوند کے ذمہ ہے۔
- شوہر مہر بھی دیتاہے اور رخصتی کے بھی خواہاں ہے، لیکن لڑکی والے تیار نہیں ہوتے ہیں،تو نفقہ خاوند کے ذمہ نہیں ہے۔
- تاخیر کسی کی وجہ سے نہیں ہے ،البتہ عرف میں چندماہ کے لیے رخصتی کا انتظار کرنا ہوتاہے،توظاہرالروایہ کے مطابق نفقہ شوہر کے ذمہ ہے۔

"(قوله ولو هي في بيت أبيها) تعميم لقوله فتجب للزوجة، وهذا ظاهر الرواية، فتجب النفقة من حين العقد الصحيح وإن لم تنتقل إلى منزل الزوج إذا لم يطلبها. وقال بعض المتأخرين: لا تجب ما لم تزف إلى منزله، وهو رواية عن أبي يوسف واختاره القدوري وليس الفتوى عليه، وتمامه في الفتح (قوله إذا لم يطالبها إلخ) الأخصر والأظهر أن يقول به يفتى إذا لم تمتنع من النقلة بغير حق..."

(الدرالمختار،مطلب:لاتجب على الاب نفقة زوجہ ابنہ)

نکاح فیس کس کے ذمہ ہے؟

فیس نکاح خواں بلانے والے کے ذمہ ہے،اس کا اندازہ عرف سے ہوتاہے۔ہمارے ہاں عام طورلڑکے والے بلاتے ہیں

(تفصیل کے لیے امدادالفتاویٰ،الصراح فی اجرۃالنکاح،کتاب النکاح: 301/2)

نوٹ :اجرت مقرر کرے، کیونکہ بسااوقات اجرت نکاح مقرر نہ ہونے کی وجہ سے اجرت مجہولہ کی خرابی لازم آتی ہے۔البتہ اگرامام کے تقرر اور تنخواہ میں یہ بات واضح کردی جائے،کہ نکاح خواں بھی امام ہوگا،توباقاعدہ اجرت کی ضرورت نہ ہوگی،اس وقت امام کو دی جانے والی رقم ہدیہ شمار ہوگا۔

وکیل بالنکاح پر گواہ بنانا :

وکیل بالنکاح پر گواہ بناناضروری نہیں ہے۔

"واعلم أنه لا تشترط الشهادة على الوكالة بالنكاح بل على عقد الوكيل، وإنما ينبغي أن يشهد على الوكالة إذا خيف جحد الموكل إياها فتح۔"

(الدرالمختار:مطلب فی الوکیل والفضولی فی النکاح)

"(الباب السادس في الوكالة بالنكاح وغيرها) يصح التوكيل بالنكاح، وإن لم يحضره الشهود، كذا في التتارخانية ناقلا عن خواهر زاده۔"

(الھندیۃ:الفصل السادس فی الوکالۃ فی النکاح وغیرھا)

"(نوع آخر في الوكالة بالنكاح) إذا وكلت المرأة رجلا أن يزوجها من رجل يكتب: وكلت المسماة فلانة بنت فلان بن فلان فلانا وأقامته مقام نفسها في تزويجها من فلان بن فلان على صداق كذا درهما وعلى (دست بيمان) كذا درهما وكالة صحيحة وأن فلانا قبل هذه الوكالة قبولا صحيحا وذلك بتاريخ كذا ثم يكتب بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ: هذا ما تزوج فلان فلانة بتزويج وكيلها فلان إياه بالمهر المذكور في صدر الكتاب وهو كذا نكاحا صحيحا جائزا بمحضر جماعة من الشهود العدول المرضيين، ويتم الكتاب.وفيما إذا وكلت رجلا أن يزوجها من نفسه يكتب: وكلت المسماة فلانة بنت فلان بن فلان فلانا وأقامته مقام نفسها في تزويجها من نفسه على صداق كذا إلى آخر ما ذكرنا ثم يكتب: بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ إن فلانا الوكيل زوج موكلته فلانة من نفسه بحكم الوكالة المذكورة في صدر هذا الكتاب بالمهر المسمى في صدر هذا الكتاب تزويجا صحيحا بحضرة جماعة من الشهود العدول المرضيين، ويتم الكتاب."

(الھندیۃ:الفصل الرابع عشرفی الوکالات)

شہادت پراجرت لینا:

شہادت پر اجرت لینادرست نہیں ہے۔تاہم بعض علماء کے نزدیک اگرگواہی دیناضروری نہ ہو۔ (جیساکہ یہاں ہے)،تووقت دینے کی اجرت لینادرست ہے۔

"قوله: (لكن له أخذ الاجرة لا للشاهد) في المجتبى عن الفضلي: تحمل الشهادة فرض على الكفاية كأدائها وإلا لضاعت الحقوق، وعلى هذا الكاتب، إلا أنه يجوز أخذ الاجرة على الكتابة دون الشهادة۔۔۔"

(تکملۃحاشیۃ ردالمحتار)

"قَوْله: (لَكِن لَهُ أَخذ الاجرة لَا للشَّاهِد) فِي الْمُجْتَبَيْ عَنْ الْفَضْلِيِّ: تَحَمُّلُ الشَّهَادَةِ فَرْضٌ عَلَى الْكِفَايَةِ كَأَدَائِهَا وَإِلَّا لَضَاعَتْ الْحُقُوقُ، وَعَلَى هَذَا الْكَاتِبِ، إلَّا أَنه يجوز أَخْذُ الْأُجْرَةِ عَلَى الْكِتَابَةِ دُونَ الشَّهَادَةِ فِيمَنْ تَعَيَّنَتْ عَلَيْهِ بِإِجْمَاعِ الْفُقَهَاءِ، وَكَذَا مَنْ لَمْ تَتَعَيَّنْ عَلَيْهِ عِنْدَنَا، وَهُوَ قَوْلٌ لِلشَّافِعِيِّ.وَفِي قَوْلٍ يَجُوزُ لِعَدَمِ تَعَيُّنِهِ عَلَيْهِ اه."

(قرة عين الاخيارلتكملۃ ردالمحتار:كتاب الشهادات)

(الدرالمختار:مطلب:فی حط الثمن والابراءمنہ)

دو لاکھ مہر بقیہ گھریلو سامان :

بعض علاقوں میں یہ رواج ہے، کہ لڑکی والے یوں کہتے ہیں :

دو لاکھ مہر ہمیں نقد کی صورت میں دو اور بقیہ گھریلو سامان آپ لوگ تیار کریں، تو اس وقت مہر دو لاکھ ہوں گے ، یا گھریلو سامان بھی مہر ہی کا حصہ ہو گا۔

ہر ایسی چیز کا مہر مقرر کرنا صحیح ہے، جو عرف میں مال سمجھا جاتا ہو، لہٰذا زیور یا گھریلو سامان کا مہر مقرر کرنا بلاشبہ درست ہے۔

"المهر لايكون الامال ،أومايوجب تسليم مال---"

(الفتاوی التاتارخانیۃ:کتاب النکاح)

"لأن المهر إما ذهب أو فضة أو مثلي غيرهما أو قيمي---"

(الدرالمختار:مطلب: فی حط المهروالابراء منہ)

صورت مسؤلہ کی تین صورتیں ہیں :

* دوران عقد یہ واضح کردے کہ سامان بھی مہر کا حصہ ہے اور سامان کی تعین جنس اور نوع کی صورت میں کرلیں۔مثلا: فلان کمپنی کی واشنگ مشین ،اتنی قیمت والی فرنیچر وغیرہ آپ تیار کرے، تو بلاشبہ مہر سے شمار ہوگا۔
* اتنی وضاحت کردے، کہ مہر کا بقایا حصہ سامان کی صورت میں دیں اور سامان کی صرف جنس بتادیں۔مثلا: فرنیچر، واشنگ مشین وغیرہ آپ کے ذمہ ہے۔

یہ صورت بھی درست ہے،اگرچہ نوع کے اعتبار سے جہالت ہے، فقہاء نے اس جہالت کو بوجہ نزاع نہ ہونے کے جائز سمجھاہے۔

یہ واضح نہ ہو، صرف اتنا کہا ہو: کہ گھریلو سامان آپ کے ذمہ ہے۔ یہ جنس اور نوع دونوں اعتبار سے جہالت ہے، اس وقت مہر مثل پر فیصلہ ہوگا۔

واضح رہے:

گھریلو سامان اس وقت مہر کا حصہ ہوگا، جب صراحتا اس کی وضاحت کرے، یا عام عرف میں یہ دستور ہو کہ مکمل مہر نقد کی صورت میں نہیں لیاجاتاہے، بلکہ کچھ حصہ سامان کی صورت میں وصول کیاجاتاہے۔ مثلا: عام طور مہر مثل چھ لاکھ ہو، عاقدین یوں طے کرے، کہ دولاکھ مہر دو بقیہ کا سامان خریدو۔ اورجہاں یہ عرف نہ ہو، یا عقد نکاح میں اس کا تذکرہ نہ کیاجائے، تو مہر سے شمار نہ ہوگا۔

"مطلب مسألة دراهم النقش والحمام ولفافة الكتاب ونحوهما ونظير ما في الخانية ما هو معروف بين الناس في زماننا من أن البكر لها أشياء زائدة على المهر: منها ما يدفع قبل الدخول كدراهم للنقش والحمام وثوب يسمى لفافة الكتاب وأثواب أخر يرسلها الزوج ليدفعها أهل الزوجة إلى القابلة وبلانة الحمام ونحوها. ومنها ما يدفع بعد الدخول كالإزار والخف والمكعب وأثواب الحمام، وهذه مألوفة معروفة بمنزلة المشروط عرفا؛ حتى لو أراد الزوج أن لا يدفع ذلك يشترط نفيه وقت العقد أو يسمي في مقابلته دراهم معلومة يضمها إلى المهر المسمى في العقد، وقد سئل عنها في الخيرية فأجاب بما حاصله أن المقرر في الكتب من أن المعروف كالمشروط يوجب إلحاق ما ذكر بالمشروط، وإن علم قدره لزم كالمهر وإلا وجب مهر المثل لفساد التسمية إن ذكر أنه من المهر، وإن ذكر على سبيل العدة فهو غير لازم بالكلية، والذي يظهر الأخير، وما في الخانية صريح فيه ثم ذكر عبارة الخانية المارة وما تقدم من اعتراضه على البحر.

وأنت خبير بأن هذه المذكورات تعتبر في العرف على وجه اللزوم على أنها من جملة المهر، غير أن المهر منه ما يصرح بكونه مهرا ومنه ما يسكت عنه بناء على أنه معروف لا بد من تسليمه، بدليل أنه عند عدم إرادة تسليمه لا بد من اشتراط نفيه أو تسمية ما يقابله كما مر، فهو بمنزلة المشروط لفظا فلا يصح جعله عدة وتبرعا، وكون كلام الخانية صريحا فيه قد علمت ما يناقضه وينافيه. وقد رأيت في الملتقط التصريح بلزومه كما قلنا حيث ذكر في مسألة منع المرأة نفسها حتى تقبض المهر فقال: ثم إن شرط لها شيئا معلوما من المهر معجلا فأوفاها ذلك ليس لها أن تمنع نفسها، وكذلك المشروط عادة كالخف والمكعب وديباج اللفافة ودراهم السكر على ما هو عادة أهل سمرقند، وإن شرطوا أن لا يدفع شيء من ذلك لا يجب، وإن سكتوا لا يجب إلا من صدق العرف من غير تردد في الإعطاء لمثلها من مثله وللعرف الضعيف لا يلحق المسكوت عنه بالمشروط. اهـ. ثم رأيت المصنف أفتى به في فتاويه."

(الدرالمختار:مطلب: فی حط المهروالابراء منه)

واللہ اعلم بالصواب۔

سیدکلیم اللہ حرمزی۔

ایزی پیسہ /موبی کیش پرایک شرعی نظر

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

موبی کیش یاایزی پیسہ کے مسئلہ میں مشکل یہ ہے، کہ کمپنی والے کہتے ہیں کہ اپنے اکاؤنٹ میں ہزار یادوہزار رقم جمع کریں، اس کو نہ نکالیں اس پر آپ کو روزانہ یا ہفتہ وار اتنے منٹس دیے جائیں گے۔ کیا یہ منٹس لینا جائز ہے، اگر نہیں تو جو کمپنی کی طرف سے خود بخود آتے ہیں اس کا کیا کیا جائے۔

کبھی موبائل میں جمع رقم یا منٹ ختم ہو کر کمپنی والے قرض دینے کی سفارش کرتے ہیں قرض پندرہ روپے دیتے ہیں ،جب کہ کٹوتی بیس کا کرتے ہیں ، کیااس طرح رقم لیناسود تو نہیں ہے۔ نیز دیگر متعلقہ پیش آمدہ صورتیں اوران کے احکام کی بھی شرعی حیثیت واضح کیجیئے۔

الجواب حامداومصليا

ایزی پیسہ اکاؤنٹ(easy paysa account) کمپنی کی طرف سے ایک سہولت ہے، جس میں صارفین بلوں کی آدائیگی ، یارقوم کی منتقلی ، موبائل وغیرہ میں بیلنس کااستعمال اور دیگر فوائد حاصل کرتے ہیں۔

دراصل ان رقوم کی پشت پرایک micro(مائیکرو) بینک ہوتاہے، جس میں عموماً چھوٹے سرمایہ داروں کے پیسے سود پر رکھے جاتے ہیں اور اس میں سے چھوٹے کاروباروں کے لیے سود پر قرضے بھی دیے جاتے ہیں۔ جس کو micro-financing (Telenor bank) کہاجاتاہے۔

اس کی شرعی حیثیت یہ ہے، کہ اکاؤنٹ میں جمع کردہ رقم قرض ہے ، قرض کے بدلے کسی قسم کا منافع جائز نہیں ہے۔ لہٰذا مخصوص رقم جمع کرنے پر یومیہ فری منٹس (free minuets)اورمیسجز(massages)اورایمبیز ((sBM کی سہولت اور یارقم کی منتقلی پر ڈسکاؤنٹ وغیرہ وصول کرنا درست نہ ہوگا۔

اگر کوئی ایزی پیسہ اکاؤنٹ کھلوا چکا ہو تو فوراًاپنااکاؤنٹ ختم کرےاور صرف اپنی جمع کردہ رقم واپس لے، بصورت دیگر صرف جمع کردہ رقم سے استفادہ کرلیں، اس پر ملنے والے اضافی فوائد حاصل نہ کریں۔

یادرہے:

مذکورہ بالا تحقیق اس وقت ہے، جب رقم جمع کرنے پر اضافی فوائد مشروط اورلازمی ہوں، تاہم اگر صارفین ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں اپنی مرضی کے مطابق جتنی رقم رکھنا چاہے ، رکھ سکتے ہوں اورجب بھی چاہے رقم نکال سکتے ہوں اور کمپنی بھی

اپنے ہی صوابدید پر جب چاہے اضافی فوائد (فری منٹس ،ایمیسیز اور میسیجز وغیرہ) دے اور جب چاہے ،نہ دے۔ غرض رقم رکھنے والے اور کمپنی کے درمیان رقم رکھنے پر کوئی معاہدہ نہ ہوا ہو، ہر ایک آزاد ہو، نفع مشروط نہ ہو، تو کمپنی کی طرف سے دیے جانے والے فوائد حاصل کرنا جائز ہوگا۔

"وفي الخلاصة القرض بالشرط حرام والشرط لغو بأن يقرض على أن يكتب به إلى بلد كذا ليوفي دينه..."

(الدرالمختار:فصل فی القرض)

"كل قرض جر منفعة قال الكرخي هذا إذا كانت المنفعة مشروطة في العقد بأن أقرض غلة ليرد عليه صحاحا أو ما أشبه ذلك فإن لم تكن المنفعة مشروطة في العقد فأعطاه المستقرض أجود مما عليه فلا بأس به وكذلك إذا أقرض رجلا دراهم أو دنانير"

(الفتاوی الهنديہ:الباب التاسع عشرفی القرض والاستقراض)

"وَتَأْوِيلُ هَذَا عِنْدَنَا أَنْ تَكُونَ الْمَنْفَعَةُ مُوجِبَةً بِعَقْدِ الْقَرْضِ مَشْرُوطَةً فِيهِ ، وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ مَشْرُوطَةٍ فِيهِ فَاسْتَقْرَضَ غَلَّةً فَقَضَاهُ صِحَاحًا مِنْ غَيْرِ أَنْ يَشْتَرِطَ عَلَيْهِ جَازَ ، وَكَذَلِكَ لَوْ بَاعَهُ شَيْئًا ، وَلَمْ يَكُنْ شَرَطَ الْبَيْعَ فِي أَصْلِ الْعَقْدِ جَازَ ذَلِكَ ، وَلَمْ يَكُنْ بِهِ بَأْسٌ إلَى هُنَا لَفْظُ الْكَرْخِيِّ فِي مُخْتَصَرِهِ ، وَذَلِكَ ؛ لِأَنَّ الْقَرْضَ تَمْلِيكُ الشَّيْءِ بِمِثْلِهِ فَإِذَا جَرَّ نَفْعًا صَارَ كَأَنَّهُ اسْتَزَادَ فِيهِ الرِّبَا فَلَا يَجُوزُ ؛ وَلِأَنَّ الْقَرْضَ تَبَرُّعٌ وَجَرُّ الْمَنْفَعَةِ يُخْرِجُهُ عَنْ مَوْضِعِهِ ، وَإِنَّمَا يُكْرَهُ إذَا كَانَتْ الْمَنْفَعَةُ مَشْرُوطَةً فِي الْعَقْدِ ، وَإِذَا لَمْ تَكُنْ مَشْرُوطَةً فِيهِ يَكُونُ الْمُقْتَرِضُ مُتَبَرِّعًا بِهَا فَصَارَ كَالرُّجْحَانِ الَّذِي دَفَعَهُ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فِي بَدَلِ الْقَرْضِ ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَسْتَقْرِضُ فَإِذَا خَرَجَ عَطَاؤُهُ أَعْطَاهُ أَجْوَدَ مِمَّا أَخَذَ."

(تبين الحقائق :فصل فی البيع)

"حكم اشتراط منفعة في القرض من شروط صحة القرض أن لا يكون فيه جر منفعة، فإن كان لم يجز، نحو ما إذا أقرضه وشرط شرطا له فيه منفعة أو أقرضه دراهم غلة على أن يرد عليه صحاحا لما روي أن رسول الله ﷺ قال : كل قرض جر منفعة فهو ربا هذا إذا كانت الزيادة مشروطة."

(الموسوعۃ الفقہيۃ:حكم اشتراط منفعۃ فی القرض)

"الحسابات الجارية من أنواع القروض التي تجر نفعا:القاعدة أن كل قرض جر نفعا فهو ربا . والمقصود هنا النفع الذي يجره القرض للدائن، أما المدين فإنه إنما اقترض لينتفع بالقرض. ولابد لإعمال القاعدة أن يكون هذا النفع مشروطا، قال ابن المنذر : (أجمعوا على أن المسلف إذا شرط على المستلف زيادة أو هدية فأسلف على ذلك أن أخذ الزيادة على ذلك ربا). والقاعدة (أن المعروف عرفا كالمشروط شرطا) والمدين هو البنك ،والدائن في الحسابات المصرفية هو العميل المودع للنقود في حساباته لدى البنك وهو يتلقى أنواعا متعددة من الخدمات، بل وتتسابق البنوك في تقديم الخدمات الخاصة لأصحاب هذه الحسابات."

(مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی ،الحاسابات والودائع المصرفيۃ)

"من جانب آخر إن الزيادات الأخرى المفروضة على عقود البطاقات الأخرى التي منها : الزيادة لدى تحويل العملات الأجنبية ، والزيادة المقطوعة على السحب من بنك آخر البنك المصدر للبطاقة لا يمكن أن ينظر إليها موضوعًا بمثل النظر إليها في بطاقات الإقراض ، لأنه لا يوجد هنا إقراض أصلًا حتى تعد من قبيل (كل

قرض جر نفعًا فهو ربا) . إن القرض غير موجود أساسًا في المعاملة ، حينئذ تحمل على أساس أجور للخدمات التي يقدمها البنك المصدرللبطاقة ، سواء كانت على أساس نسبة السحب ، أو قيمة الصرف ، أو السحب من بنك غير البنك المصدر للبطاقة ، أن المبلغ المقطوع ، وإن كان بعضها مبالغًا فيه مثل الإضافة المفروضة على صرف العملات الأجنبية بالإضافة إلى سعر الصرف المرتفع فهذا أمر آخر لا علاقة له بصحة العقد أو بطلانه ."

(مجلة مجمع الفقه الاسلامی ،بطاقات المعاملات المالية)

"فإن لم يكن مشروطا ولامتعارفا عليه، فللمقترض أن يقضي خيرا من القرض في الصفة أو يزيد عليه في المقدار، أو يبيع منه داره إن كان قد شرط أن يبيعها منه، وللمقرض حق الاخذ دون كراهة، لما رواه أحمد ومسلم وأصحاب السنن."

(فقه السنة:كل قرض جرنفعافهوربا)

کمپنی سے قرض لینے پر کٹوتی :

قرض لینے پر کمپنی کی طرف سے کٹوتی درست ہے۔

واضح رہے:

فقہ حنفی میں سود کے لیے جنس اور کیل میں اتحادلازمی ہے،جب کہ بیلنس اور پیسوں کی جنس ایک نہیں ہے،اس لیے کہ بیلنس سے صرف آپ بذریعہ فون بات کرسکتے ہو،یا میسجزاورنیٹ کا کوئی پیکج خرید سکتے ہو،جب کہ پیسوں سے آپ کھانے پینے اور خوردونوش کے علاوہ دیگر ساماں بھی خرید سکتے ہو۔اور نہ ہی دونوں کیلی ہیں،تو جنس ایک نہ ہونے پر کمی وبیشی درست ہوگی۔

"خرج مسألة صرف الجنس بخلاف جنسه (بمعيار شرعي) وهو الكيل والوزن فليس الذرع والعد بربا۔"
(الدرالمختار،باب الربوا)

"(مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل) أي الزيادة (والنساء) بالمد التأخير فلم يجز بيع قفيز بر بقفيز منه متساويا وأحدهما نساء (وإن عدما) بكسر الدال من باب علم ابن ملك (حلا) كهروي بمرويين لعدم العلة فبقي على أصل الإباحة۔"

(الدرالمختار،باب الربوا)

"(مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل) أي الزيادة (والنساء) بالمد التأخير فلم يجز بيع قفيز بر بقفيز منه متساويا وأحدهما نساء (وإن عدما) بكسر الدال من باب علم ابن ملك (حلا) كهروي بمرويين لعدم العلة فبقي على أصل الإباحة۔"

(الفتاوى الهندية:الفصل الثالث فی الزيادة والحط فی الصرف)

کمپنی سے قرض لینے کواجارہ بھی میں داخل کیاجاسکتاہے اور وہ اس طرح کہ کمپنی کی طرف سے آپ کو باتیں کرنے جو سہولت (وقت) ملی ہے،اس کے عوض وہ آپ سے رقم بطور اجرت لیتی ہے۔

"(أما تفسيرها شرعا) فهي عقد على المنافع بعوض، كذا في الهداية."

(الفتاوى الهنديہ :كتاب الاجاره، الباب الأول فی تفسیر الاجاره ورکنهاوالفاظہا)

"وإذا عرف أن الإجارة بيع المنفعة...."

(البدائع:فصل فی رکن الاجارۃ ومعناہا)

نوٹ: سوال مذکورہ میں ایزی پیسہ اکاؤنٹ کے متعلق دیگر مسائل دریافت کیے گئے تھے، جن میں ایک مسئلہ انشورنس کا ہے، وہ اس طرح ہے، کہ جس شخص کا اکاؤنٹ بنا ہو، کمپنی یہ آفر کرتی ہے، کہ آپ مثلا: ماہانہ سولہ سو(۱۶۰۰) روپے جمع کیا کریں، اگر آپ کو کوئی حادثہ لاحق ہوا، تو کمپنی اس نقصان کو برداشت کرے گی، اور فوتگی کی صورت میں آپ کی مکمل جمع کردہ رقم آپ کے ورثہ کو ملے گی۔ تو اس کا حکم عام بیمہ کی طرح ہے، جو کہ شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- جدید مواصلاتی ذرائع سے احکام شریعت کا نفاذ
- CC TV.FOTAGE CAMERA کے ذریعہ حادثات اور موٹروے پولیس کا جرمانہ
- ویڈیو کال کے ذریعہ نکاح
- ویڈیو کے ذریعے شوہر کا طلاق نامہ بھیجنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

- کیاجدید مواصلاتی ذرائع(موبائل ،ٹیلی فون،انٹرنیٹ،ٹی وی پیغام،مختلف لائیوپروگرامز،ریکارڈشدہ ویڈیوز،سی ۔سی۔ٹی۔وی فوٹیجز،فیس بک،واٹس ایپ،اسکائپ اورزوم وغیرہ)کے ذریعےشرعی احکام ثابت ہوں گے یانہیں؟مثلا: ان ذرائع سے قتل کرنے والے کا پتہ چل جائے،تواس سے فرانزک شناخت کے بعداس آدمی پر شرعاقاتل کا حکم لگایاجاسکتاہے،یانہیں؟اوراسی بنیادپراسے سزا کامستحق قرار دیاجاسکتاہے،یانہیں؟
- اسی طرح ان ذرائع سے نکاح منعقدہوسکتاہے؟اسی طرح اگرکہیں ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی ویڈیوکے ذریعے ثابت ہو،توملزم کو تعزیریاجرمانہ،یاسزادی جاسکتی ہے؟کبھی cctvفوٹیج کیمرہ کے ذریعے چورکاپتہ چل جاتاہے،تواس بنیاد پرکسی کو چورقرار دیاجاسکتاہے،یانہیں؟یعنی جدید مواصلاتی ذرائع سے حدود،تعزیرات اوردیگر عقودومعاملات شرعاثابت ہوں گے ،یانہیں؟
- بعض عورتوں کا نکاح (گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول) ہونے کے بعدرخصتی سے قبل یابعداس کے شوہرباہرممالک میں جاکررہائش اختیارکرتے ہیں ،وہاں بعض اوقات وہ دوسری شادی بھی کرلیتے ہیں ،پہلی بیوی کے پاس آنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے ہیں اورنان نفقہ وحقوق زوجیت بھی آدانہیں کرتے ہیں۔اورعورتیں پوچھتی ہیں ،کہ ہم کیاکریں؟آٹھ ،دس سال ہوگئے ہیں ،کہ ان کے شوہرباہرممالک میں ہیں ،لیکن ان عورتوں کے حقوق آدانہیں کرتے ہیں۔

اب پوچھنا یہ ہے کہ کیامذکورہ عورتوں کے لیے شوہروں سے چھٹکارا(خلاصی)حاصل کرنے کاشریعت میں کوئی طریقہ ہے،یانہیں؟یاان کو طلاق دینے کے لیے شوہروں سے اجازت لیناضروری ہے؟

الجواب حامداومصليا

واضح رہے:

شریعت مطہرہ میں ایک طرف حدودوقصاص کو ادنی شبہ سے ساقط کرنے کاحکم دیاہے،یہاں تک کہ شریعت مطہرہ میں عورتوں کی چشم دید گواہی بھی قابل قبول نہیں ہے،چہ جائیکہ جدید ذرائع پرفیصلہ کیاجائے۔اورمحض گواہی بھی قابل قبول نہیں ہے،بلکہ گواہ بھی عاقل،بالغ ،دیانت دار،گواہی دینے کی وجہ دشمنی اوریامحض نفع حاصل کرنے کی بنیادپرنہ ہو۔

قال فی " الھندیہ":

"أماالثانی فانواع:ما یرجع الی الشاہد،وھوالعقل،والبلوغ والحریۃ،والبصر،والنطق،وأن لایکون محدودافی قذف عندنا،وأن یشھدللہ تعالی ،ولایجرالشاھدالی نفسہ مغنما،ولایدفع عن نفسہ مغرما،وأن یکون عالما بالمشھودبہ،لاعندھما۔ھکذافی البدائع۔"

(450/3ط:رشیدیہ)

"عن ابن عباس رضی اللہ عنھماعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:لویعطی الناس بدعواھم لادعی ناس دماء رجال وأموالھم،ولکن الیمین علی المدعی علیہ،رواہ مسلم ---عن ابن عباس رضی اللہ عنھما مرفوعا:لکن البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر۔"

(مشکواۃ المصابیح،باب الأقضیۃ)

"قال النووی:
ھذالحدیث قاعدۃ شریفۃ کلیۃ من قواعد احکام الشرع ففیہ أنہ لایقبل قول الانسان فیمایدعیہ بمجرد دعواہ ،بل یحتاج الی بینہ أوتصدیق المدعی علیہ۔"

(مرقاہ المفتاتیح:ج۷،ص ۲۵۰،ط:متکبہ امدادیہ،ملتان)

جب کہ دوسری طرف بہت سارے قرینوں کے ذریعے حدودوقصاص وغیرہ کے فیصلہ مرتب کیے گئے ہیں۔

لیکن یادرہے ،وہ محض قرینہ نہیں ہوتاہے بلکہ قطعی اوریقینی ہوتاہے،جس سے اٹھنے والااحتمال بغیرکسی دلیل کے ہوتاہے(اصول فقہ کی اصطلاح میں :الاحتمال غیرناشئی عندلیل)اس قرینہ پر قطعی حکم لگے گا۔مثلا: قاتل مقتول کے گھرسے نکلے،اس کے ہاتھ میں خون لگے اوزارہو،گھرمیں اس کے علاوہ کوئی ایک نہ ہواورمقتول تازہ خون سے لت پت ہو،یاقاتل کے گھرسے نکلے سے خون کے ٹپکتے قطرے ہوں۔تو اس وقت اس کو قاتل سمجھاجائے گا۔اوریہ کہنا: کہ شایداس دوران کوئی اوردیوارپھلانگ کرکے آیاہو،قابل سماعت نہ ہوگا۔یاجیساکہ ایک غیرشادی شدہ خاتون کا حمل ظاہرہو،تو اس سے وہ زانیہ ہی شمارہوگی۔یاجیساکہ سیدناحضرت یعقوب علی نبیناوعلیہ الصلوہ والسلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قمیص پرخون کےنشانات دیکھے ،لیکن باوجودیکہ قمیص کئی سے پھٹاہوانہ تھا،توآپ علیہ السلام نے بیٹوں پر جھوٹے ہونے کا الزام لگایا۔اسی طرح غزوہ بدرمیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل ابی جہل اورمال غنیمت کافیصلہ تلوارپرلگے خون سے کیا۔یاجیساکہ :خاتون نے ایک مردپر زناکا الزام اس طرح لگایا،کہ انڈہ کی سفیدی اپنےکپڑوں اور رانوں پرمل لیااوریوں حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں زناکا فیصلہ دائرکیا،جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرم پانی ڈالنے سے وہ سفیدی جم گئی سونگنے سے انڈہ کی بوآنے لگی ،جس سے اس کا کیس خارج کردیا۔

"القضاء بالقرينة القاطعة : القرينة لغة : العلامة ، والمراد بالقرينةالقاطعة في الاصطلاح ما يدل على ما يطلب الحكم به دلالة واضحة بحيث تصيره في حيز المقطوع به ، كما لو ظهر إنسان من دار ، ومعه سكين

في يديه ، وهو متلوث بالدماء ، سريع الحركة ، عليه أثر الخوف ، فدخل إنسان أو جمع من الناس في ذلك الوقت ، فوجدوا بها شخصا مذبوحا لذلك الحين ، وهو متضمخ بدمائه ، ولم يكن في الدار غير ذلك الرجل الذي وجد على الصفة المذكورةوهو خارج من الدار ، فإنه يؤخذ به ، إذ لا يشك أحد في أنه قاتله واحتمال أنه ذبح نفسه ، أو أن غير ذلك الرجل قتله ثم تسور الحائط وهرب ، ونحو
ذلك ، فهو احتمال بعيد لا يلتفت إليه ، إذ لم ينشأ عن دليل . ولا خلاف بين فقهاء المذاهب في بناء الحكم على القرينة القاطعة ، مستدلين بالكتاب والسنة وعمل الصحابة :على الأثر في السيف .
وأما عمل الصحابة ، فمنه حكم عمر رضي الله عنه برجم المرأة إذا ظهر بهاحمل وليس لها زوج . وجعل ذلك يقوم مقام البينة في أنها زانية ، وكذلك السكران إذا قاء الخمر ."

(القضاء بالقرينة القاطعة:244/1)

"الأخذ بالقرائن :قال ابن فرحون رحمه الله في تبصرته ناقلا عن الإمام ابن العربي الفقيه المالكي قوله : على الناظر أن يلحظ الأمارات والعلامات إذا تعارضت ، فما ترجح منها مضى بجانب الترجيح ، وهو قوة التهمة ، ولا خلاف في الحكم بها ، وقد جاء العمل بها في مسائل اتفقت عليها المذاهب الأربعة ، وبعضها قال به المالكية خاصة .على أن ضبط كل الصور التي تعمل فيها القرينة أمر مستبعد ، إذ أن الوقائع غير محدودة ، والقضايا متنوعة ، فيستخلصها القاضي بفهمه وذكائه...."

(القرائن القاطعة وغيرالقاطعة:157/33)

والسنة وعمل الصحابة :فأما الكتاب ، فقوله تعالى { وجاءوا على قميصه بدم كذب } فقد روي أن إخوة يوسف لما أتوا بقميصه إلى أبيهم تأمله ، فلم ير خرقا ولا أثر ناب ، فاستدل به على كذبهم .وأما السنة فما وقع في غزوة بدر لابني عفراء ، لما تداعيا قتل أبي جهل . فقال لهما رسول الله ﷺ هل مسحتما سيفيكما ؟ فقالا : لا .فقال : أرياني سيفيكما ، فلما نظر إليهما قال : هذا قتله ، وقضى له بسلبه . فاعتمد ﷺ على الأثر في السيف .وأما عمل الصحابة ، فمنه حكم عمر رضي الله عنه برجم المرأة إذا ظهر بها حمل وليس لها زوج . وجعل ذلك يقوم مقام البينةفي أنها زانية ، وكذلك السكران إذا قاء الخمر . وقد ساق ابن القيم كثيرا من الوقائع التي قضى فيها الصحابة رضي الله عنهم بناء على القرائن ، وانتهى إلى تفسير قوله ﷺ البينة على المدعي بأن المراد بالبينة ما يظهر صحة دعوى المدعي . فإذا ظهر صدقه بأي طريق من طرق الحكم ، ومنها القرينة ، حكم له .

(القضاء بالقرينة القاطعة:ج١،ص٢٤٣)

عبارت مذکورہ بالاعبارتوں پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتاہے ،کہ گواہ ہر وہ چیزہے جودعوی کو حقیقی اوریقینی طورپر ثابت کرے۔چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں :

"وقد ساق ابن القيم كثيرا من الوقائع التي قضى فيها الصحابة رضي الله عنهم بناءعلى القرائن ، وانتهى إلى تفسير قوله ﷺ البينة على المدعي بأن المراد بالبينة ما يظهر صحة دعوى المدعي . فإذا ظهر صدقه بأي طريق من طرق الحكم ، ومنها القرينة ، حكم له ...."

(الموسوعة الفقهية الكويتيہ:حدالسرقہ:335/34)

اسی طرح اگرکسی نے اپنی بیوی سے کہا: یہ حمل مجھ سے نہیں ہے۔تو لعان ثابت نہ ہوگا،کیونکہ یہ یقینی نہیں ہے کہ بیوی کا حمل ٹھیراہے ،یانہیں۔چنانچہ صاحب ہدایہ فرماتے ہیں :

"واذاقال الزوج :لیس حملک منی فلالعان ۔وھذاقول ابی حنیفہ وزفر(رحمھمااللہ)؛لانہ لایتیقن بقیام الحمل فلم یصرقاذفاوقال ابویوسف ومحمد(رحمھما اللہ)اللعان یجب بنفی الحمل اذاجا ءت لاقل من ستتہ اشہر۔وھوماذکرنا فی الاصل ؛لاناتیقنابقیام الحمل عندہ فیتحقق القذف۔"

(باب اللعان:ج ۲،ص ۳۹۸)

یہاں قابل غورنکتہ یہ ہے:کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ صرف اس بنیاد پرلعان کی نفی کرتے ہیں،کہ حمل کا یقین نہیں ہے ،جب کہ آج کے آلٹرساؤنڈ سسٹم حمل واضح کرکے دکھا سکتاہے اورجدید آلات اس کے ساتھ ساتھ بچے کے خون کا گروپ بھی بتاسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اوریہ قرینہ انتہائی یقینی ہے۔

لہٰذاکسی بھی قسم کے مواصلاتی ذرائع(موبائل ،ٹیلی فون،انٹرنیٹ،ٹی وی پیغام،مختلف لائیوپروگرامز،ریکارڈشدہ ویڈیوز،سی ۔سی۔ٹی۔وی فوٹیجز،فیس بک،واٹس ایپ،اسکائپ اورزوم وغیرہ)کے ذریعے تحقیق کیے بغیرجنائی احکام ثابت نہیں ہوں گے۔مثلا: ان ذرائع سے قتل کرنے والے کا پتہ چل جائے،تواس سے فرانزک شناخت :(جدید سائنسی بنیادوں پر مجرم کی تحقیق : مثلا:جائے واردات میں استعمال ہونے والے اوزار،یاگولی وغیرہ کے خول،استعمال ہونے والے اوزار پر لگے خون،جائے واردات کی مٹی ،یہاں تک کہ مجرم کے پہنے والے لباس یا اس کے ٹکڑے کی سائنسی بنیادوں پر ریسرچ اورلیبارٹری ٹیسٹ کرنا۔)کے بعداس آدمی پر شرعاقاتل ،یاچورکا حکم لگانے میں قدرتفصیل ہے،محض جدیدآلات کو قطعی قرینے کا حکم دینے کے باوجود اس کے ذریعے ہرحال میں قصاص جاری ہوگا اورنہ ہی اسی بنیاد پراسے سزا کا مستحق قراردیاجاسکتاہے۔البتہ اگرمجرم اسی کے ساتھ اعتراف جرم کرے،یامدعی گواہ پیش کرے۔تو یہ ذرائع بطورتائیدکارآمد ہوں گے۔

واضح رہے:

جدید مواصلاتی ذرائع سے ثابت ہونے والے جرم کا اکثروبیشترمجرم خوداعتراف کرتاہے۔لیکن اگروہ کسی صورت اقرارنہ کرے اورنہ ہی عینی گواہ موجودہوں،تومحض آلات جدیدہ سے ثابت شدہ جرم انتہائی دیانت اور صفائی کے ساتھ پیش کرناضروری ہے۔

اسی طرحD.N.A.test(جس میں انسانی خلیوں پر ریسرچ کرکے اس کے خاندان وغیرہ کا شناخت کیاجاتاہے) CC fotage cameraاورfinger prentsکا کردارومدارانسانی عمل اور مشین کی کارکردگی پر مبنی ہےاوردونوں خطا کے امکان سے خالی نہیں ہے۔لہٰذااس سے چوری یا کوئی اور حد وقصاص سے تعلق رکھنے والاجرم ثابت کرنا،یاڈی این اے ٹیسٹ

کے ذریعہ نسب ثابت کرنا اور یالعان ثابت کرنے میں قدر تفصیل ہے۔ہر حال میں جدید مواصلاتی ذرائع کو قرینہ قطعیہ کا حکم دینا درست نہیں ہے۔

قال فی "الھندیۃ":

"السرقۃ انماتظہرباحدالامرین:اماالبینۃ أوالاقرار۔"

(کتاب السرقۃ:171/2)

"ویثبت باقرارمرہ وبشہادہ رجلین‌کمافی سائرالحقوق۔"

(کتاب السرقۃ:160/2)

اس حوالہ سے مجمع فقہی اسلامی مکہ میں جو مجلس منعقد ہوئی ،اس میں یہ نکتہ بھی زیر غور آیا:

"لایجوزشرعا الاعتماد علی البصمۃ الوراثیۃ فی نفی النسب ،ولایجوزتقدیمھاعلی اللعان۔"

(۱۹مایو،۲۰۱٦)

ڈاکٹر وھبہ الزحیلی فرماتے ہیں:

"وتقدم علی البصمہ الوراثیہ الطرق المقررہ فی شریعتنالاثبات النسب کالبینہ والاستلحاق والفراش ای علاقہ الزوجیہ؛لان ھذہ الطرق أقوی فی تقدیرالشرع،فلایلجا الی غیرھا من الطرق ،کالبصمہ الوراثیہ والقیافہ الاعندالتنازع فی الاثبات وعدم الدلیل الاقوی۔"

(بحوالہ: ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے شرعی مسائل کا حل، مولانابدرالحسن قاسمی صاحب)

تاہم ان ذرائع سے تائیدحاصل کی جاسکتی ہے۔مثلا: قتل کے موقع میں پانچ بندے پکڑے گئے ہیں ،ان کا قتل کرنا یقینی ہے، لیکن متعین نہیں ہے،تو اس وقت ڈی این اے ٹیسٹ سے مدد لیاجاسکتاہے۔یاایسے معاملے میں جہاں کسی حکم کے ثبوت کا کوئی یقینی ذریعہ تصدیق یاتردیدنہ ہو،توجدیدآلات کے ذریعہ سہارالیاجاسکتاہے۔مثلا: بے گناہ بندے پر قتل کا الزام لگایاگیا،تو فنگرپرنٹس ،یافرانزک ٹیسٹ کے ذریعے قاتل ثابت نہ ہوسکا،تو بری قرار دیاجائے گا۔اور خاص کرزنامیں چار گواہوں کا ملنابہت مشکل ہے اور ویسا بھی زنا کاارتکاب انتہائی خفیہ مکان پر کیاجاتاہے،سابقہ ادوار میں بھی زنا کی ثبوت اقرار کے تحت ہوئی ہے،جب کہ آج کے دور میں کون اقرار کرے گا۔۔۔۔؟اس سے مزید عورت ظلم اور تشدد کا نشانہ بنتی رہے گی۔لہٰذاجدید مواصلاتی ذرائع (منی ٹیسٹ وغیرہ) سے مجرم کو تعزیری سزادی جائے گی۔

(بحوالہ مجمع فقہی مجلس مکہ:۱۹جنوری،۲۰۱٦)

(تفتیش جرائم اور اسلام: ص ۳۰۷)

شراب نوشی ہر دور کے سنگین جرائم میں سے شمار ہوئی ہے اور معاشرہ میں نہ ختم ہونے والے جرائم کا پیش خیمہ بھی ہے۔اس میں اگرامام محمد رحمہ اللہ کے قول پر اگرفتوی دیاجائے تو بہتر ہوگا۔کیونکہ حضرات شیخین کے نزدیک شراب نوشی جرم کے اثبات میں قدر سختی ہے :کہ گواہ شراب پینے کے وقت موجود ہوں۔عدالت تک پہنچنے میں شراب کی بوزائل نہ ہو۔جب کہ امام محمد رحمہ اللہ کے ہاں مطلق گواہ متعبرہے،البتہ ایک ماہ کے اندر گواہی قابل قبول ہے۔تواس صورت میں

اگرجدید مواصلاتی ذرائع سے تعاون لینے پر مجرم کو تعزیری سزادی جائے ،توبہتر ہوگا۔ورنہ آج کے معاشرہ یہ سنگین جرم زندگی کے ہر موڑپر اپنااثر دکھاتاہے اورخاص کر ڈرائیونگ کے دوران تو قیمتی جانوں کا ضیاع بھی کا سبب بھی اکثریہی جرم ہے۔

(تفتیش جرائم اوراسلام : ص ۳۰۱۱)

یامثلا: ہسپتال میں زچگی سینٹر میں کسی وجہ سے جدانہ ہوسکے اوریہ پتہ نہ چلے کہ کون کس کابچہ ہے؟تواس وقت ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعہ تعاون لیاجاسکتاہے۔یادوران جنگ ،یاکسی اورحادثہ میں بچوں کی شناخت نہ ہوسکے تواس وقت بھی ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعہ تعین کیاجاسکتاہے۔ اسی طرح موٹروے والوں کا سی سی ٹی وی فوٹیج کیمرہ کے ذریعہ،یاسپیڈمیٹرچیکنگ کے ذریعہ کسی کار کی تیزرفتاری ریکارڈکرنے پر عمل کیاجائے گا۔

(بحوالہ مجمع فقہی مجلس مکہ :۱۹جنوری،۲۰۱۶)

(تفیش جرائم اوراسلام : ص ۳۳۱)

<u>خلاصہ :</u>فنگرپرنٹس،ڈی این اے ٹیسٹ،فرانزک ٹیسٹ اوریامنی ٹیسٹ وغیرہ سے درجہ ذیل اشیاء کا ثبوت ہوتاہے :

- جدید مواصلاتی ذرائع اورفرانزک ٹسٹ وغیرہ سوفیصد یقینی قرینے نہیں ہیں۔(بشرطیکہ دیانت اور صفائی کے ٹیسٹ تیارکیاگیاہو)
- قاتل کے قتل پر کوئی چشم دید گواہ نہ ہواورنہ ہی اعتراف جرم ہو،توجدیدذرائع سے بری ہوگا۔
- قاتل کے قتل پر گواہ نہ ہو،لیکن اسے اوزاروغیرہ برآمدہوجائے،یاقمیص پر خون کے دھبے ہو،توجدید ذرائع کے ذریعہ سے ثبوت پر تعزیری سزادی جاسکتی ہے۔
- قاتل کے قتل پرچشم دیدگواہ ہیں۔توجدیدآلات کو نظرانداز کیاجائے گا۔
- چوری پر چشم دیدگواہ نہ ہوں،توفنگرپرنٹس کے ذریعہ اسے بری قراردیاجاسکتاہے۔
- چوری پر چشم دیدگواہ ہوں،جدیدذرائع سے چورثابت ہوجائے،تومسروقہ مال کامطالبہ کرنادرست ہے۔
- شراب پی کرمنہ کاذائقہ کسی طرح زائل کرے،توجدیدذرائع سے اسے تعزیری سزاکا مستحق قراردیاجاسکتاہے۔
- زچگی سینٹرمیں موجودنومولوبچوں کے نسب کی شناخت ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعہ معتبرقراردیاجائے گا۔
- کسی دھماکے یاحادثے میں بچے ہوئے بچوں کی نسبی شناخت کے لیے ڈی این اے ،یاکوئی اورجدیدذریعہ قابل قبول شمار ہوگا۔
- کسی پر زناکاالزام ہو،البتہ گواہ نہ ہو،توجدیدذرائع سے بری ہوگا۔
- زناکیاہوالبتہ گواہ نہ ہو،تومنی ٹیسٹ کے ذریعہ تعزیری سزاکا مستحق قراردیاجاسکتاہے۔

- شوہر نے بیوی پر زنا کا الزام لگایا، یا نسب کی نفی کی۔ جب کہ گواہ کسی کے پاس نہیں ہیں، تو لعان واقع ہوگا۔ اس وقت جدید ذرائع پر عمل درآمد نہ ہوگا۔ (کیونکہ فقہ علی المذاہب میں عبارت مذکور ہے: کہ لعان، یا نفی نسب میں ڈی این اے ٹیسٹ کو ترجیح نہ ہوگی۔)
- آواز میں اتار چڑھاؤ کی وجہ سے یقینی علم نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے ریکارڈنگ شدہ الفاظ، یا ویڈیو سے مجرم ثابت نہ ہوگا۔ تاہم تعزیری سزا دی جاسکتی ہے۔
- زوجہ عنین کی بکارت ٹیسٹ کے ذریعہ معلوم ہونے پر نکاح ختم ہوگا۔

(تفتیش جرائم اور اسلام: ص ۳۳۱)

تعزیری سزائیں:

تعزیر مالی (مالی جرمانہ) کے متعلق حضرات فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں کافی تفصیلی بحث کی ہیں، ان تمام تفصیلات اور بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ حضرات طرفین کے نزدیک مالی جرمانہ سرے سے جائز نہیں ہے اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حاکم وقت کے لئے تعزیر مالی کو جاری کرنا جائز و درست ہے۔ اور ساتھ میں یہ بات واضح رہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تعزیر مالی کا جواز مطلقاً ہر جگہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ جہاں پر ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو مصلحت سمجھے گی وہاں پر جاری کرے گی۔ اور فقہاء نے حضرات طرفین کے نزدیک عدم جواز کی جو بات نقل فرمائی ہے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تعزیر مالی شروع اسلام میں جائز تھی بعد میں یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے، لیکن فقہ السنہ کے اندر منسوخ ہونے کی بات کی تردید کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مالی جرمانہ شروع اسلام میں جائز تھا بعد میں منسوخ ہوچکا ہے، ان لوگوں کے پاس منسوخ ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل کے ہے؛ اس لئے یہ حکم آج بھی بدستور باقی ہے؛ لہٰذا جہاں ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو جاری کرنا مصلحت سمجھے گی وہاں آج بھی تعزیر مالی (مالی جرمانہ) جاری کرنے کی گنجائش ہے۔

اور اگر وقتی طور پر کچھ مال ضبط کرکے رکھ لیں اور بعد میں جب وہ اپنے جرم سے تائب ہوجائے تو اسے واپس کردیں، تو ایسا کرنا سب کے نزدیک جائز ہے اور تائب نہ ہونے کی صورت میں امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق متاثر کے حوالہ کرنے کی گنجائش ہے۔ اب فقہاء کے جزئیات ملاحظہ فرمائیے:

"فقہ السنہ"

"ومن قال: إن العقوبة المالية منسوخة فقد غلط على مذاهب الأئمة نقلا واستدلالا، وليس يسهل دعوى نسخها والمدعوون للنسخ ليس معهم سنة، ولا إجماع يصح دعواهم. "

(فقه السنة ٢/ ٥٣٥)

"وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ الأموال جائز للإمام.

(تبيين الحقائق قديم مكتبه إمداديه ملتان ٣/ ٢٠٨، جديد زكريا ٣/ ٦٣٤)

''وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ المال جائز للإمام، وعندہما والشافعي ومالک وأحمد لا يجوز بأخذ المال، وما في الخلاصۃ: سمعت من ثقۃ أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضی ذلک أو الوالي جاز، ومن جملۃ ذلک رجل لا يحضر الجماعۃ يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلک من المشايخ لقول أبي يوسف۔"

(حاشیۃ چلپی علی الزیلعي، قدیم ۳/ ۲۰۸، جدید زکریا ۳/ ۴۳۴)

ویڈیو کال یا کانفرنس کال اور عام کال سے نکاح منعقد نہیں ہوتا ہے، نکاح کے لیے ایجاب وقبول ایک ہی مجلس میں گواہوں کی روبرو ضروری ہے، جب کہ موبائل کال والا کہیں اور ہوتا ہے اور کال وصول کرنے والا کہیں اور ہوتا ہے۔

اسی طرح کانفرنس کال میں بھی شریک لوگوں کی مجلس ایک نہیں ہوتی ہے۔ جن علماء کرام نے ویڈیو کال، یا کانفرنس کال خط پر قیاس کیا ہے کہ جیسا خط میں نکاح کا پیغام ہو اور قاصد یا وکیل اس کو اگلی مجلس تک منتقل کرے اور وہاں بیٹھے لوگوں کے روبرو شوہر یا خاتون اور یا ان دونوں میں سے کسی ایک کا وکیل قبول کرے ،تو ایسی صورت میں نکاح درست ہو جاتا ہے، جب کہ ویڈیو کال، یا کانفرنس کال میں ایک تو مجلس ایک نہیں ہوتی ہے ،دوسرا یہ کہ کال کرنے والے کی طرف سے الگ گواہ ہوتے ہیں ،جب کال وصول کرنے والے کی طرف سے الگ گواہ ہوتے ہیں ،جس میں نہ مجلس ایک ہوئی اور نہ ہی گواہ ایک بنے۔ جب کہ خط میں اگر ایک طرف سے قاصد یا وکیل ہوتا ہے، تو دوسری طرف گواہ اور مجلس ایک ہی ہے، جس کو فقہاء کرام نے حکما ایک مجلس قرار دیا ہے۔

ویڈیو ریکارڈ، یا ویڈیو کال سے نہ طلاق ثابت ہوتی ہے اور نہ ہی دیگر جنایات کے لیے بطور ثبوت پیش کیے جاسکتے ہیں۔

البتہ ایک قرینہ کی حد تک شریعت نے اعتبار دی ہے۔ ویڈیو، یا آڈیو ریکارڈ کے بعد اگر شوہر طلاق کا اقرار کرتا ہے، تو طلاق واقع ہونے میں کوئی شک نہیں۔ بصورت دیگر اگر خاتون شوہر کی طرف سے طلاق دینے پر گواہ پیش کرے، تب بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔ ورنہ ویڈیو اور آڈیو ریکارڈ سے قاضی کی عدالت میں کچھ بھی ثابت نہ ہوگا۔ البتہ یہ الگ مسئلہ ہے، کہ اگر شوہر نے واقعتاً طلاق دی ہو، تو اللہ تعالی کے نزدیک مجرم اور گناہ گار ہوگا۔

"وقال الثورى وأبو حنيفة وأصحابه : الحكم بالقافة باطل وذلك تخرص وحدس لا يجوز ذلك فى الشريعة قالوا وليس فى حديث أسامة حجة فى إثبات الحكم بالقافة ؛ لأن أسامة قد كان ثبت نسبه قبل فلم يحتج النبى (ﷺ) فى ذلك إلى قول أحد ولولا ذلك لما كان دعا أسامة فيما تقدم إلى زيد . وإنما تعجب من إصابة مجزز كما يتعجب من ظن الرجل الذى يصيب بظنه حقيقة الشىء ولا يجب الحكم بذلك ، وترك الإنكار عليه لأنه لم يتعاط بقوله إثبات ما لم يكن ثابتا فيما تقدم۔۔۔"

(شرح صحيح البخارى لابن بطال:كتاب الفرائض386/8)

"وقال الكوفيون والثوري وأبو حنيفة وأصحابه الحكم بها باطل لأنها حدس ولا يجوز ذلك في الشريعة وليس في حديث لباب حجة في إثبات الحكم بها لأن أسامة قد كانثبت نسبة قبل ذلك ولم يحتج الشارع في إثبات ذلك إلى قول أحد وإنما تعجب من إصابة مجزز كما يتعجب من ظن الرجل الذي يصيب ظنه حقيقة الشيء الذي ظنه ولا يجب الحكم بذلك وترك رسول الله الإنكار عليه لأنه لم يتعاط بذلك إثبات ما لم يكن ثابتا وقد قال تعالى ولا تقف ما ليس لك به علم----"

(الإسراء: 36)

(عمده القاری:باب القائف:172/34)

جن قرینوں کو فقہاء نے اعتبار دیا ہے:

ولا خلاف بين فقهاء المذاهب في بناء الحكم على القرينة القاطعة ، مستدلين بالكتاباعتبار العلماء بالقرائن التي تولدت عنها ، وهذا البعض منها ---

- **شبہ زفاف میں ہبہ کی ہوئی لونڈی سے ہم بستری کرنا،گواہ نہ ہونے کے باوجود درست ہے۔**

الأولى : أن الفقهاء كلهم يقولون بجواز وطء الرجل المرأة إذا أهديت إليه ليلةالزفاف ، وإن لم يشهد عنده عدلان أن هذه فلانة بنت فلان التي عقد عليها ،وإن لم يستنطق النساء أن هذه امرأته التي عقد عليها ، اعتمادا على القرينة الظاهرة ، المنزلة منزلة الشهادة .

- **نابالغ بچہ کا کسی کی طرف سے لائے ہوئے ہدیہ کا قبول کرنا درست ہے۔**

الثانية : اعتماد الناس قديما وحديثا على الصبيان والإماء المرسلة معهم الهدايا إليهم ، فيقبلون أقوالهم ، ويأكلون الطعام المرسل به .

- **چھوٹے بچوں کا اجازت لیے بغیر کسی گھر میں داخل ہونا۔**

الثالثة : أنهم يعتبرون إذن الصبيان في الدخول للمنزل .

- **ایسی چیز کا اٹھانا جس کا مالک معلوم نہ ہو اور یا وہ خود اٹھانے پر ناراض نہ ہو جائے۔**

الرابعة : جواز أخذ ما يسقط من الإنسان إذا لم يعرف صاحبه ، وما لا يتبعه الإنسان نفسه لحقارته ، كالتمرة والفلس ، وكجواز أخذ ما بقي في الحوائط من الثمار والحب بعدانتقال أهله منه وتخليته وتسييبه ، كجواز أخذ ما يسقط من الحب عند الحصاد مما لا يعتني صاحب الزرع بلقطه ،وكأخذما ينبذه الناس رغبة عنه من الطعام والخرق وغير ذلك من المحقرات .

- **راستہ میں کسی سبیل سے پانی پینا۔**

الخامسة : الشرب من المصانع الموضوعةعلى الطرقات وإن لم يعلم الشارب إذن أربابها في ذلك لفظا ، اعتمادا على دلالة الحال .

- **ملے ہوئے مال پر مسلمانوں کی کوئی علامت ہو،تو لقطہ،ورنہ رکاز ہوگا۔**

السادسة : قولهم في الركاز : إذا كان عليه علامة المسلمين أنه كنز ، ويأخذ حكم اللقطة ، وإن كانت عليه علامات الكفر كالصليب ونحوه ، فإنه ركاز .

- **وکیل کا سامان فروخت کرنا اور قیمت وصول کرنادرست ہے۔**

السابعة : أنه يجوز للوكيل على بيع السلعة قبض ثمنها ، وإن لم يأذن له الموكل في ذلك لفظا ، اعتمادا على قرينة الحال .

- **قسم سے انکار کرنے پر اس کے خلاف فیصلہ کرنا.**

الثامنة : القضاء بالنكول واعتباره في الأحكام ، وليس ذلك إلا رجوعا إلى مجرد القرينةالظاهرة ، فقدمت على أصل براءة الذمة .

- **لقطہ کا وصف بیان کرنے والے کو لقطہ دیا جائے گا۔**

التاسعة : جواز دفع اللقطة لواصف عفاصها ووكائها .

- **قرینہ کو دیکھ کر خنثی کے مرد یا مونث کا فیصلہ کرنا۔**

العاشرة : النظر في أمر الخنثى ، والاعتماد فيه على الأمارات والقرائن الدالة على إحدى حالتيه الذكورة أو الأنوثة .

- **باکرہ عورت سے اجازت لینے کے دوران خاموشی کو اجازت قرار دینا درست ہے۔**

الحادية عشرة : معرفة رضا البكر بالزوج بصماتها .

- **بغیر کسی مانع شرعی وطبعی کے منکوحہ کے ساتھ اکھٹے رہنے کو جماع کا قائم مقام قرار دینا۔**

الثانية عشرة : إذا أرخى الستر على الزوجة وخلا، بها ، قال أصحابنا : إذا طلقها وقال إنه لم يمسها وادعت هي الوطء صدقت ، وكان لها الصداق كاملا .

(القرائن القاطعه وغيرالقاطعه:ج٣٣ص١٥٧)

<u>نفقہ نہ دینے کی تین صورتیں ہیں:</u>

- شوہر مال دار ہو، بیوی تنگ دست ہو، خود کئی سے نان نفقہ جمع کرنے پر قدرت نہ رکھتی ہو، تو اس صورت میں حضرت امام مالک کے قول پر عمل کرنا درست ہوگا۔
- شوہر مال دار ہو، بیوی نان نفقہ پر قدرت رکھتی ہے۔ بایں صورت کہ یا تو خود سرمایہ دار ہو اور یا کسی محرم نے نفقہ کے اخراجات برداشت کرنے کی ذمہ داری لی ہو، تو اس وقت بھی حضرت امام مالک کے قول پر عمل کرنا درست ہوگا، کیونکہ نان نفقہ شوہر کے ذمہ ہے اس کا بیوی کے سرمایہ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(وعلى المولودله رزقهن وكسوتهن بالمعروف۔۔۔)(البقرہ)

چاہیے کہ وسعت والا اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے۔(طلاق)

ألاوحقهن عليكم أن تحسنوااليهن فى كسوتهن وطعامهن۔

سنن الترمذى:باب حق المرأه على زوجها:ج٢،ص ٣٥٨ط:دارالعرب الاسلامى)

اس پر سب کا اتفاق ہیں کہ مال دار عورت کا نفقہ بھی شوہر کے ذمہ واجب ہے۔

وذكرالكرخى:أنه يعتبربحالهما جميعا حتى لوكاناموسرين فعليه نفقه اليسار،وان كانامعسرين فعليه نفقه الاعسار،وكذلک اذاكان الزوج معسرا والمرأه موسره ولاخلاف فى هذه الجمله فاماذاكان الزوج موسرا والمرأه معسره فعليه نفقه اليسار على ماذكره الكرخى۔

(بدائع الصنائع ،فصل:أمابيان مقدارالواجب منها:24/4ط:دارالفكر)

''طریق تطلیق زوجہ المفقودأوالغائب الذی تعذرالارسال،أوأرسل الیہ ،فتعاندان کان لعدم النفقہ فان الزوجہ تثبت لشاھدین أن فلان زوجھا،وغائب عنھا،ولم یترک لھانفقہ،ولاوکیلابھا،ولاأسقطتھاعنہ،وتحلف علی ذلک،فیقول الحاکم:فسخت نکاحہ،أوطلقت منہ۔''
(الحیلہ الناجزہ للحلیلہ العاجزہ:ص۱۸۱)

چونکہ خاوندنان ونفقہ نہیں دیتا،اس لیے عورت کو اختیارہے کہ اگرچاہےتوکسی مسلمان حاکم یادیندار مسلمانوں کی پنچائیت میں اپنامعاملہ پیش کرکے تفریق کاحکم حاصل کرے اور بعد عدت دوسری جگہ نکاح کرے۔

تفصیل کے لیے: (فتاوی دارالعلوم دیوبند: ج۲،ص ۵۶۹)

- شوہر تنگ دست ہو،نان نفقہ پر قدرت نہ رکھتا ہو،تب بیوی کو فقہی حنفی کے مطابق شوہر کے ساتھ رہنے کا حکم دیاجائے گا۔اور بیوی کو قرض لینے کا کہاجائے گا،جو بعد میں شوہر یاکسی اور رشتہ دار سے وصول کیاجائے گا۔

''واذاعجزالزوج عماوجب علیہ من النفقہ علی التفصیل السابق ،وطلبت الزوجۃ التفریق بینھاوبین زوجھابسبب ذلک ،فعندالمالکیۃ والشافعیۃ والحنابلۃ یفرق بینھما،وذہب الحنفیۃ الی أنہ لایفرق بینھما بذلک ،بل تستدین علیہ ،ویؤمربالاداء من تجب علیہ نفقتھا لولاالزوج۔''
(الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ:254/5)

اب سوال یہ ہے:کہ خروج عن المذہب کے لیے کیاشرط ہے؟ہمارے بعض فقہاء نے یہ قیدلگائی ہے،کہ اگربیوی کوزنامیں پڑجانے،یاتنگدستی وافلاس میں پڑجانے کاخطرہ ہو،تومذہب مالکیہ پر عمل ہوگا۔جب کہ جمہور احناف مطلّقا یہاں حضرت امام مالک کے مذہب پر عمل کرتے ہیں۔اس لیے کہ متعنت کی تعریف میں یہ قیدیں نہیں ہے۔

متعنت:جونان ونفقہ پر قدرت کے ہونے کے باوجودبیوی کو محروم کرے۔

''ففی المدونۃ:قال لنامالک:وکل من لم یقوعلی نفقہ امرأتہ فرق بینھما،ولم یقل لنا:مالک :حرہ أوامہ،وقال:لان الرجل اذاکان معسرالایقدرعلی النفقۃ،فلیس لھاعلیھا النفقۃ،انمالھاأن تقیم معہأویطلقھا۔''

(تفصیل کے لیے حیلہ ناجزہ: باب المتعنت)

واللہ أعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

❖ ولی کا جنازہ میں شریک نہ ہونے پر دوبارہ نماز جنازہ پڑھنا۔

❖ نماز جنازہ میں مذہب غیر پر فتوی دینا۔

❖ متوفی عنھازوجھا کا ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا۔

❖ متوفی عنھازوجھا کا اپنے مکان سے تعزیت کی خاطر قریبی مکان جانا۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

آج کل جب کسی کے رشتہ دار کا انتقال ہوتا ہے 'تو میت کے رشتہ دار بوجہ دوری کے وہی نماز جنازہ آدا کرتے ہیں۔ مثلا: کراچی میں فوتگی ہوئی جب کہ آبائی علاقہ (کوئٹہ) میں دوبارہ نماز جنازہ آد کی جاتی ہے 'اب پوچھنا یہ ہے:

1 ....اگر کراچی میں ولی موجود ہو مگر جنازہ میں شریک نہ ہو اور پھر آبائی گاؤں میں دوبارہ نماز جنازہ میں شریک ہو جائے 'کیا ولی کے لیے ایسا کرنا اور نماز جنازہ دوبارہ پڑھنا درست ہے؟

2 .... نماز جنازہ میں ولی کی ترتیب میراث والے عصبہ کی طرح ہے 'یا اس میں کچھ فرق ہے؟

3 .....آنے جانے پر زیادہ اخراجات اور کاروباری مصروفیات کی وجہ سے لوگ نماز جنازہ کے لیے نہیں آتے ہیں 'کیا ایسی حالات میں دو دفعہ نماز جنازہ کی گنجائش ہے اگر نہیں تو کیا مذہب غیر پر فتوی دیا جاسکتا ہے؟

کسی شخص کے دو گھر ہے (کوئٹہ اور کراچی میں) وہ اپنے فیملی کے ساتھ کبھی کوئٹہ میں رہتا ہے اور کبھی کراچی میں رہتا ہے۔ اب کراچی میں اس کا انتقال ہوا 'اس کے بیٹے والدہ سمیت دفنانے اور تعزیت کے لیے اپنے آبائی علاقہ آتے ہیں 'چند دن گزارنے کے بعد دوبارہ کراچی چلے جاتے ہیں۔

4 .... کیا بیوہ (متوفی عنھا زوجھا) کے لیے کوئٹہ آنا درست ہے؟

5 ....اور اگر دونوں رہائشی گھر قریب ہوں 'بیوہ تعزیت لینے کے لیے صبح آتی ہوں اور شام کو واپس چلی جاتی ہوں تو پھر کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصليا

❖ نماز جنازہ ولی کی موجودگی کے بغیر پڑھی گئی ہو 'یا وہ موجود تھا 'مگر نہ راضی تھا اور نہ ہی نماز میں شریک تھا 'تو ولی کو نماز جنازہ دوبارہ پڑھنے کا اختیار حاصل ہے۔ اور اس کی بہتر صورت یہ ہے 'کہ ولی زبان سے ان کو منع کر کے یہ کہے: کہ ہم نے آبائی گاؤں میں نماز جنازہ پڑھنا ہے 'یہاں پڑھنے سے وہاں کے باشندے اس فضیلت سے محروم ہو جائیں گے۔

''لما في الخلاصة والولوالجية والظهيرية والتجنيس والواقعات ، ولو صلى رجل والولي خلفه ، ولم يرض به إن صلى معه لا يعيد ؛ لأنه صلى مرة...''

(البحرالرائق،شروط جنازة الصلوٰة.ج5،ص314)

’’(قوله وإن صلى عليه الولي لم يجز أن يصلي أحد بعده) لأن الفرض يتأدى بالأولى والنفل بها غير مشروع ولو صلى عليه الولي وللميت أولياء آخرون ليس لهم أن يعيدوا لأن ولاية الذي صلى عليه متكاملة ---‘‘

(الجوهرة النيرة:ج1،ص 414)

’’(فإن صلى غيره) أي الولي (ممن ليس له حق التقدم) على الولي (ولم يتابعه) الولي (أعاد الولي) ولو على قبره إن شاء لأجل حقه لا لإسقاط الفرض ولذا قلنا ليس لمن صلى عليها أن يعيد مع الولي لأن تكرارها غير مشروع (وإلا) أي وإن صلى من له حق التقدم كقاض أو نائبه أو إمام الحي أو من ليس له حق التقدم وتابعه الولي (لا) يعيد لأنهم أولى بالصلاة منه ----‘‘

(الدرالمختار،باب صلوٰة الجنازة:ج2،ص223)

’’لما في الخلاصة والولوالجية والظهيرية والتجنيس والواقعات ، ولو صلى رجل والولي خلفه ، ولم يرض به إن صلى معه لا يعيد ؛ لأنه صلى مرة ، وإن لم يتابعه ،وأشار المصنف إلى أن الموصى له بالتقدم ليس بمقدم على الولي ؛ لأن الوصية باطلة على المفتى به صرح بذلك أصحاب الفتاوى قالوا ، ولو أعادها الولي ليس لمن صلى عليها أن يصلي مع الولي مرة أخرى وظاهر كلامهم أن الولي إذا لم يعد فلا إثم على أحد لما أن الفرض ، وهو قضاء حق الميت قد تأدى بصلاة الأجنبي والإعادة إنما هي لأجل حقه لا لإسقاط الفرض وهذا أولى مما في غاية البيان من أن حكم الصلاة التي صليت بلا إذن الولي موقوف إن أعاد الولي تبين أن الفرض ما صلى الولي ، وإن لم يعد سقط الفرض بالأولى ا هـ .‘‘

(البحرالرائق،شروط جنازة الصلوٰة.ج5،ص314)

- نمازجنازہ میں ولی کی ترتیب میراث میں عصبہ کی ترتیب سے قدر مختلف ہے۔ میراث میں بیٹا باپ سے مقدم ہے‘ جب کہ نمازجنازہ میں باپ بیٹے سے مقدم ہے۔

<u>ترتیب میں پہلے امام المسلمین ‘پھر قاضی القضاۃ ‘پھر گاؤں کا پیش امام اور پھر رشتہ داروں میں قریب تر رشتہ دار کا رتبہ پہلے ہوگا۔</u>

’’ ثم الترتيب في الأولياء كترتيب العصبات في الأنكاح لكن إذا اجتمع أبو الميت وابنه كان الأب أولى بالاتفاق على الأصح لأن للأب فضيلة على الابن وزيادة سن والفضيلة والزيادة تعتبر ترجيحا في استحقاق الإمامة كما في سائر الصلوات كذا في البدائع ----فلو كان الأب جاهلا والابن عالما ينبغي تقديم الابن كما في سائر الصلوات إلا أن يقال إن صفة العلم لا توجب التقديم في صلاة الجنازة لعدم احتياطها(احتياجها) للعلم ---‘‘

(البحرالرائق،فصل:السلطان احق بصلوٰتہ.ج2،ص194)

’’وأولى الناس بالإمام فيها السلطان ثم القاضي ثم إمام الحي ثم الأولياء الأقرب فالأقرب، إلا الأب فإنه يقدم على الابن، وللولي أن يصلي إن صلى غير السلطان أو القاضي، فإن صلى الولي فليس لغيره أن يصلي بعده----‘‘

(الاختيارلتعليل المختار:ج1ص7)

- نمازجنازہ دودفعہ مشروع نہیں ہے‘ولی کو دوبارہ پڑھنے کا اختیار ذاتی حق کی بنیاد پر دیا گیاہے۔اس لیے دوبارہ نمازجنازہ پڑھنے کی نہ گنجائش ہےاورنہ ہی مذہب غیر پر فتوی کی ضرورت ہے۔

یاد رہے:

مذہب غیر پر فتوی عام طور پر ضرورت شدیدہ اور عموم بلوی کی صورت میں دی جاسکتی ہے'اس کے بغیر تلفیق بین المذاہب لازم آئے گا'جن کا فقہاء کرام قائل نہیں ہیں۔اور عام طور پر بیوعات میں وسعت کی بنا پر مذہب غیر پر فتوی کی گنجائش ہے۔

''(فإن صلى غيره) أي الولي (ممن ليس له حق التقدم) على الولي (ولم يتابعه) الولي (أعاد الولي) ولو على قبرها إن شاء لأجل حقه لا لإسقاط الفرض ولذا قلنا ليس لمن صلى عليها أن يعيد مع الولي لأن تكرارها غير مشروع ----''

(الدرالمختار،باب صلوٰۃ الجنازۃ:ج2،ص223)

''والإعادة إنما هي لأجل حقه لا لإسقاط الفرض -----''

(البحرالرائق،شروط جنازۃ الصلوٰۃ.ج5،ص314)

❖ شوہر کے انتقال کے دوران انتقال خاتون جس گھر میں تھی'اسی میں عدت گزارنا ضروری ہے۔

''وتعتد المتعدة في المكان الذي سكنت قبل مفارقة الزوج وقبل موته قال الله تعالى: {لاَ تُخْرِجُوهُنَّ مِن بُيُوتِهِنَّ} (الطلاق: 1) والإضافة إليهم باعتبار السكنى في البيوت التي كن يسكن فيها قبل المفارقة، ولو طلقها وهي غائبة كان عليها أن تعود إلى منزلها فتعتد فيه...''

(المحیط البرھانی،الفصل السادس والعشرون فی مسائل العدۃ:ج4،ص84)

''وإن كانت المرأة مع زوجها في منزل هو ملك الزوج، فمات الزوج، فإن كان نصيبها يكفيها فإنها تسكن في نصيبها في العدة..... ليس بمحرم لها من ذرية الزوج، وإن كان نصيبها لا يكفي لها، فإن رضي ورثة الزوج، أن تسكن فيه سكنت، وإن أبوا كانت في سعة من التحويل، ويكون ذلك عذراً لها في التحول.''

(المحیط البرھانی،الفصل السادس والعشرون فی مسائل العدۃ:ج4،ص84)

''(ولا ينبغي للمتوفى عنها أن تبيت في غير منزلها، ويجوز لها الخروج بالنهار).
والأصل فيه: قول الله تعالى: {متاعًا إلى الحول غير إخراج}، فكانت عدة المتوفى عنها زوجها حولًا، لا تخرج فيه من منزلها، ثم نسخ ما عدا الأربعة أشهر والعشر بقوله: {يتربصن بأنفسهن أربعة أشهروعشرًا}، فكان حكم هذه المدة باقيًا على ما كان عليه في منع الخروج، ووجوب الاعتداد فيها؛ لأن النسخ لم يرد عليه إلا في حال قد قامت الدلالة عليه، وهو خروجها في حوائجها، فمنعها من غير أن تبيت في بيتها.وهو ما روي عن فريعة بنت مالك أنها جاءت تسأل النبي ﷺ، وتستأذنه في النقلة وهي معتدة، وقد كان زوجها قتل، فقال النبي ﷺ: "لا، حتى يبلغ الكتاب أجله"، فمنعها النقلة، ولم ينكر عليها خروجها من البيت.وروي نحوه عن ابن مسعود، وغيره من الصحابة.

(شرح المختصرالطحاوی للجصاص:باب العدۃ والاستبرائ،ج5،ص247)

وإذا مات عنها زوجها وليس له إلا بيت واحد وله أولاد رجال من غيرها، فإن وسّعوا عليها وخرجوا عنها أو ستروا بينها وبينهم حجابا فلتُقِمْ في منزله حتى تنقضي عدتها. وإن أبوا أن يفعلوا ذلك فلتنتقل عنهم.
بلغنا عن علي بن أبي طالب - رضي الله عنه - أنه نقل أم كلثوم ابنة علي حين قتل عمر بن الخطاب وكان زوجها، وذلك أنها كانت في دار الإمارة.وبلغنا أن عائشة - رضي الله عنها - نقلت أم كلثوم ابنة أبي بكر حين قتل طلحة بن عبيد الله وكانت امرأته.
ولا ينبغي للمطلقة ثلاثاً ولا للمتوفى عنها زوجها أن تحج ولا تسافر مع ذي رحم محرم ولا غيره وإن كان زوجها الذي طلقها. وإن كان طلاقاً بائناً أو يملك الرجعة فهو سواء لقول الله تبارك وتعالى: {لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ} . وبلغنا عن عمر بن الخطاب - رضي الله عنه - أنه رد المتوفى عنهن أزواجهن من ذي الحليفة.وبلغنا عن عبد الله بن مسعود - رضي الله عنه - أنه رد نسوة من العصب.وإذا انهارمنزل المطلقة أو المتوفى عنها زوجها فهي في سعة من التحويل إلى حيث شاءت. ولزوج المطلقة طلاقاً بائناً أو بملك الرجعة إذا انهار منزله وكان في منزل بكراء فأخرج منه أو دخلت حال عذر يسع المرأة فيه التحويل أن يحولها من ذلك المنزل إلى أين أحب ويحصنها وينفق عليها. ألا ترى أن عليه النفقة. فإن المشيئة في ذلك إلى الزوج، وليس للمرأة من ذلك شيء. ينقلها حيث أحب ويحصنها وينفق عليها. ألا ترى أن عليه النفقة والسكنى. فإنه يريد أن يحصنها كيلا يلحق به منها ما يكره من الولد وغيره. فإن كان ذلك وقد مات الزوج فالمشيئة إلى المرأة في النُّقْلَة، وليس إلى أولياء الزوج من ذلك شيء.وبلغنا عن رسول الله - ﷺ - أن امرأة أتت وقد أصيب زوجها، فذكرت أنها في وحشة، واستأذنته في النُّقْلَة من منزلها إلى غيره، فقال لها: "لا" حتى يبلغ الكتاب أجله"

(الاصل للشيبانی،باب العدة وخروج المرأة من بيتها:ج4،ص 415)

- جس خاتون کا شوہر انتقال کر جائے' وہ صرف ضرورت کی بناپر نان نفقہ کی خاطر دن کو نکل سکتی ہے' صورت مسئولہ میں تعزیت ایسی عذر نہیں ہے' جس سے بیوہ کو نکلنے کی اجازت دی جائے' کیونکہ فقہاء کرام نے اس سے سخت اعذار کو ناقابل قبول قرار دیا ہیں۔

''ولا ينبغي للمطلقة ثلاثاً ولا للمتوفى عنها زوجها أن تحج ولا تسافر مع ذي رحم محرم ولا غيره وإن كان زوجها الذي طلقها. وإن كان طلاقاً بائناً أو يملك الرجعة فهو سواء لقول الله تبارك وتعالى: {لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ} . وبلغنا عن عمر بن الخطاب - رضي الله عنه - أنه رد المتوفى عنهن أزواجهن من ذي الحليفة.وبلغنا عن عبد الله بن مسعود - رضي الله عنه - أنه رد نسوة من العصب.''

(مذکورہ بالاماخذ: ج4' ص415)

یادرہے:
خاتون شوہر کے فوتگی کے دوران جس گھر میں ہو' وہاں سے بغیر کسی عذر شرعی کے نکلنادرست نہیں ہے۔اب اگر وہ نکلی' توفورا رجوع کرے' ورنہ گناہ گار ہوگی اور یہ حکم مسلسل متوجہ ہوگا' جب تک وہ مدت سفر طے نہ کرے۔ اگراس کے باوجود وہ اپنے ایسی رہائشی مکان روانہ ہوکر چلی گئی' جومدت سفر پر مشتمل ہو' توپھر وہی عدت گزاریں۔اسی طرح اگردوران سفر شوہر کا انتقال ہوجائے' رہائشی مکان اور منزل مقصودتک مسافت کا اندازہ کرے' اگر رہائشی مکان قریب ہو' یا منزل مقصود قریب ہونے کے

باوجود مدت سفر نہ بنتی ہوں، تو بہر حال رہائشی مکان کی طرف رجوع کرے اور اگر منزل مقصود قریب ہو اور وہ مدت سفر طے کر چکی ہوں، تو پھر اپنے مکان کی طرف رجوع کرنا ضروری نہیں ہے۔

المعتدة لاتسافر لاللحج ولالغيره۔

(الهنديه ،كتاب الطلاق،الباب الرابع عشر:فى الحداد)

(الهداية:ج٢ ،باب العدة)

والله اعلم بالصواب۔

السيدكليم الله الحرمزئی۔

- کیامدارس اپنے نہج پر قائم ہیں؟
- مہتمم/متولی کا وقف کے اموال میں خیانت
- کیامدارس کے نام پر جمع شدہ رقم کااستعمال معیار کے مطابق ہے؟
- کیامدارس سے فارغ التحصیل علماء واقفین کے معیار کے مطابق ہیں؟
- کیاسوشل میڈیاپر پیش ہونے والے طلبہ مدارس کی حقیقی ترجمانی کرتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں مدرسہ کے لیے ایک مہتمم بہتر ہے، یا شوری؟
- موجودہ نہج پر برقرار مدارس کی ضرورت کہاں تک درست ہے؟

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

ایسے حالات میں جب کہ بالعموم بددیانتی عروج پر ہے، تقوی اور بزرگی کا فقدان ہے، عوام الناس کیا بڑے بڑے دیندار اوقاف کے معاملات میں بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں، اہل مدارس (منتظمین/مہتممین) طلبہ اور مدرسین کے حقوق میں کوتاہیاں کرتے نظر آتے ہیں، اساتذہ کے انتخاب میں کوتاہی سے لے کر طلبہ کے حقوق تک متاثر ہوتے نظر آتے ہیں، نااہل اساتذہ کا انتخاب کرتے ہیں، کبھی بلااجرت صرف تعلقات یا زیادہ چندہ دلانے کی بنیاد پر، یا قرابت اور رشتہ داریوں کو بنیاد بنا کر انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے، کبھی کم اجرت پر ملنے والے حضرات کو ترجیح دی جاتی ہے، جس کی وجہ سے ایک تو مدرسہ/وقف ادارے کا نقصان ہوتا ہے، دوسرا ایسے اساتذہ طلبہ کو کماحقہ پڑھانے کے لائق نہیں ہوتے ہیں، نہ طلبہ کی علمی اخلاق اور روحانی تربیت ہوتی ہے، نہ ہی ان کی استعداد پر اساتذہ کو اعتماد ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں پوچھنا یہ ہے کہ:

- کیا طلبہ کے لیے مہتمم کا لوگوں سے چندہ کرنا، یا لینا شرعا جائز درست ہے، یا نہیں؟ جب کہ چندہ دہندگان عموما اس نیت سے دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے نائبین تیار ہوں گے اور فی الواقع نہ چندہ ان پر مکمل صرف ہوتا ہے، نہ ان کے اساتذہ پر۔۔۔۔۔ حالانکہ چندہ انہی کے نام پر ہوتا ہے؟
  - مہتمم وغیرہ کے لیے جب طلبہ اور مدرسہ کی سالانہ ضرورت پوری ہو، ضرورت سے زائد رقم لوگوں سے لینا یا اضافی چندہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟ جب کہ قریب کے دیگر مدارس میں طلبہ کی بنیادی ضروریات اور اساتذہ کی تنخواہیں پوری نہیں ہوتیں؟
- اوپر ذکر کردہ بددیانتی کی عمومی صورتحال میں مدرسہ کا ایک مہتمم، متولی بہتر ہے، یا شوری ہونا بہتر ہے، جس میں ایک آدمی کی رائے معتبر نہ ہو؟ غرض نقد رقم یا دیگر اہم فیصلوں میں ایک آدمی کا اختیار بہتر ہے، یا شوری کا؟ اور اگر ایک آدمی ہو اور بددیانت ہو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ مثلا: ضروریات مختلف پروگراموں میں مدرسہ کی رقم صرف کرنا کو شریعت اور اسلام کے مزاج کے موافق نہ ہو۔
- طلبہ کرام اللہ تعالی کے رسول مقبول ﷺ کے مہمان ہوتے ہیں، کیا ان مہمانوں کے لیے لوگوں کے مال کا میل کچیل (زکوۃ) کی رقم جمع کرنا اور ان پر صرف کرنا مہمانان رسول ﷺ کی توہین کے زمرے میں داخل ہے، یا نہیں؟
- موجودہ حالات میں ایسے علاقوں میں جہاں مدارس کی تعداد زیادہ ہو وہاں دیگر مدارس قائم کرنا کس حد تک درست ہے؟

الجواب حامداومصلیا

دینی مدارس اسلام کی بقااور تحفظ کے ضامن ہیں، یہاں ہر چار دانگ عالم شریعت کی ضوافشانی ہو رہی ہے، ہر سوئے عالم سے قال اللہ (جل جلالہ) اور قال رسول اللہ (ﷺ) کے چرچے بلند ہو رہے ہیں، یہاں سے دین اسلام کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور سب سے بڑھ کر آقائے دوعالم، سرور کونین، ہادی عالم ﷺ کو معلم کالقب دیا جانامدارس کی اہمیت اور شہرت کے لیے کافی ہے، آپ ﷺ نے سب سے پہلامدرسہ مکہ مکرمہ ہی میں دارارقم میں قائم فرمایا۔۔۔چنانچہ رفتہ رفتہ ہر طرف مدارس کا ایک جال بچ گیا، ہر دور کے نیک سیرت حکمرانوں نے بھی اس مبارک عمل کو سینہ سے لگایا، ان کو مزید فروغ دیا، اساتذہ اور طلبہ کے لیے وظائف جاری کیے۔۔۔لیکن بد قسمتی سے جب خلافت کے بجائے جمہوریت نے اپنے پنجے گاڑ لیے، تومدارس کا سلسلہ بیت المال اور حکومت سے کٹ گیا۔ علما کرام اپنی مدد آپ کے تحت دین اسلام کی سر بلندی کے لیے کمر کس ہوئے، لیکن پھر بھی یہ جال مزید پھیلتا رہا، عوام نے ان کو پانی کے بجائے خون سے سینچا، یہاں سے دشمنان اسلام کی سر کوبی کے لیے مایہ ناز مجاہد، علم کا شمع روشن کرنے والامدرس، ہر طرف دین کی صدابلند کرنے والامبلغ اور خواہشات نفسانی اور شیطانی حملوں سے بچاؤ کے لیے تزکیہ نفس کرنے والاصوفی تیار ہوتا رہا۔۔۔۔دیوبند کا باورچی بھی صاحب نسبت تھا۔۔۔

قصہ مختصر باغ کا پاسبان نہ رہا، یہاں پھولوں کے ساتھ کانٹوں نے بھی جگہ گھیر لی، شرعی لبادہ میں راہزن کو بھی موقع ملا، سستی شہرت، نام ونمود، اساتذہ کی بنیادی ضرورتوں میں کوتاہیاں، طلبہ کو اکابرین کے نہج پر پڑھانے والے اساتذہ کا فقدان، ترجیحی بنیادوں پر ہونے والے اساتذہ کا انتخاب، طلبہ کی خاطرجمع شدہ چندہ میں مہتمم کا غیر متعلقہ مہمانوں کاخاطر تواضع، غیر ضروری اور اصلاح سے خالی پروگراموں پر بے تحاشااخراجات ۔۔۔۔اس لیے موجودہ حالات کے پیش نظرمدارس کو شریعت کی زاویہ نگاہ سے پرکھنالازمی ہے۔

مختصر طورپرمدارس کی تین قسمیں بنائی جاسکتی ہیں:

- نفع عام اور تام ہو۔
- نفع عام اور غیر تام ہو۔
- نفع غیر عام اور غیر تام ہو۔

پہلی قسم کے مدارس کو فروغ دیناچاہیے اور ہر فلیٹ فارم پراس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔کیونکہ خیر کی طرف راہنمائی کرنے والا بھی خیر ہی کرنے والاشمار ہوتاہے۔

دوسری قسم کے مدارس والوں کی اصلاح ہونی چاہیے۔بصورت دیگر تنبیہ کرنی چاہیے۔

نوٹ :اصلاح اور تنبیہ کون کرے۔۔۔۔۔؟تفصیل آگے آئے گی۔

تیسری قسم کے مدارس والوں کی ہر حال تنبیہ کرنی چاہیے۔بصورت دیگران کے خلاف عمومی سطح پرآواز اٹھانی چاہیے اور ہر فلیٹ فارم پر اس کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے،کیونکہ یہ ذاتی رقم نہیں ہے،جس میں ایک فرد کے ساتھ خیانت شمار ہوتی ہو ،بلکہ یہ عمومی رقوم کی خیانت ہے اور خیانت ثابت ہونے پر اس کی صرف معافی قابل قبول نہیں ہے،بلکہ اس کا ضمان بھی دیناہوگا۔

ذیل میں چند فقہی عبارتیں لکھی جاتی ہیں،جس سے بخوبی واضح ہوگا،کہ وقف اموال میں متولی اور نگران کی ذمہ داری کہاں تک ہے؟

’’عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما قال:کان یولی اقواماکثیرا ولذی القربیٰ صدقة عمر،فاذارای منہم خیراالقربہم ،وان کان غیرذلک عزلہم۔‘‘

(اعلاء السنن،ولایة الوقف ،باب لایولی الاامین عادل اوذورای215/13،ط:دارالکتب العلمیة)

’’۔۔۔۔لمافیہ من تغییرحکم الشرع ومخالفة شرط الواقف واعطا ءالوظائف من تدریس وامامة الی غیر مستحقها۔۔۔‘‘

(الفتاوی الشامیة:کتاب الوقف،585/6،ط:رشیدیہ)

’’اذا ولی السلطان مدرسا لیس باهل لم تصح تولیتہ؛لان فعلہ مقید بالمصلحة۔‘‘

(مذکورہ بالاماخذ:586/6)

(مطلب:للقاضی ان یدخل مع الناظرغیرہ بمجردالشکایة:672/6)

۔۔۔آخذامن قول الخصاف ان طعن علیہ فی الامانة ،لاینبغی اخراجہ الابخیانة ظاهرة۔۔۔

(الشامیة:کتاب الوقف:672/6،ط:رشیدیہ)

’’ذہب الحنفیة الی انہ لاتلزم محاسبة ناظرالوقف فی کل عام ،ویکتفی القاضی منہ بالاجمال لوکان معروفا بالامانة،فلوکان متهمایجبرہ القاضی علی التعین شیئا فشیئا،ولایحبسہ بل یہددہ ولواتهمہ یحلفہ۔۔۔‘‘

(الموسوعة الفقہیة الکویتیة،ثانیا:محاسبة ناظرالوقف:344/36)

قال فی البحر:

’’واستفید من عدم صحة عزل الناظر بلاجنحة عدمهالصاحب وظیفة فی وقف بغیرجنحة ،وعدم اہلیة۔۔۔‘‘

(ردالمحتار،مطلب:لایصح عزل صاحب وظیفۃ بلاجنحۃوعدم اہلیۃ)

اماالواقف فلہ عزل الناظرمطلقابہ یفتیٰ۔

(ردالمحتار،مطلب:فی عزل الناظر)

''واذاکان المتولی علی وقف بر یکتب مقبوضہ ومصروفہ کل سنۃ بمعرفۃ القاضی بموجب دفترممضی بامضائہ فیعمل بدفاتر المحاسبۃالممضاۃ بامضا القضاۃ ولایکلف المحاسبۃ ثانیا۔''

(مذکورہ بالاماخذ)

(تنقیح الحامدیۃ:203،204/1)

''امالوکان متہما فان القاضی یجبرہ علی التفسیرشیئافشیئا،ولایحبسہ ولکن یحضرہ یومین اوثلاثۃ ،ویخوفہ ویہددہ ان لم یفسر،فان فعل فبہا،والایکتفی منہ بالیمین۔''

(الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ،ثانیا:محاسبۃ ناظرالوقف:421/44)

''لماروی البخاری:ان رسول اللہ ﷺ استعمل رجلا من الاسد علی صدقات بنی سلیم یدعی ابن اللتبیۃ،فما جاء حاسبہ۔''

(الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ،ثانیا:محاسبۃ ناظرالوقف:347/36)

مذکورہ بالاعبارتوں سے واضح ہوا،کہ خیانت اور بے جااخراجات،نااہل اساتذہ کاانتخاب،محض دکھانے کے لیے طلبہ کی تعداد بڑھانا،یاکم تعداد کودوگنا دیکھانا،محض طلبہ کی کثرت کی خاطر چندہ میں زبردستی کرنا،یامشتبہ کمائی والے افراد سے چندہ وصول کرنا،مشترکہ اموال میں سے قابض کاچندہ دینااوردوسروں کا اس پر راضی نہ ہونا،یامشترکہ جائیداد میں بہنوں کا حق نہ دینے والے سے چندہ مانگنا؛مشترکہ اموال میں نابالغ بہن بھائیوں کے ہوتے ہوئے بڑے کامشترکہ سرمایہ سے چندہ دینا اورسوشل میڈیاکے ذریعے ایسے عربی،اردواورانگریزی مقررین پیش کرنا،جومدرسہ کے حقائق کے خلاف ہو،جس میں عام لوگ یہ تاثرلیتے ہو،کہ واقعی یہاں پر عربی،انگریزی اوراردوداں تیارہوتے ہیں،جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہو۔۔۔۔ اساتذہ اورطلبہ کاصرف قیل قال اورایسے فنون میں اپنی ساری توانیاں خرچ کرنا،کہ جس سے علاقہ میں درپیش رسومات،بدعات اورمسلمانوں کے گھریلوتنازعات میں شرعی فیصلے نظرانداز ہوتے ہوں انتہائی غورطلب چیزیں ہیں،جس سے نہ صرف علماء کی بے احترامی میں اضافہ ہواہے،بلکہ بڑے شیوخ اورمفتیان حضرات بھی عوام کے ہاں میں ہاں ملاکران کے نقش وقدم پرچلنے لگے ہیں اورہرایسے شرعی امورسے اجتناب کرتے ہیں،جس سے ان کی عزت،احترام،عوامی مخالفت کاسامنااوریا طلبہ کے چندہ پرزد پڑتاہو۔۔۔۔۔۔

نوٹ: مذکورہ بالا خامیاں ایسی عیاں اور رونماں ہیں، جن سے انکار کرنا سورج کو انگلی سے چھپانے کے مترادف ہے

لہٰذا:

- طلبہ کے لیے مہتمم کا لوگوں سے چندہ کرنے ایسی صورت میں درست نہیں ہے، جب چندہ دہندگان عموماً اس نیت سے دیتے ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے نائبین تیار ہوں گے اور فی الواقع نہ چندہ ان پر مکمل صرف ہوتا ہو، اور نہ ہی ان کے اساتذہ پر صرف ہوتا ہو۔
- مہتمم وغیرہ کے لیے جب طلبہ اور مدرسہ کی سالانہ ضرورت پوری ہو، ضرورت سے زائد رقم لوگوں سے لینا یا اضافی چندہ کرنے میں قدر تفصیل ہے:
  - اگر چندہ کی رقوم عطیات یا نفلی صدقات پر مشتمل ہوں، تو ضرورت نہ ہونے کے باوجود بھی لینا درست ہے۔ اس لیے کہ نفلی صدقات، تحفہ و تحائف اور ہبہ وغیرہ کا لینا مطلقاً مالدار کے لیے درست ہے۔
  - اگر چندہ کی رقم زکوۃ کی مد پر مشتمل ہو۔ تو بوجہ ضرورت کے لینا درست ہے۔

"ضرورت" کی شرائط:

- ✓ ضرورت درپیش ہو۔
- ✓ اس کے علاوہ کوئی جائز متبادل نہ ہو۔
- ✓ وہ ضرورت اسلام کے کسی بھی حکم کا مخالف نہ ہو۔
- ✓ اور وہ ضرورت بقدر ضرورت ہو۔
- ✓ متبادل سے ضرورت کا ازالہ یقینی ہو۔

"شروط الضرورة :
ليس كل من ادعى الضرورة يسلَّم له ادعاؤه، أو يباح له فعل الحرام، وإنما لابد من توافر شروط أو ضوابط للضرورة، وهي ما يأتي :
1 - أن تكون الضرورة قائمة لا منتظرة في المستقبل، أي أن يحصل في الواقع خوف الهلاك على النفس أو المال بغلبة الظن بحسب التجارب، أو التحقق من خطر التلف،
2- أن يتعين على المضطر ارتكاب المحظور الشرعي أي ألا يكون هناك وسيلة أخرى من المباحات لدفع الخطر إلا تناول الحرام.
3- ألا يخالف المضطر مبادئ الإسلام، فلا يحل الزنا والقتل والكفر والغصب بأي حال؛
4- أن يقتصر في رأي الجمهور على الحد الأدنى أو القدر اللازم لدفع الضرر
5 - أن يصف المحرم ـ في حال ضرورة الدواء ـ طبيب عدل ثقة في دينه وعلمه، وألا يوجد من غير المحرَّم علاج آخر، يقوم مقامه.ولا يتقيد الاضطرار بزمن مخصوص لاختلاف الأشخاص في ذلك ."

(الفقه الاسلامی : تعریف الضرورة وحكمها)

جب قریب کے دیگرمدارس میں طلبہ کی بنیادی ضروریات اوراساتذہ کی تنخواہیں پوری نہیں ہوتی ہوں۔اوران مدارس کا نفع عام اورتام ہو۔تو مہتمم صاحب کا ضرورت سے زائد رقم لینادرست نہیں ہے۔

تاہم اگر مہتمم صاحب نے ضرورت سے زائد رقم بطور چندہ لی ہو،تواس کی دوصورتیں ہیں:

- ✓ مدرسہ کوزائد رقم کی ضرورت ہو،تواستعمال درست ہے۔
- ✓ زائد رقم کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے،تو قریب کسی مدرسہ کو حوالہ کرے۔

- ❖ اوپر ذکر کردہ بددیانتی کی عمومی صورتحال میں مدرسہ کاایک مہتمم/متولی کے بجائے شوری ہونا بہتر ہے،جس میں ایک آدمی کی رائے معتبر نہ ہو۔۔۔۔۔غرض نقدرقم یادیگراہم فیصلوں میں ایک آدمی کےاختیار ہونے سے شوری بہتر ہےاوراگرایک آدمی ہواوربددیانت ہو،مثلا: مختلف پروگراموں میں مدرسہ کی رقم صرف کرتاہو،جوشریعت اوراسلام کے مزاج کے موافق نہ ہو۔اس کی اصلاح/محاسبہ کے لیے بہتر یہی ہے،کہ نیک سیرت علما کی جماعت تشکیل ہوجائیں،جو باقاعدہ وفاق المدارس العربیہ کی طرف سے خود مختار ہو،وہ جماعت اس مہتمم کے سالانہ اخراجات، طلبہ کی تعداد اور معیار کا محاسبہ کرے۔اوراس طرح وفاق المدارس کے لیے آسان بھی ہے،سنٹرل اورپرویژنل اورزونل سطح پراحتسابی کمیٹیاں بنائی جائیں،جو وقتا فوقتاان مدارس کا معائنہ کرے،جہاں اصلاح کی ضرورت ہو،وہ اصلاح کرے۔
- ❖ طلبہ کرام اللہ تعالی کے رسول مقبول ﷺ کے مہمان ہوتے ہیں،ان مہمانوں کے لیےلوگوں کے مال کا میل کچیل(زکوۃ) کی رقم جمع کرنے کی بجائے خود کفیل طلبہ اپنی ذاتی آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کریں، ہوسکے تو دیگر طلبہ کی ذمہ داری بھی اپنے بساط کے مطابق قبول کریں،(اس بات کی دعوت ہرفلیٹ فارم پردی جائے،توشاید لوگ قبول کرے۔) بصورت دیگر عوام صدقات وعطیات دیدے،تاکہ صاف غذا سے تقوی کومزید تقویت ملے،لیکن جب تک لوگوں کے رجحانات مدارس دینیہ کی طرف نہ ہو،تب تک زکوۃ بوجہ مجبوری کے لینا اور طلبہ پر پرصرف کرنا مہمانان رسول ﷺ کی توہین کے زمرے میں داخل نہیں ہے۔
- ❖ موجودہ حالات میں ایسے علاقوں میں جہاں مدارس کی تعدادزیادہ ہو،وہ صحیح نہج پر چل رہے ہوں،ان کومزید بڑھانے چاہیے،تاکہ بڑھتی آبادی کے ساتھ دینی فریضہ بھی سرانجام دیا جاتاہو۔البتہ جہاں لوٹ مار ہو،مدارس کے درمیان رسہ کشی ہو،وقف کی رقم میں خیانت کا ارتکاب ہوتاہو،وہاں صرف ضرورت کی حدتک مدرسہ کا قیام ضروری اوردرست ہے۔

یاد رہے:

عربی عبارتیں اگرچہ حاکم وقت / قاضی کے متعلق ہیں کہ وہ نگران اور متولی کی اصلاح کرے، بصورت دیگر اس سے وقف کے املاک ضبط کرے۔تاہم دورحاضر میں جب تک نظام خلافت نہ ہو، تو مدارس کے اوقاف اور اصلاحات کی ذمہ داری علما کرام کی بنتی ہے۔اور بہت سارے فتاوی میں درج ہے: کہ دورحاضر میں ضرورت کی وجہ سے عالم کی حیثیت ایک قاضی کی ہوتی ہے۔

قال فی '' التنقیح الحامدیۃ'':

''لان فتوی الفقہ للجاہل بمنزلۃ القاضی۔''

(بحوالہ، فتاوی دارالعلوم دیوبند: کتاب النکاح، فصل دوم: 113/8)

''قال العلامہ عبدالحی اللکنوی: ----والعالم الثقہ فی بلدہ لاحاکم فیہ قائم مقامہ۔''

(عمدہ الرعایہ علی ہامش شرح الوقایہ ،بیان رؤیہ ہلال صوم:309/1)

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ۔

- وہ اسباب جن سے خریدی ہوئی چیز واپس نہیں ہو سکتی ہے
- صاحب نصاب محتاج کو زکوۃ دینا

❖ موانع ردالمبیع کیا ہیں؟

❖ ایک شخص صاحب نصاب ہو، صاحب عیال ہو، والدین بھی ساتھ ہو، لیکن اتنی رقم ہے، کہ صرف نصاب تک پہنچتی ہو، مگراس کے تمام عیال اور والدین پر تقسیم کرکے رقم کافی نہیں ہوتی، ازروئے شرع اس کی زکوۃ کیا حکم ہے؟

الجواب حامداومصليا

واضح رہے:

خریدی ہوئی چیز (مبیعہ) کی تین صورتیں ہیں: مبیعہ میں عیب اور خرابی ہوں، عیب، نقصان سے خالی ہوں اور یا خیار کے ساتھ چیز خریدی ہوں۔

وہ اسباب جن کے ذریعے خریدی ہو چیز واپس نہیں ہوسکتی ہے:

موانع الرد بالعيب وسقوط الخيار :

* الرضا بالعيب بعد العلم به: إما صراحة كقوله: رضيت بالعيب، أو أجزت العقد۔
* أودلالة كالتصرف في المعقود عليه تصرفاً يدل على الرضابالعيب، كبيعه ـــ
* أو وصول عوض العيب إليه۔۔
* ونحو ذلك؛ لأن الرضابالعيب بعد العلم به دليل على أن سلامة المعقود عليه ليست مقصودة له، فلا يكون هناك معنى لإثبات الخيار له.
* إسقاط الخيار: صراحة كقوله: أسقطت خياري، أودلالة كأن أبرأه من العيب الذي ظهر في المعقود عليه؛لأن خيار العيب حقه فله أن يتنازل عنه.
* هلاك المعقود عليه، أو تعيبه بعيب جديد في يدصاحب الخيار، أو تغيره تغيراً تاماً، كطحن الحنطة، وخبزالدقيق، ونحوه.
* زيادة المعقود عليه في يد صاحب الخيار۔
* زيادة متصلة غير متولدة من الأصل كالبناء أو الغرس على الأرض، وصبغ الثوب۔
* أو زيادة منفصلة متولدة من الأصل كالولد والثمرة.(الحادثۃبعدقبض المشترى)

أما الزيادة المتصلة المتولدة من الأصل كالسمن والكبروالزيادة المنفصلة غير المتولدة كالغلة والكسب، فلا تمنع الرد بالعيب.وامتناع الرد في الصورة الأولى سببه تعذر فصل الزيادة، ولا يردمعها لأنها حق صانعها.

وامتناع الرد في الصورة الثانية، سببه أن المتملك لو ردَّ الأصل دونها، تبقى له دون مقابل، وهو ممنوع شرعاً، لأنه ربا.

المانع الطبيعي:

وهو هلاك المبيع بآفة سماوية، أو بفعلالمبيع، أو باستعمال المشتري كأكل الطعام، فيمتنع الردفي هذه الحالات لهلاك المبيع، ويثبت للمشتري حق الرجوع على البائع بنقصان العيب .

المانع الشرعي:

وهو أن يحدث في المبيع قبل القبض زيادة متصلة غير متولدة من الأصل كصبغ الثوب والبناء على الأرض، أو يحدث بعد القبض زيادة متصلة غير متولدة أو زيادة منفصلة متولدة كالولد والثمرة.وأما بقية أنواع الزيادات فلا تمنع الرد.

وتفصيله ما يأتي :"الزيادة في المبيع: إما أن تحدث قبل القبض أو بعده، وكل منها

إما متصلة أو منفصلة.فالزيادة الحادثة قبل القبض :إذا كانت متصلة:فإما أن تكون متولدة من الأصل كالحسن والجمال والكبر والسمن ونحوها، فلا تمنع الرد،

لأنها تابعة للأصل حقيقة.أو تكون غير متولدة كصبغ الثوب أو خياطته، وكالبناء أو الغرس على الأرض، فتمنعالرد؛ لأنها أصل قام بذاته، وليست تابعة، فلا يرد المبيع بدونها، لتعذر الرد، ولا يرد معها، لأنها ليست تابعة في البيع فلا تتبع في الفسخ.وإن كانت منفصلة:فإما أن تكون أيضاً متولدة من الأصل كالولد والثمرة واللبن، فلا تمنع الرد،فإن شاء المشتري ردهما جميعاً، وإن شاء رضي بهما بجميع الثمن.أو أن تكون غير متولدة، كالكسب والصدقة والغلة، فلا تمنع الرد؛ لأنها ليست بمبيعة، وإنما هي مملوكة بملك الأصل."

المانع بسبب حق البائع:

وهو حدوث عيب جديد عند المشتري بعد قبضه، إذا كان المبيع معيباً بعيب قديم عند البائع، كأن انكسرت يد الدابة المبيعة عند المشتري، وظهر فيها مرض قديم كان عند البائع؛ لأن المبيع خرج عن ملك البائع معيباً بعيب واحد، فلو رد يرد بعيبين، فيتضرر

البائع. وشرط الرد أن يرد على الوجه الذي أخذ، وإنما يكون

للمشتري أن يرجع على بائعه بالنقصان. ولو زال العيب الحادث،

كما لو شفيت الدابة المريضة، عاد الموجب الأصلي: وهو حق الرد .

المانع بسبب حق الغير:

كما لو أخرج المشتري المبيع عن ملكه بعقد من عقود التمليك

كبيع أو هبة أوصلح، ثم اطلع على أنه كان معيباً بعيب قديم،

فلا يمكن المشتري الأول أن يفسخ البيع بينه وبين بائعه، لأنه

قد تعلق بالمبيع حق مالك جديد، أنشأه المشتري نفسه .

إتلاف المشتري المبيع :

كما لو كان المبيع دابة فقتلها، أو ثوباً فمزقه ونحوه، ثم علم بوجود العيب القديم فيه، فيستقر عليه الثمن المسمى نهائياً دون رجوع بنقصان. والفرق بين هذا العيب وبين المانع بسبب حق الغير: أنه في الحالة الثانية يحتمل زوال المانع، فيعود حق الرد، وفي الحالة الأولى لا يحتمل زواله.

(الفقہ الاسلامی وادلتہ)

موانع الرد :

تنقسم موانع الرد إلى مانع طبيعي أو شرعي أو عقدي .

أولا - المانع الطبيعي :

ذكر الكاساني أن هلاك المبيع في يد البائع يمنع الرد ، لفوات محل الرد ، ولا يرجع البائع على المشتري بشيء من الثمن ، لأنه يحمل تبعة الهلاك قبل القبض . أما بعد القبض فقد أفاد صاحب الهداية أن موت محل الرد بيد المشتري يمنع الرد ويجعل موجب الخيار الرجوع بنقصان الثمن ، والمراد أن هلاك المبيع بسبب سماوي

ثانيا - المانع الشرعي :

هذا المانع عبارة عن حصول زيادة في المبيع عند المشتري على أن تكون زيادة منفصلة متولدة (بعد القبض) أو متصلة غير متولدة (مطلقا ، قبل القبض أو بعده) فظهور الزيادةبعدما ظهر عيب في المبيع يمتنع به الرد ولو قبل البائع ، لأن المنع لحق الشرع . وفيما يأتي تفصيل هاتين الصورتين المانعتين من الرد والناقلتين الموجب إلى الأرش .

أولا - الزيادة المتصلة غير المتولدة (مطلقا : قبل القبض أو بعده) كالصبغ والخياطة في الثوب ، والبناء والغرس في الأرض ؛لأن هذه الزيادة ليست تابعة ، بل هي أصل بنفسها فتعذر معها رد المبيع ، إذ لا يمكن رده بدون الزيادة لتعذر الفصل ، ولا يمكن رده مع الزيادة ، لأنها ليست تابعة في العقد فلا تكون تابعة في الفسخ (إلا إن تراضيا على الفسخ فهو إقالة وكبيع جديد) ولوقال البائع: أنا أقبله كذلك ، ورضي المشتري لا يجوز أيضا ، لأن

المنع لحق الشرع لاستلزامه الربا .

ثانيا - الزيادة المنفصلة المتولدة ، بعد القبض خاصة ، كالولد والثمرة واللبن وأرش الجناية . وتلك الزيادة تمنع الرد بالعيب أيضا لأن الزيادة مبيعة تبعا لثبوت حكم الأصل وحصلت في ضمان المشتري ، فإن ردها مع الأصل كانت للبائع ربح ما لم يضمن ، وإن استبقاها ورد الأصل فإنها تبقى في يده بلا ثمن ، وهذا من صور الربا .وخالف الشافعي في هذه الزيادة ، فعدها كالكسب ، لإمكان الفصل عن الأصل بدونها ،والزيادة

للمشتري ، فهي لا تمنع الرد .أما صور الزيادة الأخرى فلا تمنع الرد ، ولذا لا رجوع معها بالأرش ، وهي :

1 - الزيادة المتصلة المتولدة ، كالكبر والسمن ، ومنها عند الحنابلة الجنين قبل الوضع والثمرة قبل التأبير . وهي لا تمنع الرد بالعيب في ظاهر الرواية عند الحنفية إن رضي المشتري بردها مع الأصل وإن أبى المشتري الرد كان له الرجوع بالأرش خلافا لمحمد .والحكم كذلك عند الحنابلة ، لأن الزيادة تمحضت تابعة للأصل بتولدها منه مع عدم انفصالها فكأن الفسخ لم يرد على زيادة أصلا - كما قال ابن الهمام – أو كما قال الكاساني : كانت الزيادة مبيعة تبعا ، وما كان تبعا في العقد يكون تبعا في الفسخ . ولا فرق في هذه الزيادة بين أن تحدث قبل القبض أو بعده . - الزيادة المنفصلة المتولدة : قبل القبض كالولد واللبن والثمر في بيع الشجر وهي لا تمنع الرد بالعيب ، لكن لا يرد الأصل وحده ، بل إن شاء المشتري ردهما جميعا وإن شاء رضي بهما بجميع الثمن . وقال الحنابلة : يرد الأصل دون الزيادة ، فهي للمشتري .

3 - الزيادة المنفصلة غير المتولدة ، كالغلة والكسب ، وهي لا تمنع من الرد وهو الحكم لدى الشافعية والحنابلة . ويفسخ العقد في الأصل دون الزيادة ويسلم الكسب للمشتري لأنه حصل في ضمانه ، ودليل ذلك الحديث الذي فيه قول البائع : إنه استغل غلامه فقال ﷺ

الخراج بالضمان, ولأن هذه الزيادة ليست بمبيعة وإنما هي مملوكة بملك الأصل ، فبالرد يفسخ العقد في الأصل وتبقى الزيادة مملوكة للمشتري بغير ثمن عند أبي حنيفة (لكنها لا تطيب له ، لأنها وإن حدثت على ملكه هي ربح ما لم يضمن ، وعند الصاحبين : الزيادة للبائع ولا تطيب له) هذا إذا اختار الرد ، أما إن رضي بالعيب واختار البيع فالزيادة لا تطيب له بلا خلاف لأنها

ربح ما لم يضمن وهو منهي عنه ، ولأنها زيادة لا يقابلها عوض في العقد وهو ربا، وقال الحنابلة : الكسب للمشتريبمقابلة ضمانه ، دون فرق بين ما يقبل القبض أو بعده . – هذا إن كانت الزيادة قائمة فإن هلكت بآفة سماوية لم يتغير الحكم ، وإن هلكت بفعل المشتري فالبائع بالخيار بين القبول

ورد جميع الثمن وبين الرفض ورد النقصان ، وإن هلكت بفعل أجنبي امتنع الرد .أما المالكية فقد قال الحطاب عن ابن رشد في المقدمات إن الزيادة على خمسة أوجه :

1 - زيادة لحوالة الأسواق .

2 - وزيادة في حالة البيع وكلاهما لا يعتبر ولا يوجب للمبتاع خيارا . صرح بذلك في كتاب العيوب من المدونة فقال في أوله ولا يفيت الرد بالعيب حوالة الأسواق .

3 - وزيادة في عين المبيع بنماء حادث فيه كالدابة تسمن أو بشيء من جنسه مضاف إليه كالولد فاختلف أصحابنا في ذلك .

4 - وزيادة مضافة للمبيع من غير جنسه مثل أن يشتري النخل ولا ثمر

فيه فتثمر عنده ثم يجد عيبا ، فهذا لا اختلاف أن ذلك لا يوجب له خيارا، ويكون مخيرا بين أن يرد النخل وثمرتها ما لم يطب ويرجع بالعلاج على مذهب ابن القاسم أو يمسك ولا شيء له في الوجهين جميعا، وقوله ما لم يطب أي ما لم تزه .

5 - وزيادة أحدثها المشتري في المبيع من صنعة.......

ثالثا - المانع العقدي : (العيب الحادث - العقد المبرم بين العاقدين يقوم على الالتزام بما ألزم به كل منهما نفسه من مبيع وثمن ، بموجب العقد ، ولذا كان حق الرد للمعيب مقيدا بأن لا يقع ما يخل بالالتزامات الموزعة في العقد ، فإذا تعيب المبيع عند المشتري بعيب حادث ،

سواء كان بفعل المشتري أو بآفة سماوية أو بفعل المعقود عليه إن كان ذا حياة ، فإن الرد للمعيب - وهو الموجب الأصلي - يمتنع ، وينتقل إلى الموجب الخلفي وهو الرجوع بالنقصان لأن شرط الرد أن يكون المردود عند الرد على الصفة التي كان عليها عند القبض ولم يوجد لخروجه معيبا بعيب واحد فقط ، ولأن في الرد إضرارا بالبائع وهو إخلال بطبيعة العقد ، لأن المبيع خرج عن ملكه سالما من العيب الحادث فلو ألزم به معيبا تضرر ، لأنه إذا كان يضمن العيب القديم لا يضمن الحادث لوقوعه بعد القبض والمبيع بيد المشتري فانعدم شرط الرد ، وبما أنه لا بد من دفع الضرر عن المشتري لمقابلة الجزء الفائت الذي صار مستحقا له....

(الموسوعة الفقهية)

ایک شخص صاحب نصاب ہو، صاحب عیال ہو، والدین بھی ساتھ ہو، لیکن اتنی رقم ہے، کہ صرف نصاب تک پہنچتی ہو، مگر اس کے تمام عیال اور والدین پر تقسیم کر کے ان کے لیے کافی نہیں ہے، از روئے شرع اس کی زکوۃ کیا حکم ہے؟

مذکورہ بالا شخص پر زکوۃ واجب ہے۔

واضح رہے:

سونا، چاندی یا اور نقدی رقم کی حیثیت عام اموال سے الگ ہے، لہذا اگر دوران سال رقم اپنی ضرورت اصلی پر خرچ نہ کی گئی، تو سال گذرنے پر نصاب تک پہنچنے کی صورت میں زکوۃ واجب ہو گی۔

"فإذا كان معه دراهم أمسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصليةلا تجب الزكاة فيها إذا حال الحول، وهي عنده، لكن اعترضه في البحر بقوله: ويخالفه ما في المعراج في فصل زكاة العروض أن الزكاة تجب في النقد كيفما أمسكه للنماء أو للنفقة، وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري. اهـقلت: وأقره في النهر والشرنبلالية وشرح المقدسي، وسيصرح به الشارح أيضا، ونحوه قوله في السراج سواء أمسكه للتجارة أو غيرها، وكذا قوله في التتارخانية نوى التجارة أولا، لكن حيث كان ما قاله ابن ملك موافقا لظاهر عبارات المتون كما علمت، وقال ح إنه الحق فالأولى التوفيق بحمل ما في البدائع وغيرها، على ما إذا أمسكه لينفق منه كل ما يحتاجه فحال الحول، وقد بقي معه منه نصاب فإنه يزكي ذلك الباقي، وإن كان قصده الإنفاق منه أيضا في المستقبل لعدم استحقاق صرفه إلى حوائجه الأصلية وقت حولان الحول."

(الفتاوى الشامية:كتاب الزكوٰة)

والله أعلم بالصواب.

السيدكليم الله حرمزئی۔

1۔۔بنجر زمین کی قیمت نصاب سے زیادہ ہو، لیکن نقد سرمایہ کچھ نہ ہو

2۔۔کیا چمن میں چاند دیکھنا پشین والوں کے لیے کافی ہے؟

3۔۔ایک صوبہ میں چاند کا نظر آنا، لیکن دوسرے دیگر صوبوں کی حکومت اور علمائے کرام کا عید نہ منانا

4۔۔کیا رمضان اور عید کے چاند کی گواہی لینا صرف قاضی کا کام ہے؟

5۔۔مقامی کمیٹی کے عالم کے قول پر روزہ توڑنے سے قضا یا کفارہ

6۔۔حکومت پاکستان کے قرضے لینے سے پاکستانیون کی زکوۃ اور قربانی پر اثر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

- بنجر زمین جس سے پیداوار نہیں نکلتی ہو(گھر کا خرچہ مزدوری وغیرہ سے پورا ہوتا ہو) چاندی کے نصاب کے برابر قیمت رکھتی ہو، کیا صدقہ فطر واضحیہ کے واجب ہونے میں ایسی زمین کی قیمت یا پیداوار کا اعتبار کیا جائے گا؟
- اگر ایک ضلع (مثلا: چمن، پشاور اور مردان وغیرہ) میں کئی علماء کرام شہادتوں کی بنیاد پر رمضان یا عید کا اعلان کریں، تو ان کا اعلان کہاں تک (کن کن علاقوں میں) واجب العمل ہوگا یا جائز العمل ہوگا؟
- نیز مذکورہ اعلان کے مطابق اگر اسی علاقے (صوبہ یا ضلع) میں موجود کئی علماء، عوام اور سرکاری حضرات رمضان یا عید نہ منائیں، تو ان کا کیا حکم ہے؟
- نیز رمضان یا عیدین کی گواہی لینا صرف قاضی کی ذمہ داری ہے، یا دوسرے علماء بھی لے سکتے ہیں؟
- اگر مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی نے روزے کا اور مقامی علماء نے عید کا اعلان کیا، تو کیا کسی عالم دین کے لیے یہ جائز ہے کہ لوگوں سے کہے: روزہ توڑدو اگر کسی نے ان کے حکم کے تحت یا خود روزہ توڑ دیا، تو ان کے ذمہ قضاء یا کفارہ لازم ہوگا؟
- ہمارے ملک پاکستان نے جو قرضے اسلامی وغیر اسلامی ممالک سے (سود یا غیر سود) لیے ہیں، اگر ان قرضوں کو تمام پاکستانی عوام پر تقسیم کی جائے تو ہر پاکستانی کے ذمہ ایک لاکھ (کم وبیش) قرضہ آئے گا، اب پوچھنا یہ ہے کہ کیا ان لیے ہوئے قرضوں کی وجہ سے پاکستانی عوام مقروض (یا سود خور) شمار ہوں گے؟ جس کی وجہ سے ان کی زکوہ، قربانی وغیرہ کے احکام سے چھٹکارا حاصل ہو جائیں؟

الجواب حامداومصلیا

- زمین کی تین صورتیں ہیں:
  - تجارت کے لیے: اس کی قیمت پر زکوہ واجب ہے۔
  - زراعت کے لیے: اس کی آمدن پر زکوہ، اضحیہ اور صدقہ فطر واجب ہے۔ بشرطیکہ نصاب کو پہنچے، یا دوسرے اموال تجارت کے ساتھ ملا کر نصاب کو پہنچے۔
  - بنجر زمین: اس کی مالک پر زکوہ واجب نہیں ہے، البتہ بنجر زمین کے مالک پر صدقہ فطر اور اضحیہ دونوں واجب ہیں۔

واضح رہے:

زکوہ اور قربانی کے نصاب میں فرق ہے:

زکوہ کے نصاب کے لیے مال نامی، یا تجارت کی نیت لازمی ہے،جب کہ قربانی میں اس کے ساتھ مال کا حاجت اصلیہ سے خالی ہونے پر بھی قربانی واجب ہوتی ہے۔زرعی زمین چونکہ آلہ کے طور استعمال ہورہی ہے،یہ صنعت کار کے اوزار کی طرح ہے،جس پر بالاتفاق قربانی واجب نہیں ہے۔

"ولوکان لہ دور وحوانیت للغلہ ،وھی لاتکفی عیالہ ،فھومن الفقراء۔"

(مجمع الانہر:کتاب الزکوہ)

جب کہ بنجر زمین استعمال نہ ہونے کی وجہ سے ضرورت سے زائدہے اور ہر ضرورت سے زائد چیز کی قیمت لگائی جائے گی۔نصاب تک پہنچنے پر قربانی واجب ہوگی،تاہم نامی اور مال تجارت کی نیت نہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوہ واجب نہ ہوگی۔

"کدارلاتکون للسکنی ولاللتجارہ ،ولوکان لہ دار واحدہ یسکنھا وفضلت عن سکناہ یعتبر الفاضل ان کانت قیمتہ نصابا۔"

(مجمع الانہر:کتاب الزکوہ)

"وھی واجبہ علی الحرالمسلم المالک لمقدار النصاب فاضلاعن حوائجہ الاصلیہ ،کذا فی الاختیار شرح المختار،ولایعتبر فیہ وصف النماء ،ویتعلق بھذالنصاب وجوب الاضحیہ،ووجوب نفقہ الاقارب ،ھکذافی فتاوی قاضی خان۔"

(الفتاوی الھندیہ)

واضح رہے:

ضرورت سے زائد چیز چاہے زمین ہو، یا کتابیں وغیرہ ہوں، ان کو فروخت کر کے قربانی کرناواجب ہے۔اوریہی مسئلہ حج کا بھی ہے۔

"وان کان لہ مسکن فاضل،أوعبد،أوکتب أوثیاب أوارض أوکرم أوحوانیت أونحوذلک ممالایحتاج الیھا،یجب بیعھا،ان کان بہ وفاء الحج۔۔۔"

(لباب مع شرحہ:باب شرائط الحج،النوع الاول۔۔السادس :الاستطاعہ،

بحوالہ:حج کےمسائل کاانسائیکلوپیڈیا:ج۲،ص۳۸۷)

مذکورہ بالاعبارتوں سے واضح ہوچکا،کہ بنجر زمین اور ہر وہ زائد چیز جو استعمال میں نہ ہو،قربانی کے نصاب میں شمار ہوگی البتہ بعض فقہاء کا کہناہے: اگرکوئی شخص عیال دار ہو،ان کے پاس اتنی رقم نہ ہو،جوضروریات زندگی (نان نفقہ،علاج ومعالجہ) کے لیے کافی ہو،خالی زمین پر قربانی واجب ہونے کی وجہ سے ان کو قرض لیناپڑے گا،توایسی مجبوری کی صورت میں

سونے کو معیار بنا کران پر قربانی واجب ہو گی۔ لہٰذا ضرورت سے زائد سامان اور خالی زمین کی قیمت کا سونے کے نصاب کو پہنچنے پر قربانی واجب ہو گی۔ لیکن چند وجوہ کی بناپر یہ فتوی زیر غور ہے :

- فقہ کی کتابوں میں دو سو درہم سے انسان شریعت کی اصطلاح میں مالدار ہوتاہے، درہم چاندی کی کرنسی ہے، سونے کو معیار بنانے سے چاندی کا نصاب کالعدم ہو گا۔
- صدقہ فطر، زکوہ لینے کی ممانعت ،نان نفقہ اورقربانی میں دوسودرہم کا اعتبار کیا گیاہے، صرف قربانی کو سونے کے نصاب پر مرتب کرنا قرین قیاس نہیں ہے۔
- قربانی کے متعلق حدیث میں سعہ (وسعت) کا لفظ استعمال ہواہے، جس سے بعض علماء نے مالی وسعت کی انتہاء مراد لے کر معیار نصاب سونا قرار دیاہے، حالانکہ اس سے مرادمالی وسعت کی ابتداء ہے ،جس سے گنجائش مراد ہے۔اس پر قرینہ خود قربانی کا نصاب ہے ،جس میں ضرورت سے زائد سامان، خالی زمین اورقربانی کے دونوں میں مالدار ہونے پر قربانی لازم قرار دیا گیاہے۔
- سونے کو نصاب بنانے سے خروج عن المذہب بھی لازم آتاہے۔
- ظاہرالروایہ میں نصاب میں تخیر،جب کہ نادرالروایہ میں انفع للفقراء کا ذکرہے،جس سے بعض علماء نے یہ فتوی صادر کیاہے، کہ قربانی کے گوشت کی تقسیم نہ فرض ہے ،نہ واجب ہے بلکہ مستحب ہے۔ لہٰذاا نفع للفقراء پر عمل کرنے سے خود قربانی کرنے والا فقیر بن جاتاہے۔
- لیکن یادرہے: قربانی کے لیے اعلی جانورنہ واجب ہے اورنہ ہی ضروری ہے،بلکہ گائے میں ستاسے ستاحصہ لے سکتاہے۔(راقم الحروف کا خیال ہے کہ سونے کو نصاب بنانے سے بہت سارے احکامات تبدیل ہوسکتے ہیں ۔لہٰذاجب تک کثیر علماء سونے کو نصاب مقررنہ کریں ،تب تک چاندی کو مدار نصاب بنانے میں احتیاط ہے۔)

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کو ولایت عامہ حاصل ہے،انہیں چاہیے کہ گواہوں کو شرعی اصولوں پر پرکھیں، گواہ چاہے ملک کے کسی بھی کونے سے ہو،اس کی گواہی لینے سے دریغ نہ کریں، فوراًاعلان نہ کریں، بساا وقات ملک کے دور دراز علاقوں سے شہادتیں جلدی موصول نہیں ہوتی ہیں ،اسی طرح صوبائی اورزونل کمیٹی بھی انصاف سے کام لیں علاقہ کے گواہوں کا رابطہ مرکزی کمیٹی سے کرائیں ،یوں ہمارا روزہ بھی شریعت کے مطابق ہوگا اورہم عید بھی یکجامنا سکیں گے۔ بصورت دیگرملک میں افراتفری کا عالم ہوگا،جس سے مسائل حل ہوئے بغیرمزیدانتشاراوربد نظمی کا سماں ہوگا۔اور بااثر علماء کرام

اور عوام سے بھی یہی اپیل ہے، کہ حکومت کی طرف سے نامزد کردہ کمیٹی کے ساتھ تعاون کریں، جہاں اصلاحات کی ضرورت ہوں ،وہاں مسئلہ افہام اور تفہیم کے ساتھ حل کریں۔ تاکہ مرکزیت برقرار رہے اور دور حاضر میں مسلمانوں کا بکھرا ہوا شیرازہ مزید نہ بکھرے۔ عام فقہی کتابوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، کہ رئیس القضاہ دعووں اور جھگڑوں کے متعلق مسائل حل کریں۔

"عن الحموی ان صاحب البحر ذکرناقلا عن أئمتنا ان طاعہ الامام فی غیرمعصیہ واجبہ ،فلوأمربصوم وجب ،وقدقدمنا أن السلطان لوحکم بین الخصمین یفنذ فی الاصح ،وبہ یفتی۔"

(ردالمحتار:ج ص)

"وثانیها:أنہ لایلزم أهل بلد رؤیہ غیرهم الاان یثبت ذلک عندالامام الاعظم ،فیلزم کلهم لان البلاد فی حقہ کالبلد الواحد اذحکمہ نافذ فی الجمیع،قالہ ابن الماجشون ۔"

(باب الهلال اذا رأہ أهل بلدہ هل یلزم بقیہ البلاد الصوم)

"سئل عن قضا ء القاضی برؤیہ هلال شهررمضان بشهادہ شاهدین عندالاشتباہ فی مصر، هل یجوز لاهل مصر آخر العمل بحکمهم؟فقال :لا،ولایکون مصرآخر تبعا لهذالمصر،انما سکان هذالمصر وقراها یکون تبعا لهم ۔"

(کتاب الصوم :الفصل :۲،رؤیہ الهلال ،ط:زکریا،دیوبند)

"اذاثبت الصوم أوالفطر عندحاکم تحت قواعد الشرع بفتوی العلما ء أو عندواحد،أوجماعہ من العلماء الثقات ولاهم رئیس المملکہ أمر رؤیہ الهلال ،وحکموا بالصوم أوالفطر ونشروا حکمهم هذافی رادیو،یلزم علی من سمعها من المسلیمن العمل بہ فی حدود ولایتهم ،وأما فیماوراء حدود ولایتهم فلابد من الثبوت عندحاکم تلک الولایہ بشهادہ شاهدین علی الرؤیہ أو علی الشهادہ ،أو علی حکم الحاکم ،أوجاء الخبر مستفیضا لان حکم الحاکم نافذ فی ولایتہ دون ماوراء ها ۔"

(زبدہ المقال فی رؤیہ الهلال ،بحوالہ خیرالفتاوی :ج۴،ص ۱۱۸،ط:مکتبہ الخیرملتان)

البتہ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑھتا ہے، کہ مملکت خداداد پاکستان میں تاحال وحدت اور شرعیت کے عین مطابق رؤیت ہلال کے اعلان کا فقدان ہے، کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ چند شہروں میں رمضان ،یا عید کا چاند نظر نہ آنے پر اعلان ہوا ہے، ملک کے دیگر دور دراز اور خاص کر قبائلی علاقوں سے موصول ہونے والی خبریں ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی ہیں ۔اس طرح ایک طرف نظر مرکوز رکھنے سے نہ ختم ہونے والے مسائل جنم لیں گے۔ جب مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی کی آنکھ ایک طرف اندھی ہوگی ،تو مسلمان اپنے مسائل حل کرنے کے لیے دوسری راہیں تلاش کریں گے، شریعت میں مسلمانوں کے لیے آسانی کی خاطر دیگر احکام بھی ہیں ،جس کے بل بوتے وہ اپنی مشکلات حل کرے۔۔۔۔۔۔ فقہی کی کتابوں میں مذکور ہے کہ رمضان ،یا عید چاند دیکھنے کے لیے بیٹھنا صرف مرکز یا مرکز کے نمائندوں کا کام نہیں ہے، بلکہ عوام بھی چاند دیکھنے بیٹھ سکتے ہیں۔

"يفترض على المسلمين فرض كفايه ان يلتمسوا الهلال فى غروب اليوم التاسع والعشرين من شعبان ورمضان حتى يتبينوا امرصومهم وافطارهم ----وقال الحنفيه:يجب للناس ان يلتمسوا الهلال فى اليوم التاسع والعشرين من شعبان ،وكذا هلال شوال لاجل اكمال العده۔"

(الفقه الاسلامى وادلته:ج٢،ص ٥٣٢)

مرکز کی بے توجہی سے عوام پھر اپنے مسائل شریعت کی چوکٹ میں حل کرسکتے ہیں۔چاند کا اعلان کرنا اور عید منانا حکومت کااعلان نہ کرنے کے باوجود بھی درست ہے۔

اب سوال یہ ہے، کہ مقامی کمیٹی کا اعلان کہاں تک درست ہے اور یہ اعلان کن لوگوں پر لازم ہوتاہے؟

مقامی کمیٹی اگرچہ شرعی اصولوں کی بنیادپر گواہوں کو پرکھ فیصلہ کرے پھر بھی جہاں تک حدودولایت ہے وہاں تک کے لوگوں کو ان کے فیصلہ پر عمل کرنا لازمی ہے۔جب کہ دیگر علاقوں میں ولایت عامہ نہ ہونے کی وجہ سے انہیں قوت تنفیذ حاصل نہیں ہے، لہٰذا دیگرعلاقوں کو اختیاردیاجائے گا، کہ ان کے فیصلہ پر عمل کرے، یا خود چاند دیکھنے کا انتظار کرے۔

"وفى ظاهرالروايه:أنه تقبل بدون هذا واذارأى الامام أوالقاضى هلال رمضان وحده فهوبالخيار بين أن ينصب من يشهد عنده وبين أن يامرالناس بالصوم بخلاف هلال الفطر والاضحى ،كذافى السراج الوهاج۔"

(ہنديه:ج١،ص١٩٧)

"(وشرط للفطر)مع العله والعداله(نصاب الشهاده لفظ أشهد)وعدم الحد فى قذف لتعلق نفع العبد لكن(لا)تشترط (الدعوى)عله لاشتراط ماذكرفى الشهاده على هلال الفطر بخلاف هلال الصوم ؛لان الصوم أمردينى فلم يشترط فيه ذلك ،أمالفطر فهونفع دنيوى للعباد،فاشبه سائرحقوقهم ،فيشترط فيه مايشترط فيها۔"

(الفتاوى الشاميه:ج٣،ص٤٠٦)

واضح رہے:

دوسرے شہر والوں کے لیے رؤیت ہلال تب ثابت ہوگی جب درج ذیل چار طریقوں میں سے ایک طریقہ پایا جائے:

- **شہادۃ بالرؤیت:** یعنی دو عاقل، بالغ، بینا، عادل مسلمان قاضی کی مجلس میں یہ گواہی دیں کہ ہم یہ گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے عید کا چاند دیکھ لیا۔
- **شہادۃ علی الشادۃ:** یعنی دوسرے شہر میں دو عاقل بالغ، بینا عادل مسلمان یہ گواہی دیں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے دو عاقل بالغ عادل گواہوں نے رؤیت کی گواہی دی۔
- **شہادۃ علی القضاء:** یعنی: یعنی دوسرے شہر میں دو عاقل بالغ عادل مسلمان یہ گواہی دیں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے فلاں شہر کے قاضی نے رؤیت ہوجانے کا فیصلہ کیا۔

- **تواتر و استفاضہ :** یعنی دوسرے شہر میں متفرق جماعتیں آکر یہ بیان کریں کہ فلاں شہر میں رؤیت ہوئی ہے اور یہ جماعتیں اتنی زیادہ ہوں کہ اس شہر کے حاکم کو قریب قریب یقین ہو جائے کہ واقعی فلاں شہر میں چاند ہو گیا ہے۔

یاد رہے کہ کسی ایک ریڈیو سے بہت سے شہروں کی خبریں سن لینا استفاضۂ خبر کے لئے کافی نہیں بلکہ استفاضۂ خبر جب سمجھا جائے گا جب دس بیس جگہوں کے ریڈیو اپنے اپنے مقامات کے قاضیوں یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ نشر کریں۔ یا جن لوگوں نے چاند دیکھا ہے ان کا بیان نشر کریں۔ یا چار پانچ جگہ کے ریڈیو اور دس بیس جگہ کے ٹیلفون ایسے لوگوں کے پہنچیں جنہوں نے خود چاند دیکھا ہے یا اس جگہ کے قاضی یا ہلال کمیٹی کا فیصلہ بیان کریں تو اس طرح یہ خبر خبر مستفیض (مشہور) ہو جاتی ہے۔

<u>تاہم دوسرے شہروں کے لیے کسی اور شہر کی مقامی کمیٹی کی خبر پر مذکورہ بالا صورتوں میں عمل کرنا واجب ہے :</u>

"أن الصحیح من مذهب اصحابنا أن الخبر اذااستفاض وتحقق فیمابین اهل احدی البلدتین ،یلزمهم حكم اهل هذه البلده۔

(الفتاوی التاتارخانیہ:ج۲،ص ۳۵۵ ،بحوالہ قاسمیہ:ج۱۱،ص۴۱۱)

"نعم لواستفاض الخبرفی البلده الاخری،لزمهم علی الصحیح من المذهب۔"

(الدرالمختار: کتاب الصوم ،ج۳،ص۴۱۳)

"فی الذخیره قال شمس الائمہ الحلوانی :الصحیح من مذهب اصحابنا أن الخبر اذااستفاض وتحقق فیمابین اهل احدی البلدتین ،یلزمهم حكم اهل هذه البلده۔"

(ردالمحتار:کتاب الصوم،ج۳،ص۴۱۳)
(كذا فی مجمع الانهر:کتاب الصوم،352/1ط:مکتبہ حبیبیہ،کوئٹہ)
(کذافی الفتاوی قاسمیہ:ج س۱۱،ص۴۱۰)

فتاوی قاسمیہ میں مقالہ کے مطابق ایک سوال کیا گیا ہے،جہاں خبر مستفیض کے طور پر چاند دیکھنے کا ثبوت ہو چکا ہے، لیکن کمیٹی عمل درآمد نہیں کرتی ہے،جب کہ مسجد کا امام لوگوں کو کہہ رہا ہے :

کل روزہ نہ رکھو،اور جنہوں نے رکھا ہے ان کا روزہ تڑوادیا ہے، کیا امام مسجد کے لیے ایسا کرنا درست ہے؟جواب میں بتایا گیا ہے : کہ جی ہاں ۔جب چاند کی خبر بکثرت پھیلیں ،تو قاضی یا حکومتی کمیٹی کے اعلان نہ کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے : فتاوی قاسمیہ :ج ۱۱،ص۴۱۱)

قلت: لكن قال في الذخيرة البرهانية ما نصه قال شمس الإئمة الحلواني رحمة الله تعالى الصحيح من مذهب أصحابنا رحمهم الله تعالى أن الخبر إذا استفاض وتحقق فيما بين أهل البلدة الأخرى يلزمهم حكم هذه البلدة. انتهى.ونقل مثله الشيخ حسن الشرنبلالي في حاشية الدرر عن المفتي وعزاه في الدّر المختارإلى المجتبى وغيره مع أن هذه الاستفاضة ليس فيها حكم ولا شهادة لكن لما كانت الاستفاضة بمنزلة الخبر المتواتر وقد

ثبت بها أن أهل تلك البلدة صاموا يوم كذا لزم العمل بها لأن المراد بها بلدة فيها حاكم شرعي كما هو العادة في البلاد الإسلامية فلا بدأن يكون صومهم مبنيًا على حكم حاكمهم الشرعي فكانت تلك الاستفاضة بمعنى نقل الحكم المذكور وهي أقوى من الشهادة بأن أهل تلك البلدة رأوا الهلال يوم كذاوصاموا يوم كذا فإنها مجرد شهادة لا تفيد اليقين فلذا لم تقبل إلا إذا شهدت على الحكم أو على شهادة غيرهم لتكون شهادة معتبرة وإلا فهي مجرد إخبار. أماالاستفاضة فإنها تفيد اليقين كما قلنا ولذا قالوا إذا استفاض وتحقق الخ. فلاينافي ما تقدم عن فتح القدير ولو سلم وجود المنافاة فالعمل على ما صرحوا بتصحيحه والإمام الحلواني من أجل مشايخ المذهب وقد صرح بأنه الصحيح من مذهب أصحابنا.وكتبت فيما علقته على البحر أن المراد بالاستفاضة تواتر الخبر من الواردين من تلك البلدةإلى البلدة الأخرى لا مجرد الاستفاضة لأنها قد تكون مبنية على إخبار رجل واحد فيشيع الخبر عنه ولا شك أن هذا لا يكفي بدليل قولهم إذا استفاض الخبر وتحقق فإن التحقيق لا يكون إلا بما ذكرنا والله تعالى أعلم. [رد المحتار]

مجلة مجمع الفقه الإسلامي - (2 / 704)

إذا ثبت عندهم رؤية أولئك، بطريق موجب، كأن يتحمل اثنان الشهادة أو يشهدا على حكم القاضي، أو يستفيض الخبر، بخلاف ما إذا أخبر أن أهل بلدة كذا رأوه، لأنه حكاية.

الدر المختار وحاشية ابن عابدين (رد المحتار) - (2 / 394)

"حتى قالوا:لورأى أهل المغرب هلال رمضان ،يجب برؤيتهم على أهل المشرق اذاثبت عندهم بطريق موجب۔"

(مجمع الانهر:كتاب الصوم قبيل باب موجب الفساد،بحوالہ قاسمیہ:ج۱۱،ص ۴۲۳)

شرعی شہادت باطریق موجب سے رؤیت ثابت ہونے کے بعدتاخیر مکروہ تحریمی ہے۔

"لان تاخيرهالغيرعذرمن اليوم الاول مكروه۔"

(البحرالرائق،بحوالہ قاسمیہ)

مکروہ کے متعلق علامہ شامی یوں رقمطراز ہے:

وبہ یعلم أنها كراهۃ التحريم۔(الشامیہ)

"ولوكانوا ببلده لاحاكم فيهاصاموا بقول ثقہ وأفطروا باخبارعدلين ۔۔۔والظاہران المراد بہ الوجوب۔"

(كتاب الصوم:قبيل مطلب:لاعبره بقول المنجمين)

جہاں مسلم حاکم یا قاضی شرعی نہ ہو،وہاں اگرعلماء ومفتیان شرعی ثبوت کی بناء پررؤیت کا فیصلہ کردیں،توعیدگاہ کمیٹی کے افراد اورعامہ المسلمین پراس کا ماننا اور عمل کرنا واجب ہے،خلاف کرنا معصیت ہے۔

(مستفاد:امدادالفتاوی:ج ۲،ص ۹۹،کفایت المفتی:ج۴،ص ۲۰۲،بحوالہ قاسمیہ:ج۱۱،ص۳۹۸)

وَقَوْلُهُ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - «صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ»

چونکہ ایک شہر میں چاند نظر آیا ہے، تو دوسرے شہر میں خبر پہنچنے پر عمل کرنا حدیث کے خلاف عمل شمار نہ ہوگا۔

و {فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ} [البقرة : 185]

شہادت موصول ہونے کے جو چار طریقے ہیں وہ اقابل عمل ہیں، گویا چاند اسی شہر میں نظر آیا ہے۔

ہاں۔ اگر خبر درجہ بالا چہار طریقوں سے نہ پہنچی، پھر اکیلے شخص کے لیے روزہ رکھنا ہی بہتر ہے، اگرچہ وہ اکیلا چاند کیوں نہ دیکھے۔

"قَالَ - رَحِمَهُ اللَّهُ - (وَمَنْ رَأَى هِلَالَ رَمَضَانَ أَوْ الْفِطْرِ وَرَدَّ قَوْلَهُ صَامَ) أَمَّا إذَا رَأَى هِلَالَ رَمَضَانَ فَلِقَوْلِهِ تَعَالَى {فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ}[البقرة : 185] وَقَوْلُهُ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - «صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوالِرُؤْيَتِهِ» وَقَدْ رَآهُ ظَاهِرًا فَيَجِبُ عَلَيْهِ الْعَمَلُ بِهِ وَأَمَّا هِلَالُ الْفِطْرِ فَالِاحْتِيَاطُ فِيهِ أَنْ يَصُومَ وَلَا يُفْطِرَ إلَّا مَعَ النَّاسِ لِقَوْلِهِ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ- «صَوْمُكُمْ يَوْمَ تَصُومُونَ وَفِطْرُكُمْ يَوْمَ تُفْطِرُونَ» وَرَوَى أَبُو دَاوُد وَالتِّرْمِذِيُّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ - عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ - قَالَ «الصَّوْمُ يَوْمَ تَصُومُونَ وَالْفِطْرُ يَوْمَ تُفْطِرُونَ» وَالنَّاسُ لَمْ يُفْطِرُوا فِي هَذَا الْيَوْمِ فَوَجَبَ أَنْ لَا يُفْطِرَ وَلِأَنَّ اتِّفَاقَ الْخَلْقِ الْكَثِيرِ وَالْجَمِّ الْغَفِيرِ عَلَى عَدَمِ رُؤْيَتِهِ يَدُلُّ عَلَى خَطَإِ هَذَا الرَّائِي مَعَ اسْتِوَائِهِمْ فِي قُوَّةِ النَّظَرِ وَحِدَّةِ الْبَصَرِ وَمَعْرِفَةِ مَنَازِلِ الْقَمَرِ وَالْحِرْصِ مِنْهُمْ عَلَى طَلَبِهِ وَلَعَلَّهُ رَأَى شَعْرَةً طَوِيلَةً قَائِمَةً بِحَاجِبِهِ أَوْ جُفُونِهِ وَقِيلَ لَا يَصُومُ بَلْ يَأْكُلُ سِرًّا۔وَقَالَ أَبُو اللَّيْثِ مَعْنَى قَوْلِ أَبِي حَنِيفَةَ لَا يُفْطِرُ أَيْ لَا يَأْكُلُ وَلَا يَشْرَبُ وَلَكِنْ لَا يَنْوِي الصَّوْمَ وَلَا يَتَقَرَّبُ بِهِ إلَى اللَّهِ تَعَالَى لِأَنَّهُ يَوْمُ عِيدٍ عِنْدَهُ لِلْحَقِيقَةِ الَّتِي ثَبَتَتْ عِنْدَهُ قَالَ - رَحِمَهُ اللَّهُ تَعَالَى - (فَإِنْ أَفْطَرَ قَضَى فَقَطْ) أَيْ إنْ أَفْطَرَ بَعْدَمَا رَدَّ الْإِمَامُ شَهَادَتَهُ وَالْمَسْأَلَةُ بِحَالِهَا يَجِبُ عَلَيْهِ الْقَضَاءُ"

تبيين الحقائق وحاشية الشلبي - (1 / 318)

(آپ کے مسائل اور ان کا حل، ۱۵۶/۴)

نوٹ: حکومت کی طرف سے یک طرفہ فیصلہ اور شرعی اصول پر عمل درآمد نہ کرنے کی صورت میں ہر شہر کے علماء کرام مقامی کمیٹی بنائیں، ان کا ایک سربراہ مقرر کیا جائے، ضرورت پڑنے پر ہر شہر کے مقامی کمیٹی کے سربراہ آپس میں رابطہ کریں، تاکہ بروقت اطلاع موصول ہونے پر رمضان بھی یک جا ہو اور عید جیسی مذہبی تہوار بھی یک جا منائی جائے۔

ملکی قرضہ لینے سے ہم مقروض شمار نہ ہوں گے:

- مال کے لیے ملک تمام ضروری ہے۔ آپ اس رقم میں کوئی تصرف نہیں کر سکتے ہو۔
- یہ قرضہ ریاست لیتی ہے، جو شخص قانونی اور شخص فرضی کے حکم میں ہے، ملک کے لیے شخص حقیقی چاہیے۔
- اس قرضہ کی حیثیت بیت المال کے قرضہ کے ہے اور یہ واضح ہے، کہ بیت المال کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی ہے۔

- قرضہ لینے کے لیے دوصورتیں ہیں: یاتو آپ خود قرضہ لیں اوریا وکیل کے ذریعہ وصول کریں،جب کہ یہاں دونوں صورتیں مفقود ہیں۔
- علم الفقہ کا مشہور قاعدہ: **تصرف الرعیہ منوط بالمصلحہ**۔یہاں کوئی مصلحت نہیں ہے، محض اپنی خواہشات کی خاطر سودی قرضے لیکر عوام کو مزید آگ کی بھٹی جلانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔
- علم الفقہ کا ایک اور قاعدہ: **الولایہ الخاصہ أقوی من الولایہ العامہ:** شرعی ضابطہ کے مطابق یتیم کا سرپرست یامتولی اس کے مال میں مصلحت سے خالی تصرف نہیں کرسکتاہے،تو حکومت (ولایت عامہ حاصل ہے) بطریقہ اولی مصلحت سے عاری تصرفات کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

درر الحكام في شرح مجلة الأحكام - (8 / 168)

الْقَرْضُ (بِالْفَتْحِ ، وَالْكَسْرِ) مَعْنَاهُ اللُّغَوِيُّ : الْمَالُ الَّذِي يُعْطَى عَلَى أَنْ يُؤْخَذَ بَعْدَ ذَلِكَ بَدَلُهُ ، وَيَكُونُ قِيَمِيًّا أَوْ مِثْلِيًّا .وَعَلَى هَذَا التَّقْدِيرِ يَكُونُ الْقَرْضُ بِمَعْنَى الْمَقْرُوضِ .أَمَّا مَعْنَاهُ الشَّرْعِيُّ : فَهُوَ عَقْدٌ مَخْصُوصٌ يَرِدُ عَلَى دَفْعِ وَإِعْطَاءِ الْمَالِ الْمِثْلِيِّ لِآخَرَ عَلَى أَنْ يَرُدَّ مِثْلَهُ .وَيَخْرُجُ بِقَيْدِ " عَلَى أَنْ يَرُدَّ مِثْلَهُ " ، الْوَدِيعَةُ وَالْهِبَةُ وَالصَّدَقَةُ وَالْعَارِيَّةُ لِأَنَّ الْوَدِيعَةَ وَالْعَارِيَّةَ يَجِبُ رَدُّهُمَا عَيْنًا كَمَا أَنَّ الْهِبَةَ وَالصَّدَقَةَ لَا يَلْزَمُ رَدُّهُمَا عَيْنًا أَوْ بَدَلًا.

(الدُّرُّ الْمُخْتَارُ وَرَدُّ الْمُحْتَارِ) .

مجلة مجمع الفقه الإسلامي - (9 / 617)

والقرض في الاصطلاح: دفع مال لمن ينتفع به, ويرد بدله, وهو نوع من المعاملاتعلى غير قياسها لمصلحة لاحظها الشارع رفقا بالمحاويج.وهو عقد لازم في حق المقرض بالقبض؛ لكونه أزال ملكه عن بعض ماله بغير عوض, جائز في حق المقترض في الجملة؛ لأن الحق له فيه.حكمه: القرض في الأصل حكمه الجواز, لما فيه من الإرفاق وسد حاجة المقترض, وقد يعرض له من الأسباب ما يجعل حكمه يتغير إلى الوجوب أو الكراهة أو الحرمة بحسب الملابسات"

- حکومت کے کسی بھی اقدام کے لیے ضروری ہے کہ وہ اقدام مفاد عامہ کی مصلحت کے پیش نظر ہو۔اسی وجہ سے علماء نے لکھاہے:

أن السلطان لا يصح عفوه عن قاتل من لا ولي له وإنما له القصاص والصلحوعلله في الإيضاح بأنه نصب ناظرا وليس من أهل النظر للمستحق العفو وأصلها ما أخرجه[سعيد بن منصور عن البراء قال : قال عمر رضي الله تعالى عنه : إني أنزلت نفسيمن مال الله تعالى بمنزلة ولي اليتيم إن احتجت أخذت منه فإذا أيسرت رددته فإناستغنيت....

مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے:

(مقروض پاکستانی عوام پر حج کامسئلہ: بینات ،رجب 1424)

لہٰذا:

بنجر زمین جس سے پیداوار نہیں نکلتی ہو (گھر کا خرچہ مزدوری وغیرہ سے پورا ہوتا ہو) چاندی کے نصاب کے برابر قیمت رکھتی ہو، تو صدقہ فطر واضحیہ کے واجب ہونے میں ایسی زمین کی قیمت یا پیداوار کا اعتبار کیا جائے گا۔

اگر ایک ضلع (مثلا: چمن، پشاور اور مردان وغیرہ) میں کئی علماء کرام شہادتوں کی بنیاد پر رمضان یا عید کا اعلان کریں، تو ان کا اعلان جہاں تک صحیح اور معتبر ذرائع سے خبریں بکثرت موصول ہوں، تو وہاں تک خبر واجب العمل ہوگا۔

نیز مذکورہ اعلان کے مطابق اگر اسی علاقے (صوبہ یا ضلع) میں موجود کئی علماء، عوام اور سرکاری حضرات رمضان یا عید نہ منانے سے گناہ گار ہوں گے۔

رمضان کی گواہی لینا صرف قاضی سمیت دوسرے علماء بھی لے سکتے ہیں۔

مرکزی رؤیت ہلال کمیٹی نے روزے کا اور مقامی علماء نے عید کا اعلان کیا، تو عالم دین کے لیے یہ جائز ہے کہ لوگوں سے کہے: روزہ توڑدو اگر کسی نے ان کے حکم کے تحت یا خود روزہ توڑ دیا، تو ان کے ذمہ قضاء یا کفارہ نہ لازم ہوگا، بشرطیکہ شرعی اصولوں کے مطابق چاند کا ثبوت ہو۔

ہمارے ملک پاکستان نے جو قرضے اسلامی وغیر اسلامی ممالک سے (سود یا غیر سود) لیے ہیں، اگر ان قرضوں کو تمام پاکستانی عوام پر تقسیم کی جائے تو ہر پاکستانی کے ذمہ ایک لاکھ (کم وبیش) قرضہ آئے گا، ان لیے ہوئے قرضوں کی وجہ سے پاکستانی عوام مقروض (یا سود خور) شمار نہ ہوں گے جس کی وجہ سے ان کی زکوہ، قربانی وغیرہ کے احکام سے چھٹکارا حاصل ہو جائیں۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ۔

- اسلام میں جغرافیائی حدود کی حیثیت
- شہریت کی شرعی حیثیت
- شہریت کا مدار
- شہریت (وطنیت) کی قسمیں
- شہریت دینے میں سربراہ کا اختیار
- شہریت ختم کرنے میں حاکم کا اختیار
- پناہ گزین شریعت کی نگاہ میں

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

- ✓ کیا اسلام میں جغرافیائی حدود کا اعتبار ہیں ؟
- ✓ افغانستان یا کسی اور ملک کے باشندہ گان یہاں کئی سالوں رہائش پذیر ہیں 'کیا ان کو مہاجرین کہنا درست ہے ؟
- ✓ کیا شریعت میں ایسی مدت ہے 'کہ اتنی مدت تک رہنے پر ملک کی شہریت حاصل ہو گی ؟
- ✓ اگر یہ مہاجرین صرف اس بنیاد پر ہیں کہ ان کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہیں 'تو کیا صرف شناختی کارڈ نہ ہونے سے ان کو مہاجرین کہنا درست ہے 'حالانکہ بہت ساروں کی پیدائش یہاں ہوئی ہے ؟
- ✓ مملکت پاکستان میں کئی قومیں باہر سے آئی ہیں (مثلا: سادات وغیرہ) جن کے ملکی کوائف مکمل پورے ہیں 'ان کو مہاجرین کہنا کیسا ہے ؟
- ✓ افغان مہاجرین کی بے دخلی اور جلاوطنی میں عوام اور خواص کی کیا ذمہ داری بنتی ہیں اور وہ شرعاً کتنے مکلّف ہیں ؟
- ✓ ان کی املاک ضبط کرنا 'یا سستی قیمت پر خریدنا کیسا ہے ؟
- ✓ بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے 'کہ حکومت نے ان کی بے دخلی کا قطعی فیصلہ کر لی ہے 'اس وقت ان کے اموال ضائع ہو رہے ہیں اور یہ لوگ خود سستے نرخ پر بخوشی راضی ہیں۔ان کا کہنا ازروئے شرع کیسا ہے ؟

الجواب حامداومصليا

اسلام ضابطہ حیات ہے 'عالمگیر مذہب ہے 'ہر کسی کے ایمان' جان 'مال 'عقل اور آبرو کے محافظ ہے 'انسان 'حیوان 'چرند اور پرند غرض ہر ایک کے رہنے اور بسنے کے اصول اس میں درج ہیں۔اس میں اخوت اور بھائی چارے کا درس ہے 'اسلام میں مسلمانوں کو ایک جسم کے مانند قرار دیا گیا ہے 'چنانچہ اگر کسی کی آنکھ میں تکلیف ہو 'تو سارا جسم تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے 'اور اگر کسی کے سر میں کوئی تکلیف ہو 'تب بھی سارا بدن بے تاب ہو جاتا ہے۔

اخوت اس کو کہتے ہیں کہ چبھے جو کانٹا کابل میں
تو ہندوستان کا ہر پیر ولاشہ بے تاب ہو جائے

بقول علامہ "محمد اقبال" مرحوم:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیراہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

ہجرت حقیقی :

شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان رحمہ اللہ اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں :

(والمہاجر من ھجر مانہی اللہ عنہ .)

"مہاجر کہلانے کا وہی شخص مستحق ہے'جو گناہ چھوڑدے'وطن چھوڑنا بذات خود مطلوب نہیں 'بلکہ ایک وطن سے دوسرے وطن کی طرف ہجرت کرناتواسی لیے ہوتاہے'تاکہ دوسری جگہ جاکراحکام خداوندی پر عمل کیاجاسکے'توگویا اصل مقصدگناہ کو ترک کرناہی ہے۔اس لیے جو شخص دارالاسلام کی طرف ہجرت کرےاورگناہ کا ارتکاب پھر بھی کررہاہو'تووہ مہاجر کہلانے کاحقدار نہیں ہے۔"

(نفحات التنقیح 'کتاب الایمان : ج ا'ص ۲۷۶)

ہجرت کی اقسام :

حافظ بدر العینی رحمہ اللہ نے ہجرت کی آٹھ قسمیں ذکرفرمائی ہیں :

- ہجرت حبشہ اول۔
- ہجرت حبشہ ثانی۔
- ہجرت مکہ سے مدینہ۔
- ہجرت مختلف قبیلوں کارسول اللہ ﷺ کی طرف۔
- کفارمکہ میں سے مسلمان ہونے والے۔
- اللہ تعالیٰ کا منع کردہ چیزوں سے ہجرت۔
- دارالکفرسے دارالاسلام کی طرف ہجرت۔
- ارض شام کی طرف ہجرت۔(یہ آخرزمانے میں ظہور فتن کے وقت ہوگا۔)

(باب بدء الوحی'شرح بخاری)

غرض مسلمان جہاں بھی رہے وہااس کو رہنے کا حق ہے'شروع اسلام میں ہجرت فرض تھی'بعد میں فرضیت کا حکم ختم ہوا'لیکن اب بھی اگرکسی مسلمان کو اپنے ملک میں ایمان کی حفاظت مشکل ہو'تو ایمان بچانے کی خاطر اس کے لیے ہجرت فرض ہے۔تاریخ اسلام پرسرسری نظرڈالنے سے نوع انسانی کی چارقسمیں ملتی ہیں : مسلمان ۔حربی 'ذمی اور مستامن۔

کلمہ گو مسلمان جہاں بھی رہے وہ مسلمان ہے ،حربی وہ جو دارالحرب میں رہے ،ذمی وہ جو دارالاسلام میں جزیہ دے کر رہے اور مستامن وہ جو تجارت وغیرہ کی غرض سے چند ماہ ٹیکس آدا کر کے رہے۔

یادرہے : اسلام میں زبان ،رنگ ونسل کا فرق تقسیم کے لیے نہیں ،بلکہ صرف پہچان کے لیے ہے ،اس سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور الوہیت کی معرفت ہوتی ہے۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

(ومن آیٰتہ خلق السمٰوٰت والارض واختلاف السنتکم والوٰانکم ان فی ذلک لآیت للعالمین ۔)

مسلمان میں یہ لسانیت ،عصبیت ،وطنیت اور جغرافیائی تقسیم مغرب کا بارآور درخت ہے ،جس کی آبیاری انہوں نے پانی کے بجائے خون سے کیا۔علامہ محمد اقبال مرحوم نے خوب کہا تھا :

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی افغان بھی ہو۔
تم سبھی کچھ ہو بتاتو مسلمان بھی ہو۔
کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں۔
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں۔

شہریت میثاق مدینہ کی روشنی میں :

تاریخ گواہ ہے ،کہ مہاجرین مکہ کو انصار مدینہ نے لبیک کہا اور ان کو اپنی جائیداد میں شریک کیا ،ان کی عزت اورآبرو اپنی عزت سمجھی۔اور پھر میثاق مدینہ نے اس حسن کو مزید نکھار کر سونے پر سہاگہ چڑھایا ،مذہب اسلام نے عقد ذمہ سے بھی غیر مسلموں کو شہریت کے حقوق عطا کیے اور آقا دو عالم ﷺ کا یہ فرمان فقہی قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے :

''لھم ماللمسلمین و علیھم ماعلیہم'' اوکماقال(ابن حبان)

(بحوالہ شہریت اور اس کے متعلق مسائل ،ط : ایفا پبلیکیشنز ،نئی دہلی)

''القاعدۃ العامۃ فی حقوق اہل الذمۃ :ان لھم مالنا و علیہم ماعلینا ،و ھذہ القاعدۃ جرت علی لسان فقہاء الحنفیۃ ،وتدل علیھا عبارات فقہاء المالکیۃ والشافعیۃ والحنابلۃ۔''

(بدائع الصنائع ،المغنی لابن قدامہ ،بحوالہ : الموسوعۃ الفقہیۃ : ج ۷ ،ص ۱۲۷)

مشہور فقیہ امام ''سرخسی ''رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

ان غیر مسلموں نے عقد ذمہ اس لیے قبول کیاہے 'کہ ان کے اقوال اور ان کے حقوق مسلمانوں کے اقوال اور حقوق کے برابر ہوجائیں۔

(شرح السیر الکبیر: ج۳'ص ۲۵۰'بحوالہ شہریت اوراس کے متعلق مسائل: ص ۴۹۴'ط: ایفا پبلیکیشنز'نئ دہلی)

اسلامی تعلیمات کا لب ولباب تو یہ ہے 'کہ اپنے ملک میں رہنے والے ہر شخص کو رہنے سہنے کی ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے'خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو' حتی کہ ایسے مقام پر ان کے مالکانہ تصرف گوارا کیا گیاہے' جہاں کفار کی بودوباش ناجائز ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''(اخرجوا الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب۔)''اوکماقال

لیکن پھر بھی مسلمانوں کے پاس جب تک حجاز سے باہر زمین حاصل نہ ہو سکی 'اس وقت خیبر کے یہود مدینہ ہی میں مقیم رہیں۔ حضرت عمرفاروق رضی اللہ تعالی عنہ کے دورخلافت میں ان کو اریحا وتیما کی طرف بھیجاگیا۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں کو دورفاروقی میں شام کی طرف جلاوطن کیاگیا۔

تفصیل کے لیے: (تاریخ اسلام' نجیب آبادی)

<u>شہریت کا مقصد اپنی عوام کو درج ذیل سہولیتیں مہیا کرنا:</u>

امن وامان کا قیام۔۔۔۔۔ تعلیم وتربیت کی سہولتیں۔۔۔۔۔روزگار سکونت اورضروریات زندگی کی فراہمی۔

البتہ یہ بات ضرورہے 'کہ جغرافیائی حدود ملک کی تقسیم کے لیے ہیں' جیسا کہ فقہا کرام نے اختلاف مطالع میں بلاد قریبہ اور بعیدہ کا اعتبار کیاہیں۔

قال فی ''التاتارخانیۃ'':

''الفتاوی النسفیہ:سئل عن قضاء القاضی برؤیہ ھلال شھررمضان بشھادہ شاھدین عندالاشتباہ فی مصر،ھل یجوز لاھل مصرآخرالعمل بحکمھم؟فقال :لا،ولایکون مصر آخرتبعا لھذا المصر،انما سکان ھذالمصروقراھا یکون تبعالھم ...''

(کتاب الصوم،الفصل الثانی ،رؤیہ الھلال:365/3،ط:زکریا)

''وثانیھا:أنہ لایلزم أھل بلدرؤیہ غیرھم الاأن یثبت ذلک عندالامام الاعظم،فیلزم کلھم لان البلاد فی حقہ کالبلد الواحد اذحکمہ نافذفی الجمیع،قالہ ابن الماجشون۔''

(نیل الاوطار،باب الھلال اذارآہ أہل بلدہ ھل یلزم بقیہ البلاد الصوم:230/4،ط:دارالحدیث،مصر)

’’اذاثبت الصوم اوالفطر عندحاکم تحت قواعد الشرع بفتوی العلماء أو عندواحد أوجماعۃ من العلماء الثقات ولاھم رئیس المملکہ أمررؤیہ الھلال ،وحکموا بالصوم أوالفطر ونشرواحکمھم ھذافی رادیو،یلزم علی من سمعھا من المسلمین العمل بہ فی حدود ولایتھم ،وأما فیماوراء حدود ولایتھم فلابد من الثبوت عندحاکم تلک الولایہ بشہادہ شاہدین علی الرؤیہ أو علی الشہادہ ،أوعلی حکم الحاکم أوجاء الخبرمستفیضا لان حکم الحاکم نافذ فی ولایتہ دون ماوراءھا۔‘‘

(زبدۃ المقال فی رؤیہ الھلال،بحوالہ خیرالفتاوی:118/4،ط:مکتبہ الخیر،ملتان)

مذکورہ عبارتوں سے مقصد جغرافیائی حدود کو واضح کرنا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک ملک کے مسلمان کے لیے دوسرے اسلامی ملک میں رہنے کا حق نہیں ہے۔اس کے برعکس غیر مسلم ملک میں جب ایمان محفوظ نہ ہو‘تووہاں رہائش اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

شہریت کا مدار:

شہریت کا مدار تین چیزوں پر ہے‘پیدائشی مقام۔بودوباش کی نیت سے کسی جگہ قیام۔اس جگہ کی کسی مستقل شہری خاتون سے نکاح وزواج۔

تفصیل کے لیے فتح القدیر: (ج۲‘ص۱۵‘ط: رشیدیہ)

’’انواع الوطن: ---الوطن الاصلی:قال الحنفیۃ:ھوموطن ولادۃ الانسان اوتاھلہ اوتوطنہ وقال ابن عابدین: الوطن الاصلی ،ویسمیٰ بالاھلی ووطن الفطرۃ ،والقرار،ومعنی تاھلہ ای تزوجہ ---لحدیث عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ :من تاھل فی بلد فلیصل صلوٰۃ المقیم ----‘‘

(الموسوعۃ الفقہیۃ: ج۴۴‘ص ۵۶۔۶۰ط: امیر حمزہ کتب خانہ‘کوئٹہ)

حاکم کا شہریت ختم کرنا:

’’ویحک ان شان الھجرۃ شدیدۃ ،فھل لک من ابل؟قال: نعم،قال:فھل تودی صدقتھا؟قال: نعم،قال: فاعمل من وراء البحار؛فان اللہ ھلم یترک من عملک شیئا۔‘‘

(بخاری‘کتاب الادب‘باب ماجائ فی الرجل ویہلک)

(بحوالہ شہریت اور اس کے متعلق مسائل‘ط: ایفاپبلیکیشنز‘نئی دہلی)

کیا کہہ رہے ہو، ہجرت کا معاملہ سخت ہے، کیا تمھارے پاس اونٹ ہیں ؟اس نے کہا : ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا : کیا اس کی زکوۃ دیتے ہو؟ کہاں : ہاں۔ حضور ﷺ نے فرمایا : یہاں دور دراز علاقے میں (سمندر پار رہ کر) رہتے ہوئے عمل کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے عمل میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔

اتنی بات ثابت ہوگئی کہ اگر کوئی شخص کسی جگہ شہریت حاصل کرنا چاہیے، توحکومت اس سے روک سکتی ہے۔

''نفی ابوبکر ماتعا الی فدک ،ولیس بهااحد یومئذ من المسلمین ،واخرج عمر فلانا وفلانا۔''

(عمدۃ القاری : ج۹، ص ۳۰۴)

(بحوالہ شہریت اور اس کے متعلق مسائل، ط : ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماتع نامی مخنث کو فدک روانہ کر دیا، وہاں اس وقت کوئی مسلمان نہ تھا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فلاں وفلاں کو نکال دیا۔

مسئولہ صورتوں کا حکم :

جب رفتہ رفتہ اسلامی احکام کی اہمیت اور فضیلت مسلمانوں کے دلوں میں نہ رہی، تو انہوں نے بجائے اسلامی احکام کے مغربی خود ساختہ پالیسی اور قوانین گلے لگائے، اور یوں مختلف قوموں اور ملکوں میں تقسیم ہو کر مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔اس لیے بڑھتی آبادی کے ساتھ ساتھ فقہاء کرام نے بھی مصلحت اور سد ذرائع **(لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان)** کی خاطر اسلامی ممالک میں بسنے اور وہاں کے حکمرانوں کے لیے درجہ ذیل فتوی جاری کیا :

- اگر وہاں معاشی استحکام ہو، ملک وسیع ہو مہاجرین کے آنے پر وہاں کے لوگ معاشی زبون حالی اور جگہ کی تنگی کے شکار نہ ہوتے ہوں اور ہجرت کرنے والے بھی اپنے ایمان کی حفاظت ،آبرو بچانا اور حصول رزق کی خاطر تشریف آوری کرتے ہوں، تو اس وقت حکومت وقت کے لیے ان کو بسانا اور اجازت دینا ضروری ہے۔
- اور اگر معاشی استحکام نہ ہو کثیر آبادی کی وجہ سے خود وہاں کے باسیوں کے لیے مشکلات ہو، تو پھر اجازت نہ دینے میں حرج نہیں ہے۔

شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق :

غیر مستقل رہائش نہ دینے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ان کے ساتھ بہیمانہ رویہ اپنایا جائے، حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جب ان لوگوں کو وقتی طور ہی سہی اگر ملک میں رہنے کی اجازت دی ہے تو دامے درمے ان کی مدد کریں، ان کی بچوں کی

تعلیم کی فکر کریں ٬حفظان صحت کے سلسلے میں ان کی مدد کریں ٬ان کی دوا وعلاج کا مفت انتظام کریں ٬موسم کی شدت وحدت کے دنوں میں ان کا خاص خیال رکھیں اوراس سلسلے میں یہ کوشش بھی کریں کہ اگران کی ضروریات خود پوری نہ کرسکیں ٬تومال دار اسلامی ممالک سے تعاون کی درخواست کریں اوراقوام متحدہ کی مالی فنڈ سے ان کی مدد کرائیں اوران کے لیے انسانیت نوازی کا پورا ثبوت دیں۔

اس سلسلے میں وہاں کے باشندوں کی ذمہ داری ہے ٬کہ اگرچہ وہ لوگ وہاں کے حقیقی شہری نہیں ہیں ٬لیکن اسلام نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان سے اخوت کے رشتے سے جوڑ دیاہے۔اس لیے ان پناہ گزینوں کو اپنا بھائی سمجھیں اوران سے تعصب نہ برتیں۔

الغرض پناہ گزینوں کے جو حقوق حاصل ہونے چاہیں وہ مختصرایوں ہیں :

ضمیر کی آزادی۔۔۔زبان کی آزادی۔۔۔زندگی گذارنے کی آزادی۔۔۔۔رہائش اورامن وامان کا حق۔

پناہ گزینوں کا قیام چونکہ عارضی ہےاس لیے ان کو خوردونوش ٬علاج ومعالجہ ٬سرکاری اداروں میں حق اور باہمی نزاع خو ختم کرنے کے لیے عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل ہیں ٬البتہ ملکی انتظام وانصرام سے متعلق حقوق میں ان کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے انہیں رائے دہی کا حق حاصل نہیں ہے۔

عہد فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جب قحط پڑا ٬جس سے پوراحجاز لپیٹ میں آیا ٬ہوامیں اڑنے والے پرندے بھی بے خود ہوکر تلملاکر زمین پر گرپڑتے تھے ٬بھوک کی وجہ سے لاشوں کا انبار تھا ٬لوگوں نے اپناعلاقہ چھوڑ کرمدینہ منورہ میں رہائش اختیار کیا ٬حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ دارالاسلام کے ہرملک میں گشتی فرمان جاری کیا ٬کہ لوگ اپنی اپنی امداد بھیجیں ٬استسقا کا عمل بھی ہواپھرلوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

تفصیل کے لیے : (البدایہ والنہایہ : ج۷ ٬ص ۹۰)

<u>یادرہے :</u>

<u>غیر مسلم ملک میں شہریت ٬ یاپناہ گزینی اپنے ایمان ٬جان ٬مال اور عزت وآبرو کی خاطر ہو ٬صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حبشہ کی طرف ہجرت کی ٬جب کہ وہاں عیسائی حکومت تھی۔ہجرت مدینہ کے بعد بہت بعد تک بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وہیں مقیم رہیں۔۔۔۔۔اور ساتھ ساتھ ان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی نیت بھی کریں۔</u>

ویسا تو ہجرت نہ کوئی عیب ہے اور نہ ہی کوئی جرم ہے بلکہ یہ سنت رسول محبوب ﷺ ہے۔ شرعی طور شہریت قابل توجہ نہیں امر نہیں گردانا گیا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کی ارضی طبقات کی تقسیم کو سراہا گیا ہے۔ مگر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے 'کہ آج کل شہریت دینے میں بہت سارے مسلمان ملکوں کی پالیسیاں غیر مسلم ممالک سے قدر مشکل ہیں۔

- ❖ زیر نظر مسئلہ میں جب حکومت نے اخراج کا قطعی اور یقینی فیصلہ کرلی ہے 'تو اس وقت ہر خاص وعام کی ذمہ داری بنتی ہے 'کہ اس کے ناروا رویے کو ببانگ دہل چیلنج کرے 'اور اس جابرانہ پالیسی کو تبدیل کرنے پر اپنے بساط کے مطابق جدوجہد کرے۔ اور اگر حکومت ٹس سے مس نہ ہوتی ہوں 'تو پھر تشدد کی راہ نہ اپنائے 'اس وقت پالیسی ساز لوگ گناہ گار ہوں گے۔
- ❖ تشدد کی راہ اپنانے سے فقہاء کرام نے بہت سارے مسائل میں ممانعت کا فتوی دیا ہیں۔ مثلا: اگر کسی اسلامی ملک میں کوئی زنا کرے اور یا قتل و چوری کا ارتکاب کرے اور حکومت حدود یا قصاص جاری نہ کرتی ہوں 'تو گواہ ہونے کے باوجود بھی عوام الناس رجم یا قطع ید کا عمل نہ کریں۔
- ❖ موجودہ حالات کے پیش نظر مملکت خداداد پاکستان میں جو مہاجرین (ان کے قول کے مطابق) کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا گیا 'ان کی عوامی سطح پر نہ صرف مذمت کی گئی 'بلکہ پرنٹ اور ملٹی میڈیا پر حکومت کو علماء کرام نے بہت کچھ کہا اور مرتب پالیسی بنا کر پیش کی 'کہ اگر مہاجرین کا اخراج حتمی اور یقینی ہے 'تو ان کے لیے پیشگی لائحہ عمل طے ہونا چاہیے اور متعلقہ ملک کے سفارت کے ذریعے مذاکرات کرکے ان کی بے دخلی اور جلاوطنی کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ اور ان کی جان 'مال اور آبرو کا تحفظ یقینی بنانا چاہیے۔ اگر ان کا یہاں سے بے دخلی ناگزیر ہیں 'تو شروع میں ان مہاجرین کے لیے ہمدردی کے دروازے کیوں کھلے رکھے تھے اور اس پر مزید یہ کہ ان کو بسانے کا اقدام کرنے والے جنرل ضیاء الحق ہی تھے 'جنہوں نے روس انقلاب (Russian Revolution) میں ان کو مملکت خداداد پاکستان ہی میں رہنے کی اجازت فراہم کی تھی۔ اور ان لوگوں کے خلاف بھی قانونی کاروائی ہونی چاہیے جنہوں نے ان کو جھانسہ دے کر کسی خاندان میں ضم کرکے شناخت نامے جاری کردیے ہیں۔۔۔۔ اے کاش!! قانون اور ملک کے تہتر ویں آئین کے خلاف ورزی کرنے والے بیوروکریٹس بھی انصاف کے کٹھرے میں کھڑے کیے جاتے ؟؟!
- ❖ ان کی املاک کو شیر مادر سمجھ کر ہڑپ کرنے 'یا ضبط کرنا شریعت اور عالمی دستور دونوں کے خلاف ہے 'ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرکے قیمت میں اضافہ کرکے ان سے چیزیں خریدی جاتی۔۔۔ مگر ہائے افسوس!!! گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔۔۔ مسلمان ایک دوسرے کے مال چوری چپکے لینے کے درپے ہیں۔

❖ ان کی اضطراری حالت کو دیکھ کر چیز خرید نا یقینا مکروہ ہے۔لیکن جب وہ حکومت کے حتمی فیصلہ کے بعد اتنے بے بس ہوں اور وہ ہر حال میں سستی قیمت پر راضی ہوں ،تو خریدنے میں کوئی حرج نہیں ہے اوراس کا گناہ ان پالیسی سازاداروں کو ملے گا ،جنہوں نے یہ جابرانہ اورظالمانہ فیصلہ دائر کیا ہیں۔

آخر میں ہندوستان فقہی سیمینار کا شہریت کے متعلق مختصر خلاصہ درج ذیل ہوگا :

- شریعت میں مسلمانوں کے لیے کوئی جغرافیہ حدود نہیں ہیں۔
- شریعت میں شہریت قابل توجہ امر نہیں ہے۔
- ہجرت کرنے والے مسلمان کے ساتھ عام مسلمانوں جیسا رویہ اپنایا جائے گا۔
- کوئی بھی غیر مسلم اگر ہمیشہ رہائش اختیار کرنا چاہیے ،تو عقد ذمہ کے ساتھ رہے گا اوراس پر ذمی کے احکام جاری ہوں گے۔
- کوئی بھی غیر مسلم تجارت کی خاطر آتا ہو،تو مستامن ہوگا اور ٹیکس آدا کر کے چلتا بنے گا۔

(تیئیسواں فقہی سمینار،منعقدہ : (1...3) مارچ (2014) جامعہ علوم القرآن جموسر ،گجرات)

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

1۔۔۔آن لائن خریداری میں قبضہ کی اہمیت

2۔۔آن لائن خریداری میں خریدار کا صرف سابقہ بل حوالہ کرنا

3۔۔۔رقم کی منتقلی بذریعہ اکاؤنٹ سے قبضہ کا متحقق ہونا

4۔۔۔کرنسی کی تعین کا قبضہ پر اثر

5۔۔۔آن لائن خرید ہوئی چیز وصول ہونے کے بعد پسند نہ آنا

6۔۔۔آن لائن خریداری میں مبیعہ اور رقم کا خرچہ

7۔۔۔آن لائن خریداری میں مبیعہ اور رقم کا خرچہ

8۔۔آن لائن خریداری میں سامان بھیجنے کے دوران نقصان پہنچنا

9۔۔۔کیاآن لائن آرڈر دینا بیع ہے، یا وعدہ بیع ہے؟

بسم الله الرحمن الرحمن۔

آن لائن خریداری کی شرعی حیثیت:

- آن لائن خریداری میں بیع کب مکمل ہو جاتی ہے؟
- چیز وصول کرنے کے بعد اگر پسند نہ آئے تو کیا حل ہوگا؟
- مبیع اور رقم بھیجنے کا خرچہ کس کے ذمہ ہے؟

1 :آن لائن خریداری میں بیع تام اور مکمل ہونے کے لیے بنیادی چیز قبضہ ہے۔

کسی بھی خرید وفروخت میں قبضہ ضروری ہے، بصورت دیگر کسی کو وکیل بالقبض بنائے، یعنی پہلے سودا مکمل کرے، اس کے بعد قبضہ وکیل کے ذریعہ کرائے۔ قبضہ مکمل ہونے کے بعد آن لائن ہی کے ذریعے آگے فروخت (forward sale) بھی کر سکتا ہے۔

واضح رہے:

مروجہ صورتوں میں بسااوقات گاہک چیز کو whatsapp کے ذریعے دیکھ کر بیع کرلیتا ہے اور پھر اس کو قبضہ میں لیے بغیر بائع ہی کے ذریعہ قبضہ کراکر اس کو کسی اور شخص پھر فروخت کرتا ہے۔اور یوں اس کو منافع حاصل ہو جاتا ہے۔تو از روئے شرع اس میں قدر تفصیل ہے:

وکیل بنانے کی تین صورتیں بنتی ہیں:

- اس کی صراحت کردی کہ آپ (بائع) قبضہ کے لیے وکیل بنے۔
- اس کی صراحت کردی کہ آپ کسی اور پر فروخت کرنے کے لیے وکیل بنے۔
- مشتری نے آن لائن خریداری کی قبضہ کرنے یا نہ کرنے کی کوئی خاص صراحت نہ کی۔

مندرجہ بالا تینوں صورتوں میں بیع درست ہے۔ فقہاء کرام نے وکالت کے باب اتنی جہالت برداشت کی ہے، جو محل نزاع نہ ہو، جب کہ یہاں تو معاملہ باہمی خوشی سے ہوتا ہے۔اور پھر خاص کر تیسری صورت میں جواز کا فتوی اسی لیے دیا جائیگا کہ اس میں وہ جھگڑا ناپید ہے، جس سے بائع اور مشتری میں بیع فسخ ہو جائے۔

"(وأما ما يتصل بذلك) : فمنه أنه يتحمل الجهالة اليسيرة في الوكالة ولا تبطل بالشروط الفاسدة أيشرط كان، ولا يصح شرط الخيار فيها؛ لأن شرط الخيار شرع في لازم يحتمل الفسخ، والوكالة غيرلازمة كذا في

فتاویقاضي خان حتى أن من قال: أنت وكيل في طلاق امرأتي على أني بالخيار ثلاثةأيام أو على أنها بالخيار ثلاثة أيام، فالوكالة جائزة والشرط باطل كذا في المحيط في أنواع الخيار فيالوكالة. ومنه صحة إضافتها فتقبل التقييد بالزمان والمكان۔"

(الفتاوى الهندية:الباب الاول فى معنى الوكالۃ)

"الأصل أن الجهالة إذا كانت تمنع الامتثال ولا يمكن تداركهما تمنع صحةالوكالة وإلا فلا كذا في التبيين والجهالة ثلاثة أنواع: فاحشة وهي جهالةالجنس كالتوكيل بشراء الثوب والدابة والرقيق، وهي تمنع صحة الوكالةوإن بين الثمن، ويسيرة وهي جهالة النوع كالتوكيل بشراء الحمار والبغلوالفرس والثوب الهروي والمروي، فإنها لا تمنع صحة الوكالة وإن لم يبين الثمن. ومتوسطة وهي بين الجنس والنوع كالتوكيل بشراء عبد أو أمةأو دار، فإن بين الثمن أو النوع تصح وتلحق بجهالة النوع، وإن لم يبينالثمن أو النوع لا تصح وتلحق بجهالة الجنس كذا في الكفاية۔"

(الهندية:الباب الثانى فى التوكيل والشراء)

"وبيان ذلك أن التوكيل بالشراء نوعان: عام وخاص فالعام: أن يقول له: اشتر لي ما شئت، أو ما رأيت، أو أي ثوب شئت، أو أي دار شئت، أو ما تيسر لك من الثياب، ومن الدواب، ويصح مع الجهالة الفاحشة من غير بيان النوع والصفة والثمن لأنه فوض الرأي إليه فيصح مع الجهالة الفاحشة كالبضاعة، والمضاربة.والخاص: أن يقول: اشتر لي ثوبا أو حيوانا أو دابة أو جوهرا أو عبدا أو جارية أو فرسا أو بغلا، أو حمارا أو شاة والأصل فيه أن الجهالة إن كانت كثيرة تمنع صحة التوكيل، وإن كانت قليلة لا تمنع وهذا استحسان. والقياس أن يمنع قليلها وكثيرها---(وجه) الاستحسان ما روي: أن رسول الله - ﷺ -«دفع دينارا إلى حكيم بن حزام ليشتري له به أضحية» ولو كانت الجهالة القليلة مانعة من صحة التوكيل بالشراء لما فعله رسول الله - ﷺ -؛ لأن جهالة الصفة لا ترتفع بذكر الأضحية، وبقدر الثمن؛ ولأن الجهالة القليلة في باب الوكالة لا تفضي إلى المنازعة؛ لأن مبنى التوكيل على الفسحة والمسامحة "

(بدائع الصنائع: فى شرائط الوكالۃ)

"والأصل فيه أن الجهالة اليسيرة تتحمل في الوكالة كجهالة الوصف استحسانا ، لأن مبنى التوكيل على التوسعة ؛ لأنه استعانة .وفي اعتبار هذا الشرط بعض الحرج وهو مدفوع۔"

(فتح القدير: فصل فى الوكالۃ)

"أعلم أن الجهالة ثلاثة أنواع : فاحشة وهي جهالة الجنس كالتوكيل بشراء الثوب والدابة والرقيق وهي تمنع صحة الوكالةوإن بين الثمن ؛ لأن الوكيل لا يقدر على الامتثال .ويسيرة وهي جهالة النوع كالتوكيل بشراء الحمار والفرسوالبغل والثوب الهروي والمروي فإنها لا تمنع صحة الوكالة وإن لم يبين الثمن ."

(فتح القدير: فصل فى الوكالۃ فى الشراء)

"قوله: باب... الخ؛ أفردَ الوكالة بالبيع والوكالة بالشراء بباب على حدة؛ لكثرةِ الاحتياجِ إليها، وقدَّم هذا الباب على سائرِ أبوابِ الوكالة؛لأنّه أكثر، وأمسّ حاجة، وقدَّم من هذا الباب بحث الشراء؛ لأنّه ينبئ عن إثباتِ الملك، والبيع ينبئ عن إزالة، والإزالةُ بعد الإثبات، والأصلُ في هذا البابِ أنَّ الجهالةَ إذا كانت تمنعُ الامتثال، ولا يمكن دركها تمنعُ صحَّة الوكالة وإلاَّ فلا۔"

(عمدة الرعاية : كتاب التوكيل)

"الجهالة في الوكالة باعتبار المتعلق على قسمين:القسم الأول - تكون في المعقود عليه. يعني في المشترى والمبيع.القسم الثاني - تكون في المعقود به يعني في الثمن.القسم الأول - ثلاثة أنواع:النوع الأول - الجهالة الفاحشة: يعني جهالة الجنس.النوع الثاني - الجهالة اليسيرة يعني جهالة النوع.النوع الثالث - الجهالة المتوسطة يعني الجهالة التي بين الجنس والنوع.

(تكملة رد المحتار، ابن عابدين على البحر)."

(دررالحكام فى شرح مجلة الاحكام : المادة : ١٤٦٩)

"أما الوكالة العامة فإنها تصح مع الجهالة الكثيرة كما إذا قال اشتر لي ما شئت أو ما رأيت لأنه فوض الرأي إليه فصار بمنزلة البضاعة والمضاربةوأما الوكالة الخاصة فالقياس أن لا تجوز ما لم يذكر الجنس وقدر الثمن والصفة كما في البيعوفي الاستحسان أن الجهالة اليسيرة لا تمنع۔"

(تحفة الفقهاء : كتاب الوكالة)

"الْمُنَازَعَةِ أَلَا تَرَى أَنَّ التَّمْلِيكَيْنِ يَصِحُّ فِي هَذَا وَهَذَا أَضْيَقُ مِنْ الْإِسْقَاطَاتِ ثُمَّ الْجَهَالَةُ الَّتِي لَا تُفْضِي إلَى الْمُنَازَعَةِ لَا تَمْنَعُ صِحَّةَ التَّمْلِيكِ۔"

(المبسوط للسرخسى:باب العيوب فى البيوع)

"لأن زوال الجهالة بيدهما فلا تفضي إلى المنازعة لأنها تزول بالكيل والعدوالزرع ومثل ذلك لا يعد مانعا۔"

(مجمع الانهر:ج٣،ص١٧)

(كذافى الفتاوى القاسمية:ج١٩،ص ٢٥١)

ابتلائے عام اور جھگڑانہ ہونے کی وجہ سے جائز ہے۔

(كذافى الفتاوى القاسمية:ج١٩،ص ٢٥١)

(آن لائن خریداری کے جواز کے لیے فتاوی عثمانیہ : ج۷،ص۱۰۰)

واضح رہے: اگر گاہک نے صرف یہ کہا: کہ مال کسی کو دے کر میری طرف روانہ کردے، تو بھی اسے قبضہ متحقق ہوگا۔

"اذا قال المشتري للبائع ابعث إلى ابني واستأجر البائع رجلا يحمله إلى ابنه فهذا ليس بقبض والأجر على البائع إلا أن يقول استأجر علي من يحمله فقبض الأجير يكون قبض المشترى إن صدقه أنه استأجر ودفع إليه وإن أنكر استئجاره والدفع إليه فالقول قوله كذا في التتارخانيةوفي مجموع النوازل لو اشترى وعاء هدبد من قروي في السوق وأمره بنقله إلى حانوته فسقط في الطريق هلك على البائع وكذا لو اشترى وقر التبن أوالحطب في المصر فعلى البائع أن ينقله إلى بيته ولو هلك في الطريق.

(الفتاوى الهندية:الفصل الثانى فى تسليم المبيع وفيمايكون....)

(کذا فی احسن الفتاوی : کتاب البیوع،ج۷)

آن لائن خریداری میں خریدار کا صرف سابقہ بل حوالہ کرنے سے بیع تام ہونا:

خریدارحسب سابق صرف بل حوالہ کرتاہے ،اس میں جتنی بھی چیزیں ہوں کپڑوں کے تان ہوں، یا ڈبوں میں پیک سامان ہو،اس کو نہ خریدار دوبارہ وزن کرتاہے اورنہ ہی بائع اس کے سامنے ہوتاہے،بلکہ سارامعاملہ بل کے مطابق ہوتاہے،بلکہ بعض اوقات بائع ازخود بھیج دیتاہے اوریااس کے علاوہ دیگر صورتیں ہوں ،تودورجدید کی بکثرت اس قسم کی خریدوفروخت کے متعلق جواز کافتودی دیاجائیگا۔

واضح رہے:

ان مسائل کے متعلق فقہ کی سابقہ کتب میں جو عدم جواز کا فتوی دیا گیاہے،اس کا اصل سبب عدم اعتماداور جھگڑاہے ۔لہٰذااعتماداور جھگڑاکیے بغیراگر خریدوفروخت باہمی رضامندی کے ساتھ ہو،تواس کے جواز کافتویٰ دیاجاسکتاہے۔

چنانچہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ رقمطراز ہیں:

"فالذی یتبین ان المشتری ان اعتمد علی کیل البائع جاز لہ اکلہ بدون اعادۃ الکیل سواءکان بحضرتہ اوبغیبتہ"

(فیض الباری:۲۲۰/۳)

کیارقم کی منتقلی بذریعہ اکاؤنٹ سے قبضہ متحقق اوربیع تام ہوجائیگی؟

واضح رہے:

فقہ میں قبضہ کا مطلب تمام وہ روکاوٹیں دور کرنا،جن کے ذریعے سے چیز وصول کرنے میں حرج ہو،لہٰذااکاؤنٹ سے اکاؤنٹ کے ذریعے رقم حوالہ کرنے سے قبضہ متحقق ہوجائیگا۔

" التخلية: رفع الموانع، بأن يضع المال بين يدي المولى بحيث لو مد يده أخذه، فحينئذ يحكم القاضي بأنه قبضه، وكذا في ثمن المبيع وبدل الإجارة وسائر الحقوق"

(الشامية:باب العتق على جعل)

"مطلب في شروط التخلية وحاصله: أن التخلية قبض حكما لو مع القدرة عليه بلا كلفة لكن ذلك يختلف بحسب حال المبيع، ففي نحو حنطة في بيت مثلا فدفع المفتاح إذا أمكنه الفتح بلا كلفة قبض، وفي نحو دار فالقدرة على إغلاقها قبض أي بأن يكون في البلد فيما يظهر، وفي نحو بقر في مرعى فكونه بحيث يرى

ويشار إليه قبض وفي نحو ثوب، فكونه بحيث لو مد يده تصل إليه قبض، وفي نحو فرس أو طير في بيت إمكان أخذه منه بلا معين قبض. (قوله: بلا مانع) بأن يكون مفرزا غير مشغول بحق غيره، فلو كان المبيع شاغلا كالحنطة في جوالق البائع لم يمنعه بحر. وفي الملتقط: ولو باع دارا وسلمها إلى المشتري وله فيها متاع قليل أو كثير لا يكون تسليما حتى يسلمها فارغة، وكذا لو باع أرضا وفيها زرع. اهـ. وفي البحرعن القنية: لو باع حنطة في سنبلها فسلمها كذلك لم يصح كقطن في فراش، ويصح تسليم ثمار الأشجار وهي عليها بالتخلية وإن كانت متصلة بملك البائع، وعن الوبري المتاع لغير البائع لا يمنع، فلو أذن له بقبض المتاع والبيت صح وصار المتاع وديعة عنده. اهـ."

(الشامية:مطلب فيمايكون قبضاللمبيع)

<u>آن لائن خریداری میں کرنسی کی تعین کا قبضہ پر اثر:</u>

کرنسی کی تعین نہ کی ہو اور یا خریداری ڈالر کے ذریعہ ہوئی، تب بھی اس کے عوض روپیہ دینا درست ہے۔

"وإن كان في البلد نقود مختلفة فإن كانت في الرواج على السواء ولا فضل للبعض على البعض فالعقد جائز ويعطي المستأجر أي النقود شاء، وإن كانت الأجرة مجهولة؛ لأن هذه الجهالة لا تفضي إلى المنازعة، وإن كانت النقودفي الرواج على السواء وللبعض صرف على البعض فالعقد فاسد، وإن كان أحدهما أروج فالعقد جائز وينصرف إلى الأروج، وإن كان للآخر فضل عليه بحكم العرف، كذا في المحيط.

(الهندية : متى تجب الاجرة....)

(ومنها) أن يكون المبيع معلوما وثمنه معلوما علما يمنع من المنازعة.فإن كان أحدهما مجهولا جهالة مفضية إلى المنازعة فسد البيع، وإن كانمجهولا جهالة لا تفضي إلى المنازعة لا يفسد؛ لأن الجهالة إذا كانت مفضيةإلى المنازعةكانت مانعة من التسليم والتسلم فلا يحصل مقصود البيع، وإذا لمتكن مفضية إلى المنازعة لا تمنع من ذلك؛ فيحصل المقصود وبيانه في مسائل:إذا قال: بعتك شاة من هذا القطيع أو ثوبا من هذا العدل فالبيع فاسد؛ لأن الشاةمن القطيع والثوب من العدل مجهول جهالة مفضية إلى المنازعة لتفاحش التفاوت بين شاة وشاة، وثوب وثوب، فيوجب فساد البيع.

(البدائع:فصل فی شرائط الصحۃ فی البیوع)

"ومن أطلق الثمن في البيع كان على غالب نقد البلد لأنه المتعارف فإن كانت النقود مختلفة فالبيع فاسد إلا أن يبين أحدهما وهذا إذا كان الكل في الزواج سواء لأن الجهالة مفضية إلى المنازعة إلا أن نرفع الجهالة بالبيان أو يكون أحدهما أغلب وأروج فحينئذ يصرف إليه تحريا للجواز وهذا إذا كانت مختلفة في المالية فإن كانت سواء فيها كالثنائي والثلاثي جاز البيع إذا أطلق اسم الدراهم وينصرف إلى ما قدر به من أي نوع كان لأنه لا منازعة ولا اختلاف في المالية كذافي الهداية.

(لسان الحكام : الفصل السابع عشر فی البیع)

ایک ملک کی کرنسی کا آپس میں تبادلہ کرنے سے کمی بیشی درست نہیں ہے،جب دوملکوں کی کرنسی آپس میں مختلف الجنس ہے۔بنابراین اگرخریدوفروخت ڈالر کے ذریعے ہواور آدائیگی کرنسی سے ہو،تو شرعاکوئی حرج نہیں ہے۔اور قیمت یوم خریدوفروخت کامعتبر ہوگا۔

(تفصیل کے لیے جامع الفتاوی: ج٦، ص١٥)

(فتاوی عثمانی: ج٣، ص١٤١)

"فيجوز إذن أن يباع الريال السعودي مثلاً بعدد أكثر من الربيات الباكستانية.ثم إن أسعار هذه العملات بالنسبة إلى العملات الأخرى ، ربما تعين من قبل الحكومات، فهل يجوز بيعها بأقل أو أكثر من ذلك السعر المحدد؟ والجواب عندي أن البيع بخلاف هذا السعر الرسمي لا يعتبر ربا ؛ لما قدمنا من أنها أجناس مختلفة، ولكن تجري عليه أحكام التسعير، فمن جوز التسعير في العروض، جاز عنده هذا التعسير أيضًا، ولا ينبغي مخالفة هذا السعر، إمالأن طاعة الإمام فيما ليس بمعصية واجب، وإما لأن كل من يسكن دولةفإنه يلتزم قولاً أو عملاً بأنه يتبع قوانينها، وحينئذ يجب عليه اتباع أحكامها،مادامت تلك القوانين لا تجبر على معصبة دينية ."بيع العملات بدون التقابض :ثم إن هذه الأوراق النقدية، وإن كان لا يجوز فيها التفاضل، ولكن بيعها ليس بصرف، فلا يشترط فيه التقابض في مجلس العقد ، نعم يشترط قبض أحدالبدلين عند الإمام أبي حنيفة وأصحابه؛ لأن الفلوس عندهم لا تتعين بالتعيين،فلو افترقا دون أن يقبض أحد البدلين، لزم الافتراق عن دين بدين. وأماعند الأئمة الثلاثة فينبغي أن لا يشترط ذلك إن كان أحد البدلين متعينًا؛ لأن الأثمان تتعين بالتعيين عندهم ."

(مجلة مجمع الفقه الاسلامی:أحكام أوراق النقودوالعملات لفضيلة القاضی)

(التبيان فی زكوٰة الأثمان:بحواله فتاوی قاسمية :ج١٩،ص٥٨٣)

2. ...مبیعہ (خریدی ہوئی چیز) وصول کرنے کے بعد پسند نہ آنا:

خیار رؤیت اور خیار عیب کی بناپر مبیع پسند نہ آنے کی بناپر بیع فسخ کرسکتاہے۔جب آن لائن خریداری میں رؤیت کی کوئی بھی صورت ہو،مبیعہ میں کوئی عیب بھی نہ ہواور فریقین اس پر رضامندی کا اظہار بھی کریں،تو پسند نہ آنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

قال فی "الهداية":

"واذاحصل الايجاب والقبول لزم البيع،ولاخٰيارلواحدمنهماالامن عيب اورعدم رؤية"

تصویر کے دیکھنے سے اوریااس مبیعہ کے اوصاف اور کوالٹی سے خیار رؤیت ختم ہوجاتی ہے۔

"(قوله: أي المبيع) أي الذي لم يرياه بأن كان مستورا. (قوله: فلو لم يشر إلى ذلك إلخ) عبارة الفتح هكذا: وفي المبسوط الإشارة إليه أو إلى مكانه شرط الجواز، فلو لم يشر إليه ولا إلى مكانه لا يجوز بالإجماع هـ. لكن إطلاق الكتاب يقتضي جواز البيع، سواء سمى جنس المبيع أو لا، وسواء أشار إلى مكانه أو إليه وهو حاضر

مستور أو لا، مثل أن يقول بعت منك ما في كمي، بل عامة المشايخ قالوا: إطلاق الجواب يدل على الجواز عنده."

(الشامية:باب خيارالرؤية)

"ومن اشترى شيئا لم يره فالبيع جائز، وله الخيار إذا رآه، إن شاء أخذه بجميع الثمن "وإن شاء رده" وقال الشافعي: لا يصح العقد أصلا؛ لأن المبيع مجهول. ولنا قوله عليه الصلاة والسلام: "من اشترى شيئا لم يره فله الخيار إذا رآه"؛ ولأن الجهالة بعدم الرؤية لا تفضي إلى المنازعة، لأنه لو لم يوافقه يرده، فصار كجهالة الوصف في المعاين المشار إليه. "وكذا إذا قال رضيت ثم رآه له أن يرده" لأن الخيار معلق بالرؤية لما روينا فلا يثبت قبلها، وحق الفسخ قبل الرؤية بحكم أنه عقد غير لازم لا بمقتضى الحديث، ولأن الرضا بالشيء قبل العلم بأوصافه لا يتحقق فلا يعتبر قوله رضيت قبل الرؤية بخلاف قوله رددت."

(الهداية :باب خيارالرؤية)

"يجب أن يعلم أن شراء مالم يره المشتري جائز عندنا."

(المحيط البرهانى:الفصل ،الثالث عشر فى خيارالرؤية)

قَالَ (شِرَاءُ مَا لَمْ يَرَهُ جَائِزٌ وَلَهُ أَنْ يَرُدَّهُ إذَا رَآهُ وَإِنْ رَضِيَ قَبْلَهُ) وَقَالَ الشَّافِعِيُّ : لَا يَجُوزُ الْبَيْعُ ؛ لِأَنَّ الْمَبِيعَ مَجْهُولٌ إذْ لَمْ يُعْرَفْ مِنْهُ إلَّا الِاسْمُ فَصَارَ كَمَا لَمْ يُشِرْ إلَيْهِ وَلَا إلَى مَكَانِهِ أَوْ هُوَ مَعْدُومٌ لِمَا ذَكَرْنَا «وَنَهَى رَسُولُ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - عَنْ بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَ الْإِنْسَانِ» أَيْ مَا لَيْسَ بِحَاضِرٍ عِنْدَ الْمُتَبَايِعَيْنِ مَرْئِيٍّ لِلْمُشْتَرِي وَلَنَا قَوْلُهُ - عَلَيْهِ السَّلَامُ - «مَنْ اشْتَرَى مَا لَمْ يَرَهُ فَلَهُ الْخِيَارُ إذَا رَآهُ» وَلِأَنَّ الْجَهَالَةَ فِيهِ لَا تُفْضِي إلَى الْمُنَازَعَةِ ؛ لِأَنَّهُ إذْ لَمْ يُوَافِقْهُ رَدَّهُ فَصَارَ كَجَهَالَةِ الْوَصْفِ فِي الْمُشَاهَدِ الْمُعَايَنِ وَالْمُرَادُ بِالنَّهْيِ عَنْ بَيْعِ مَا لَيْسَ عِنْدَ الْإِنْسَانِ مَا لَيْسَ فِي مِلْكِهِ بِدَلِيلِ قِصَّةِ الْحَدِيثِ فَإِنَّ «حَكِيمَ بْنَ حِزَامٍ قَالَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إنَّ الرَّجُلَ يَطْلُبُ مِنِّي سِلْعَةً لَيْسَتْ عِنْدِي فَأَبِيعُهَا مِنْهُ----

(تبين الحقائق:باب خيارالرؤية)

"الفصل الأول في ثبوت الخيار وحكمه وشرائطه ومعرفة العيب وتفصيله](الباب الثامن في خيار العيب وفيه سبعة فصول) (الفصل الأول في ثبوت الخيار وحكمه وشرائطه ومعرفة العيب وتفصيله) خيار العيب يثبت من غير شرط كذا في السراج الوهاج وإذا اشترى شيئا لم يعلم بالعيب وقت الشراء ولا علمه قبله والعيب يسير أو فاحش فله الخيار إن شاء رضي بجميع الثمن وإن شاء رده كذا في شرح الطحاوي وهذا إذا لم يتمكن من إزالته بلا مشقة، فإن تمكن فلا -----هكذا في شرح الطحاوي-"

(الفتاوى الهندية:الفصل الاول فى ثبوت الخياروحكمه وشرائطه)

عبارات مذکورہ بالاسے ثابت ہوا،کہ خیارعیب کی صورت میں پسند نہ آنے کی بناپرقبضہ سے پہلے مطلّقارد کرسکتاہے،جب کہ قبضہ کے بعد فسخ کرنے میں رضابائع یا قضاقاضی شرط ہے۔

کمپنی کے مصنوعات اگر مطلوبہ شرائط اور خوبیاں سے عاری ہوں،توبیعہ واپس کرنے کااختیارہے۔

(تفصیل کے لیے جامع الفتاوی : ج٦، ص ٦٩١)

(فتاوی حقانیہ : ص ١٣٤)

یادرہے : خیار عیب کی بناپر چیزاس وقت واپس ہوسکتی ہے،جب اس میں تصرف نہ ہو۔

(تفصیل کے لیے فتاوی مفتی محمود : خرید وفروخت کا بیان ،ج ٨، ص ٢٧٤)

3....آن لائن خریداری میں مبیعہ اور رقم بھیجنے کا خرچہ :

جہاں خریدوفروخت ہوئی ہو،وہاں تک مبیعہ پہنچانا بائع ورقم خریدار کے ذمہ ہے۔البتہ اگرایسی منقولی شئے ہوجس کے منتقل کرنے میں خرچہ نہ کرناپڑے،توکسی بھی مکان میں حوالہ کرسکتاہے۔

لتعيين مكان الإيفاء، وتعيين مكانه فيما لا حمل له ولا مؤنة لا يصح وإن كان شيئا له حمل ومؤنة يصح تعيين مكان الإيفاء ويجوز البيع أيضا كذا في فتاوى قاضي خان.

(الهندیہ:الباب السابع فی الشروط التی تفسد البیع)

(ولأبي حنيفة - رحمه الله -) أن العقد وجد مطلقا عن تعيين مكان فلا يتعين مكان العقد للإيفاء، والدليل على إطلاق العقد عن تعيين مكان الحقيقة والحكم.(أما) الحقيقة فلأنه لم يوجد ذكر المكان في العقد نصا فالقول بتعيين مكان العقد شرعا من غير تعيين العاقدين تقييد المطلق فلا يجوز إلا بدليل.(وأما) الحكم فإن العاقدين لو عينا مكانا آخر جاز، ولو كان تعيين مكان العقد من مقتضيات العقد شرعا لكان تعيين مكان آخر تغييرا لمقتضى العقد وإنه يعتبر فيه حكم الشرع فينبغي أن لا يجوز، وإذا لم يتعين مكان العقد للإيفاء بقي مكان الإيفاء مجهولا جهالة مفضية إلى المنازعة؛ لأن في الأشياء التي لها حمل ومؤنة تختلف باختلاف الأمكنة لما يلزم في حملها من مكان إلى مكان آخر من المؤنة فيتنازعان.

(بدائع الصنائع:فصل فی الشرط الذی یرجع الی المسلم)

رجل اشترى شيئاً على أن يحمله البائع إلى منزل المشتري قالوا إن قال ذلك بالعربية لا يجوز البيع وإن قال بالفارسية جاز لأن في العربية يفرق بين الحمل والإيفاء وفي الفارسية لا يفرق ويكون شرط الحمل بمنزلة شرط الإيفاءاشترى حطباً في قرية شراء صحيحاً وقال موصولاً بالبيع واحمله إلى منزلي جاز البيع لأن هذه مشورة وليس بشرط إن شاء حمل وإن شاء لم يحمل۔

(فتاوی قاضی خان)

"بَيَانُ مَكَانِ الْإِيفَاءِ فِي الصَّحِيحِ حَتَّى يَفْسُدَ إذَا لَمْ يُبَيِّنْ وَعِنْدَهُمَا لَا يُشْتَرَطُ فَيُسَلِّمُ فِي مَكَانِ الْبَيْعِ وَمَكَانِ تَسْلِيمِ الْعَيْنِ الْمُسْتَأْجَرَةِ وَفِي مَوْضِعِ الْقِسْمَةِ ، ثُمَّ إذَا عَيَّنَ مِصْرًا جَازَ ؛ لِأَنَّهُ مَعَ تَبَايُنِ أَطْرَافِهِ كَبُقْعَةٍ وَاحِدَةٍفِي حَقِّ هَذَا الْحُكْمِ ؛ لِأَنَّ قِيمَتَهُ لَا تَخْتَلِفُ بِاخْتِلَافِ الْمَحَلَّةِ مِنْ مِصْرٍ وَاحِد......وإِنْ شَرَطَ أَنْ يُوفِيَهُ فِي مَوْضِعٍ ، ثُمَّ يَحْمِلُهُ إلَى مَنْزِلِهِ لَا يَجُوزُ ؛ لِأَنَّهُ يَمْلِكُهُ بِالْإِيفَاءِ ، ثُمَّ اشْتِرَاطُ الْحَمْلِ يَكُونُ إجَارَةً فِي بَيْعٍ فَلَا يَجُوزُ ."

(تبين الحقائق:بيان شروط السلم)

"وذهب جمهور الفقهاء إلى وجوب تعيين مكان الإيفاء أيضا ، إن كان العقد بموضع لا يصلح للتسليم ، سواء أكان حالا أم مؤجلا أو يصلح للتسليم ، ولكن لحمله مئونة ، وهذا في المؤجل دون الحال .أما إذا كان المكان صالحا للإيفاء ، وليس في حمله مئونة ، فلا يجب تعلم مكان للإيفاء ، بل يتعين مكان العقد للتسليم عرفا بلا خلاف .وذهب أحمد وإسحاق ومحمد وأبو يوسف ، وهو قول مرجوح عندالشافعية إلى : عدموجوب تعيين مكان التسليم ، سواء أكان في حمله مئونة أم لا ، وسواء أكان مؤجلا أم حالا ؛ لأن مكان العقد هو الذي يتعين .وذهب جمهور الفقهاء إلى أنه لو عين المتعاقدان مكانا للتسليم غير مكان العقد تعين ."

(الموسوعۃ الفقهيۃ: فی البيع)

"اذا قال المشتري للبائع ابعث إلى ابني واستأجر البائع رجلا يحمله إلى ابنه فهذاليس بقبض والأجر على البائع إلا أن يقول استأجر علي من يحمله فقبض الأجير يكون قبض المشترى إن صدقه أنه استأجر ودفع إليه وإن أنكر استئجاره والدفع إليه فالقول قوله كذا في التتارخانية وفي مجموع النوازل لو اشترى وعاء هدبدمن قروي في السوق وأمره بنقله إلى حانوته فسقط في الطريق هلك على البائع وكذا لو اشترى وقر التبن أو الحطب في المصر فعلى البائع أن ينقله إلى بيته ولو هلك في الطريق."

(الفتاوى الهندية:الفصل الثانى فى تسليم المبيع وفيمايكون----)

"[تنبيه] من جهالة الأجل ما إذا باعه بألف على أن يؤدي إليه الثمن في بلد آخر،ولو قال: إلى شهر على أن يؤدي الثمن في بلد آخر جاز بألف إلى شهر، ويبطل الشرط؛لأن تعيين مكان الإيفاء فيما لا حمل له ولا مؤنة غير صحيح۔"

(الدرالمختار:مطلب فى الفرق بين الاثمان والمبيعات)

<u>سامان بھیجنے کے دوران نقصان پہنچنا:</u>

سامان بھیجنے کے دوران اگرسامان کو نقصان پہنچا،یاہلاک ہوگیا،تو اس کےتاوان میں تفصیل یوں ہے:اگربائع نے سامان بھیجااورہلاک ہوگیا،توتاوان بائع کا شمار ہوگااوراگرمشتری کسی کو بھیجا اورہلاک ہوگیاتوتاوان مشتری ہی کا سمجھا جائے گا۔

(تفصیل کے لیے فتاوی عثمانیہ: کتاب البیوع، ج۷، ص۱۱۴)

اگربائع نے مشتری کی ہدایات کے مطابق روانہ کی ہو،توہلاک ہونے کی صورت میں تاوان مشتری ہی کا ہوگا۔

(تفصیل کے لیے جامع الفتاوی: ج٦، ص۹)

<u>کیاآن لائن آرڈر دینا بیع ہے،یاوعدہ بیع ہے؟</u>

صحیح قول کے مطابق استصناع بیع ہے۔لہٰذااس پر بیع کے احکام جاری ہوں گے۔

(تفصیل کے لیے فتاوی قاسمیہ : باب الاستصناع ،ج۱۹، ص۶۰۹)

واللہ اعلم بالصواب ۔

السید کلیم اللہ الحرمزئی۔

- شرائط عرف
- عرف کی قسمیں
- عرف خاص کی حد
- کیا عرف خاص پر فتوی دیا جاسکتا ہے؟
- عرف کی ضرورت کہاں پڑتی ہے؟
- قاضی کا عرف پر فیصلہ
- عرف کا فیصل ہونا
- عرف عام اور ظاہر الروایہ میں تعارض
- عرف اور عمل
- عرف اور عادت
- عرف لفظی اور عرف فعلی
- المعروف کالمشروط پر ایک نظر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرف اور عادت کی شرائط،اقسام اور دیگر متعلقہ احکام کی وضاحت شریعت کی روشنی میں بیان کریں،اسی طرح "المعروف کالمشروط "کی وضاحت بھی مطلوب ہے،کہ کیاالمعروف اس وقت مشروط بنتاہے جب فریق کو قانونی جارہ جوئی،یاحکم کے فیصلہ کا حق حاصل ہو،یا اس کے بغیر بھی المعروف کالمشروط معتبر ہے،نیزیہ بھی بتائیں کہ کیاقاضی یاحکم (ثالث) عرف پر فیصلہ کرنے کااور یا مفتی عرف پر فتویٰ دینے کا پابند ہے؟

الجواب حامداومصلیا

شرائط عرف:

- ✓ عرف شریعت کے کسی بھی حکم کا مخالف نہ ہو۔
- ✓ عرف یاتوکلی طورپر جاری ہو،یاکم سے کم غالب ہو۔
- ✓ عرف مستقل ہو،عارضی نہ ہو۔
- ✓ عاقدین دوران عقد عرف کے خلاف وضاحت نہ کرے۔
- ✓ طبیعت سلیمہ اس کو قبول کرتی ہو۔

"الأول: أن لا يخالف العرف الشريعة ، فإن خالف العرف نصًّا شرعيًّا أو قاعدة من قواعد الشريعة فإنَّه عرف باطل.فالعرف الذي يُحلُّ الحرام ، ويحرِّم الحلال ، ويناقض الشريعة لا يجوز أن يصير العباد إليه ، وهو ليس من المعروف ، بل من المنكر الذي تجب محاربته مثل ما اعتاده الناس من أكل الربا والتبرج ومنكرات الأفراح والمآتم وعقودالمقامرة وحرمان النساء من الإرث في بعض البلاد وأخذ الرشوة ولبس الرجال الذهب والحرير.وقد سبق الحديث عن هذا النوع من العرف وهو الذي يسمِّيه الفقهاء بالعرف الفاسد أو العرف الباطل.الثاني: أن يكون العرف مطّردًا أو غالبًا ، ومعنى اطراده أن يكون العمل بالعرف مستمرًا في جميع الحوادث ، لا يتخلف في واحدة منها ، أو يكون غالبًا في أكثر الحوادث۔۔۔وقال ابن نجيم: "إنَّما تعتبر العادة إذا اطردت أو غلبت ، ولذا قالوا في البيع:لو باع بدراهم أو دنانير وكانا في بلد اختلفت فيه النقود مع الاختلاف في الماليةوالرواج انصرف البيع إلى الأغلب. قال في الهداية: "لأنَّه هو المتعارف ، فينصرف المطلق إليه".ومنها لو باع التاجر في السوق شيئًا بثمن ولم يصرِّحا بحلول ولا تأجيل ، وكان المتعارف فيما بينهم أن البائع يأخذ كلَّ جمعة قدرًا معلومًا انصرف إليه بلا بيان.

الثالث: أن يكون العرف المراد العمل به والسير وفقه موجودًا عند إنشاء التصرف. ومن هنا قال السيوطي: "العرف الذي تحمل عليه الألفاظ إنَّما هو المقارن السابق دون المتأخر .وقال ابن نجيم: العرف الذي تحمل عليه الألفاظ إنَّما هو المقارن السابق دون المتأخر ،ولذا قالوا: لا عبرة بالعرف الطارئ .

الرابع: أن لا يصرح المتعاقدان بخلافه فلو صرَّحا بخلافه فلا حكم للعرف ، فإذا كان العرف جاريًا على أن يدفع المستأجر الأجرة مقدمًا في أول كلِّ شهر فاتفقا على دفع أجرة لمنزل في آخر الشهر جاز.وفي هذا يقول العزُّ بن عبد السلام : "كلُّ ما يثبت في العرف إذا صرَّح المتعاقدان بخلافه بما يوافق مقصود العقد صحَّ."_

"الشروط التي يجب توفرها في العرف الذي يحتجُّ بهاشترط علماؤنا في العرف الذي يعتبر شرعًا عدَّة شروط:الأول: أن لا يخالف العرف الشريعة ، فإن خالف العرف نصًّا شرعيًّا أو قاعدة من قواعد الشريعة فإنَّه عرف باطل.الثاني: أن يكون العرف مطّردًا أو غالبًا ، ومعنى اطراده أن يكون العمل بالعرف مستمرًا في جميع الحوادث ، لا يتخلف في واحدة منها ، أو يكون غالبًا في أكثر الحوادث.ولذا قالوا في البيع: لو باع بدراهم أو دنانير وكانا في بلد اختلفت فيه النقود مع الاختلاف في المالية والرواج انصرف البيع إلى الأغلب. قال في الهداية: "لأنَّه هو المتعارف ، فينصرف المطلق إليه".قالوا: لأنَّ المعروف كالمشروط"

(مجلة مجمع فقه الاسلامی:العرف بين الفقه:ج۲ص۱۱۱۳٦)

عرف کی قسمیں:

عرف کی دو قسمیں ہیں : عام: وہ عرف جو اکثر شہروں میں اکثر لوگوں میں شائع اور منتشر ہو۔

"وينقسم العرف القولي والعملي إلى عام وخاص.فالعرف العام هو الذي يكون عامًا فاشيًا في جميع البلاد الإسلامية بين غالب الناس في أي أمر من الأمور وقد عرفه ابن عابدين بقوله: هو ما تعارفه عامة أهل البلد سواء كان قديمًا أو حديثا ، وعرفه ابن فرحون بقوله غلبة معنى من المعاني على جميع البلاد.وهذا النوع من العرف ينتظم كثيرًا من الظواهر الاجتماعية المنتشرة في العالم كالاستصناع ، فإن الناس محتاجون إليه في كل زمان لايخلو يوم من التعامل به في كل مكان حتى أصبح جاريًا في كل الحاجيات كالبيع بالمعاطاة وتأجيل جانب من المهر ونكاح التعويض في بعض الجهات وتقسيم الصداق إلى معجل ومؤجل واعتبار الأدوات الضرورية للسيارات والدراجات ، وكألفاظ تعارف الناس على أنها لإزالة العصمة في المنكوحات وتحديد الركاب في الطيارات واستهلاك الماء المجهول في الحمامات واعتباروضع اليد دليلًا على الملكية في الحيازات إلى غيرها مما لا يحد ولا يحصى كثرة مما هومعلوم لدى الخاصة والعامة."

عرف خاص:

عرف خاص: جو کسی خاص شہر، یا کسی خاص جماعت کی حد تک مشہور ہو۔

"وبخلافه العرف الخاص ، ببلد أو فرقة أو جماعة أو من فئة من أهل الاختصاصات ،فهذا العرف متنوع متعدد لا تحصى صوره لأن مصالح الناس واحتياجاتهم وعلاقاتهم متجددة متنوعة حسب نوع الاختصاص ، فللتجار أعرافهم وللمحامين أعرافهم وللأطباء أعرافهم وهكذا فيما هو عيب مما ليس بعيب عند التجار وتقدير الأجور عند المحامين والعدول وتعليقها على نجاح الأمور ، ومعلوم توصيل الركاب ونقلهم من محطة إلى محطة ومن جهة إلى جهة وتعارف التقسيط في نوع من البيوع وتأجير الغرف في السناد وألفاظ الواقفين وعباراتهم والوصايا والأيمان وما إليها ، كل هذا من قبيل العرف الخاص."

(مذکورہ بالاماخذ)

کیا عرف خاص پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے؟

عرف خاص کے بارے میں اختلاف ہے ،علامہ شامیؒ اورابن نجیمؒ کے ہاں عرف خاص معتبر نہیں ہے۔تاہم حنفیہّ کی بڑی تعداد عرف خاص کو معتبر مانتی ہے۔چنانچہ شیخ تقی الدینؒ اور شیخ ابوسعودؒ نے قاہرہ کے عرف کو دیکھتے ہوئے پگڑی کو جائز قرار دیا ہے، فقہاء حنابلہ نے جانوروں کی بٹائی کی اجازت دی ہے۔۔۔لہٰذا جب کسی علاقہ یا پیشہ کے لوگوں کے لیے مشقت پیدا ہو سکتی ہو، تو وہاں عرف خاص پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔

(تفصیل کے لیے قاموس الفقہ : ج ۴، ص ۳۸۴)

قواعد در بابت عرف:

العادة محكمة ....استعمال الناس حجة يجب العمل بها .....الحقيقة تترك بدلالة العادة ....العرف في الشرع له اعتبار.... التعيين بالعرف كالتعيين بالنص .... المعروف عرفًا كالمشروط شرطًا .... استعمال الناس حجة يجب العمل بها ....الممتنع عادة كالممتنع حقيقة.... الحقيقة تترك بدلالة العادة....المعروف بين التجار كالمشروط بينهم ....التعيين بالعرف كالتعيين بالنص .مبنى الايمان على العرف.

عرف کی ضرورت کہاں پڑتی ہے؟

ہر وہ چیز جس کی تعین نہ شریعت میں ہو اور نہ ہی لغت میں ہو وہاں رجوع عرف کی طرف کیا جائے گا۔۔۔یا ہر وہ شئے جس کا ذکر شریعت میں مطلق ذکر ہو اور اس کے لیے باقاعدہ کوئی ضابطہ مقرر نہ ہو، وہاں عرف کی طرف رجوع ہوگا۔

’’تفسير النصوص التي وردت مطلقة ولم يرد في الشرع ولا في اللغة ما يفسّرها ، يقول شيخ الإسلام ابن تيمية في هذا: "كل اسم ليس له حدٌّ في اللغة ولا في الشرع فالمرجع فيه إلى العرف"ويقول السيوطي: "قال الفقهاء: ما ورد به الشرع مطلقًا ، ولا ضابط له فيه ، ولا في الذمَّة يُرْجع فيه إلى العرف"وقال الزركشي: "العادة تُحَكَّم فيما لا ضبط له شرعًا"

یا عرف کی ضرورت وہاں پڑتی ہے، جہاں شریعت کا حکم ہو اور نہ ہی ممانعت ہو۔

" الأحكام التي لم تأمر بها الشريعة ولم تنه عنها ، وهذا النوع ليس للشريعة غرض في فعلها على نحو معيَّن ، وإنَّما المراد فعلها على أي وجه كان هذا الفعل ، وهذا يختلف باختلاف عوائد الناس وعرفهم.أما مجال العرف عند الأمم التي لا تحكَّم الشريعة الإسلامية ، فقد سبق القول بأنَّ العرف كان بمثابة القانون والدستور عند الأمم قبل تدوين قوانينها ، فلما دونت القوانين بقى العرف مصدرًا رسميًّا للقواعد القانونية في مختلف فروع القانون ، كما جعل العرف مصدرًا احتياطيًّا في كثير من القوانين يلجأ إليه القاضي في المسائل التي لا يجد فيها نصًّا في القانون.ومن هنا ، فإن القانونيين يصرَّحون بأنَّ العرف لا يستطيع إلغاء أو مخالفة نصوص القانون الآمرة ، ولكنهم أعطوه الحقَّ في مخالفة النصوص المفسَّرة أو المكملة لإرادة المتعاقدين دون إلغائها......وقد سبق القول بأنَّ الشريعة الإسلامية تأبى كلَّ الإباء بأن تُسَاوى بقوانين البشر وعرفهم فضلًا عن أن تقدم عليها هذه القوانين والأعراف.....ويقول أيضًا: "اعتبار العادة والعرف رُجِع إليه في مسائل كثيرة ، حتى جعلوا ذلك أصلًا فقالوا في الأصول في باب "ما تترك به الحقيقة: " تترك الحقيقة بدلالة الاستعمال والعادة ، هكذا ذكر فَخر الإسلام ، وفي "شرح في الأشباه" للبيرمي ، قال: الثابت بالعرف ثابت بدليل شرعي . وفي المبسوط: الثابت بالعرف كالثابت بالنصّ "وقال القرافي : "كلُّ من له عرف سيحمل كلامه على عرفه"

قاضی کا عرف کے مطابق فیصلہ

جہاں نص شرعی نہ ہو، یا عرف شریعت کا مخالف نہ ہو، وہاں قاضی کا عرف کے مطابق فیصلہ ہوگا۔

"ولقد سُئِل مالك عن النكاح يلزمه أهل المرأة هدية العرس وجل الناس تعمل به حتى إنه لتكون الخصومة ، أترى أن يقضى به ؟ قال: إذا كان ذلك قد عرف من شأنهم وهو عملهم لم أرَ أن يطرح ذلك عنهم إلا أن يتقدم فيه السلطان لأني أراه أمرًا قد جروا عليه ------

عرف کا فیصل ہونا

فریقین کا باہمی اختلاف عرف کی روشنی میں دفع کیاجائے گا۔

"ومن هذا القبيل مسألة من أعطى ولده لصانع قصد تعليمه صنعة دون أن يشترط أحدهما أجرة على الآخر وبعد تعلم الصبي ، أو طالب أحدهما الأجر من الآخر فإنه يرجع إلى ما جرى به العرف والعادة فإن شهد العرف للصانع حكم له بأجرة المثل لذلك التعليم وإن كانت الأجرة عادة للصبي لزم الصانع دفعها له ، فإن جرى العرفأن لا أجرة لأحدهما على الآخر حتى ساعة تحصيل الصنعة وقص الشعر وإصلاحه فلا شيء لأحدهما على الآخر ---"

ظاہر الروایۃ اور عرف:

یہ ضروری نہیں ہے، کہ ظاہر الروایہ کی ترجیح عرف پر ہوگی ،بلکہ مفتی یا قاضی کے لیے ضروری ہے ،کہ عرف کو مد نظر رکھ کر فتویٰ یا فیصلہ صادر کرے۔

چنانچہ علامہ شامیؒ رقمطراز ہے:

قال رحمه الله تعالى: "قال في القنية": ليس للمفتي ولا للقاضي أن يحكما على ظاهر المذهب ويتركا العرف ، ونقل المسألة عنه في "خزانة الروايات" كما ذكره البيرمي في "شرح الأشباه"------.

وقال: "ليس للمفتي الجمود على المنقول في كتب ظاهر الرواية من غير مراعاة الزمان وأهله ، وألاّ يُضيَّع حقوقًا كثيرة ، ويكون ضرره أعظم من نفعه" .وقال: "النقول ونحوها دالّة على اعتبار العرف الخاص ، وإن خالف المنصوص عليه في كتب المذهب ما لم يخالف النصَّ الشرعيَّ" .

وقال: "العرف يَثْبُتُ على أهله عامًّا أو خاصًّا ، فالعرف العامُّ في سائر البلاد يَثْبُتُ حكمه على أهل سائر البلاد ، والخاصُّ في بلدة واحدة يَثْبُتُ حكمه على تلك البلدة فقط".وقال أيضًا: "المفتي لا بدَّ له من ضرب اجتهاد ومعرفة بأحوال الناس".وقال: "من لم يكن عالمًا بأهل زمانه فهو جاهل".وقال: "اعلم أن المتأخرين الذين خالفوا المنصوص في كتب المذهب في المسائل السابقة لم يخالفون إلاَّ لتغيّر الزمان والعرف ، وعلمهم أن صاحب المذهب لو كان في زمنهم لقال بما قالوه".ونقل عن بعض علماء الحنفية قوله: من لم يكن عالمًا بأهل زمانه فهوجاهل" .

العرف والعمل:

بسااوقات عرف کی جگہ عمل کا لفظ مستعمل ہوتاہے ،جب کہ بعض اوقات برعکس ہوتاہے،اس حوالے سے یہ بات ذہن میں رہے، کہ یہ دونوں مترادف ہیں۔

"ويعتبر العرف والعمل أمرًا واحدًا ، ثم انتقد هذا الرأي مبينًا أن العلماء حين يقولون: هذا هو العمل ، أو: على هذا جرى العمل ، فإنما يعنون أن هذا الحكم قال به الفقهاء ، ثم استقرت عليه أحكام القضاء وحين يقولون هذا هو المتعارف ، أو: بهذا جرت العادة ، فإنما يعنون أن هذا هو ما جرى عليه العمل عند عامة الناس ، من غير أن يستند إلى رأي فقهي أو أن يطابق أحكام القضاء

عرف اور عادت کے درمیان فرق:

بعض علماء عرف اور عادت کے درمیان یوں فرق کرتے ہیں : دونوں میں نسبت عموم وخصوص مطلق کی ہے بایں صورت کہ عرف لازمی ہے ، قاضی یا حکم کے لیے عرف پر فیصلہ کرنالازمی ہے،جب کہ عادت شہرت میں عرف سے کم ہے اورنہ ہی عادت سے قاضی فیصلہ کرنے کا پابندہے ،جب کہ بعض فقہاء کے نزدیک نسبت عموم وخصوص من وجہ کی ہے ، لیکن صحیح قول کے مطابق عادت اور عرف میں نسبت ترادف کی ہے اور دونوں ایک ہی شئے ہیں۔

عرف لفظی وفعلی کا اعتبار:

عرف لفظی اور لغت میں تعارض ہو، تو عرف کو ترجیح ہو گی۔

الأيمان مبنية على العرف لاعلى الحقائق اللغوية۔اسی طرح اگرعرف اور شریعت کی تعبیر میں تعارض ہو، عرفی معنی کو ترجیح ہو گی۔ جیسے : کسی شخص نے گوشت نہ کھانے کی قسم کھائی ہو، تو مچھلی شامل نہ ہو گی جب کہ قرآن میں مچھلی پر گوشت کا اطلاق کیاگیاہے۔اسی طرح عرف فعلی سے بھی فقہاء کے ہاں احکام کی تبدیل متفق علیہ ہے۔کسی عمل کے بارے میں عادت اور رواج کو عرف عملی یا فعلی کہاجاتاہے۔ جیسے : بیع تعاطی وغیرہ۔

(تفصیل کے لیے قاموس الفقہ :ج ۴)

"المعروف کالمشروط" کی تفصیل :"

المعروف کالمشروط " سے مراد کسی عمل کااس طرح عام ہونا کہ علاقے میں مشہور ہو، اگراس کو ذکر نہ بھی کیاجائے، تب بھی اس کا ذکر کیاجانا مراد ہو۔اورفریقین کے ہاں بھی اس کا ذکر کیاجانا مقصود ہواورحاکم وقت بھی اس کو مذکور سمجھ کر فیصلہ دائر کردےاورزیر عمل نہ ہونے پر فریقین کو قانونی چارہ جوئی بھی حاصل ہو۔

"ولكن التعبير الصحيح الذي يجمع عليه الفقه (doctrine) أن لفظ العرف يطلق على القاعدة القانونية الملزمة وأن لفظ العادة يطلق على القاعدة التي لم ترق إلى مرتبة العرف لافتقارها إلى عنصر الإلزام في الدرجة التي يتضمنها العرف..."

(مجلة الفقه الاسلامى:العرف بين الفقه والتطبيق---)

"أن العرف يلزم الطرفين ولو كانا يجهلانه بخلاف العادة فإنها لا تلزمها إلا إذاقصدا الإحالة عليها صراحة أو دلالة.من يريد التمسك بالعادة فعليه أن يثبتها ،أما العرف فلا محل لإثباته لأن معرفة العرف كمعرفة القانون المفروض من مهمة الحاكم.للحكام أن يراعي العرف رأسًا ، بخلاف العادة فإنه يجب على صاحب القضية أن يتمسك بها.أن العرف يجب على الحاكم مراعاته حتما ، وإلا تعرض حكمه لرقابة من طرف سلطة أعلى منه ، بخلاف العادة التي لا تخرج عن أن تكون واقعة يكيف الحاكم معها ، ولا تثير لديه أكبر اهتمام .....ومن المعلومِ أنَّ المعروفَ كالمشروطِ كما حقَّقَهُ صاحبُ (الأشباهِ)، وفَرَعَ عليه فروعاً كثيرةً، فكما أن المشروطَ حقيقةً يتضمنُ الرِّبا، كذلك المشروطُ حكماً من أفرادِ الرِّبا، فإن لم يكنْ ربا حقيقةً فلا أقلَ من أن يكونَ فيه شبهةَ الرِّبا.وصورةِ الإذنِ الغيرِ المشروطِ أن لا يَشْتَرِطَ المُرْتَهِنُ ذلك في نفسِ العقدِ، ولا يَدفَعُ الدَّينَ

بهذا الشَّرطِ، ولا ينوي أيضاً بدفعِ الدَّينِ إباحتَهُ، وأنَّهُ لولاه لَمَا دَفَعَ بل قَصَدَمُجرَدَ الحَبْسِ والتَّوثقِ، وهذا لا شُبْهَةَ في جوازِهِ؛ فإنَّه ليس فيه رباً ولا شُبْهَةَالرِّبا، فإن كان الانتفاعُ في هذه الصورةِ مُورِثاً إلى شيءٍ فليس إلا هو شُبْهَةُ شُبْهَةِ الرِّبا، وهي غيرُ معتبرةٍ.

(الفلک المشحون فیمایتعلق بانتفاع المرتھن:فی ذکراقوالنا:ج ۱،ص ۳۷)

واضح رہے: دارالعلوم کراچی کے فتوی میں دی گئی درج ذیل عبارت سے بھی انہوں نے المعروف کالمشروط کے لیے شرط کی شہرت کا حکم لگایا ہے۔یعنی کہ شرط اس قدر معروف ہو، کہ ذکر کیے بغیر بھی ان کو ذکر کیا جانا معتبر جانا جاتا ہو۔

"العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرط المبحث الثالث:العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرط ؟قال في إجارة الظهيرية : والمعروف عرفا كالمشروط شرعا انتهى وقالوا في الإجارات : لو دفع ثوبا إلى خياط ليخيطه له أو إلى صباغ ليصبغه له ولم يعين له أجرة ثم اختلفا في الأجر وعدمه وقد جرت العادة بالعمل بالأجرة : فهل ينزل منزلة شرط الأجرة فيه اختلاف قال الإمام الأعظم : لا أجرة له وقال أبو يوسفرحمه الله : إن كان الصابغ حريفا له أي معاملا له فله الأجر وإلا لا وقال محمد رحمه الله : إن كان الصابغ معروفا بهذه الصنعة بالأجر وقيام حاله بها : كان القول قوله وإلا : فلا اعتبارا للظاهر المعتاد وقال الزيلعي : والفتوى على قول محمد رحمه الله انتهى -ولا خصوصية لصابغ بل كل صانع نصب نفسه للعمل بأجرة فإن السكوت كالاشتراط۔۔"

(الاشباہ والنظائر:العادة المطردة هل تنزل منزلة الشرط)

مذکورہ بالاعبارت میں فتوی امام محمدؒ کے قول پر دیا گیا ہے،وجہ شہرت ہے کہ اگر رنگ ساز اپنے فن میں مشہور اور تا حال اسی پیشہ سے وابستہ ہو تو انہی کا قول معتبر ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- ❖ کمرشل ایریا میں صرف اوپر فلیٹ پر مسجد بنانا
- ❖ مسجد کے تہہ خانہ میں کار پارکنگ وغیرہ بنانا
- ❖ شرعی مسجد کی تعریف
- ❖ فنائے مسجد کا مطلب
- ❖ مسجد کے صحن میں گزرگاہ سے اتصال صف
- ❖ گرمیوں کے موسم میں معتکف کا مسجد سے الگ صحن میں سونا
- ❖ مہاجر کیمپ میں مسجد کی تعمیر
- ❖ مہاجر کیمپ میں مدرسہ کے لیے زمین وقف کرنا
- ❖ کثرت جماعت کی وجہ سے اول وقت پر استحباب کا فتوی

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

کیافرماتے ہیں مفتیان کرام مندرجہ ذیل کے بارے میں :

1 بڑے شہروں میں گنجان آبادی ' یا مہنگی زمینوں کی وجہ سے لوگ مارکیٹ ' یاپلازہ کی بالائی حصہ پر مسجدیں بناتے ہیں ' عام طور نیچے دکانیں فروخت کی جاتی ہیں اور یا کرایہ پر دی جاتی ہیں ' اب پوچھنا یہ ہے :

کیا یہ شرعی مسجدیں ہیں 'ان میں وقف کا اعتبار ہے اور یا یہ جائے نماز کے حکم میں ہیں؟

بالائی حصہ پر مسجد ہو ' یازیریں حصہ پر مسجد ہو 'اوپر دکانیں ہوں۔دونوں کے حکم میں کوئی فرق ہے؟ اور یہاں اعتکاف کا کیا حکم ہے؟ کیاجائے نماز میں داخل ہونے ' یانکلنے کی دعا بھی شرعی مسجد کی طرح مسنون ہے 'اور وہاں اعتکاف کی نیت سے بیٹھنے پر مسنون اعتکاف کا ثواب ملتا ہے؟

2 سرکاری زمین (مہاجر کیمپ) پر مبنی مسجد کا کیا حکم ہے ؟اوراس پر تعمیر شدہ مدرسہ کی خرید وفروخت کا کیا حکم ہے؟

نیز مسجد کے صحن سے کچھ فاصلے پر مسجد ہی کے احاطہ میں زمین ہے 'البتہ درمیان میں آر پار چھوٹی سی گزرگاہ ہے 'کیا یہاں صفیں کھڑی کی جاسکتی ہیں ' یا معتکف وہاں جاسکتا ہے اور اگر یہ زمین وقف کی نہ ہو 'تو اتصال صف پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟

3 بعض جگہوں میں کثرت جماعت کی وجہ سے گرمیوں اور سردیوں دونوں میں ظہر کی نماز اول وقت میں آدا کی جاتی ہے اور یا رمضان المبارک میں فجر کی نماز لوگوں کی کثرت کی وجہ سے اول وقت میں آدا کی جاتی ہے۔اب پوچھنا یہ ہے :

کہ احناف کے ہاں صبح کی نماز میں اسفار ' یا گرمیوں میں ظہر کی نماز میں تاخیر مستحب ہے 'کیا کثرت جماعت کی وجہ سے اول وقت میں احناف کے ہاں استحباب کا فتویٰ دیا جاسکتا ہے؟

الجواب حامداومصليا

دنیامیں مختلف ادیان ہیں ہر ایک میں کچھ چیزیں مقدس سمجھی جاتی ہیں ' یہ الگ بات ہے 'کہ دین اسلام عین فطرت ہے اس میں اعتدال ہے 'یہ ایک کائناتی اور عالمگیر دین ہے ' یہاں ہر ایک کا حق محفوظ ہے انسان ہو 'حیوان ہو 'چرند ہو اور یا پرند۔۔۔۔۔دین ومذہب سے انسان کا رشتہ خونی ہے 'اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی خمیر میں مٹی ہے 'سیدنا حضرت

آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی تخلیق مختلف قسم کی مٹی (سرخ ، سفید اور سیاہ) سے ہوئی ہے ،جو مختلف طبیعتوں ،مزاجوں اور رنگ و نسل کی غمازی کرتا ہے۔

انسان کی ترکیب روح اور مادہ سے ہے ، دونوں کی ضرورتیں جداجدا ہیں ،ہر ایک کے تقاضے پورے کرنا فطرت ہے ،روح کا تعلق عالم بالا سے ہے ،اس کی غذا میں کثرت عبادت ، تعلق مع اللہ ،قرب ایزدی اور خوف الٰہی وغیرہ شامل ہیں اسی قوت سے انسان فرشتہ صفت بنتا ہے۔جب کہ مادہ کا تعلق عالم عنصریات سے ہے ،عناصر اربعہ (آگ ،مٹی ،ہوا ،پانی) سے قدرت لم یزل کی طرف سے غذا فراہم ہوتی ہے۔بظاہر یہی لگتا ہے کہ ان دونوں اجزا میں کوئی جوڑ نہیں ہے جیسا کہ کہا گیا ہے :

چہ نسبت عالم خاک را با عالم پاک

قانون یہ ہے کہ بے جوڑ مرکب ہونے والی چیزوں میں ایک واسطہ کی ضرورت ہے ورنہ دونوں جز دھرے کے دھرے رہ جائیں گے ، یہاں روح اور مادہ میں دین اسلام کا ربط اور واسطہ کارفرما ہے۔رب لم یزل کا فرمان ہے :

(ان الدین عنداللہ الاسلام ----)

بیشک دین اللہ کے ہاں اسلام ہی ہے۔

اسی اسلام کے رشتہ سے ماں باپ کا احترام ،بڑوں کی عزت چھوٹوں پر شفقت ،ہمسایہ کے حقوق ، باہمی رہن سہن کے اصول برقرار ہیں ،راہبر رشد وہدایت غم خوار امت ،سرور کونین ﷺ کے وہ فرمودات روزروشن کی طرح عیاں ہیں ،کبھی آقائے دوعالم ﷺ فرماتے ہیں : وہ ایماندار نہیں جو امانت کا پاس نہ رکھے ،کبھی فرماتے ہیں : جو چھوٹوں پر شفقت نہ کرے ،بڑوں پر رحم نہ کرے اور نیکی کا حکم اور برائی سے منع نہ کرے ، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔جی ہاں !-----کبھی یوں اعلان فرماتے ہیں : رشتہ جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو اچھائی کرنے والے کے ساتھ اچھائی اور احسان کرے بلکہ ناتہ جوڑنے والا وہ جس کے ساتھ قطع رحمی کی جائے وہ صلہ رحمی کرے۔(مفہوم) جہاں یہ رشتہ اور ناتہ نہ ہو ، وہاں ماں باپ عمر رسیدہ ہسپتالوں (Old age center) میں داخل کیے جاتے ہیں ، وہاں ہوس اور خواہشات پر مبنی مگر غیر پرسکون زندگی گزاری جاتی ہے۔اسی رشتہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لیے رب لم یزل نے انبیا علیہم السلام کی بعثت فرمائی ،آسمانی کتابیں ،شرعی مقدسات سے اس کو آہنی دیوار کا سہارا دیا۔

تخلیق انسانیت کا مقصد رب کریم کی وحدانیت ،عبادت اور اطاعت کو تسلیم کرنا ہے ،خود قرآن کریم بزبان حال گویا ہے ،کہ انسان عبادت اور معرفت کے لیے پیدا کیا گیا ہے ،اسی مقصد کے فروغ میں مسجدوں ،مدرسوں اور خانقاہوں وغیرہ کا کلیدی

کردار ہیں،علمی مجلسیں اوریاذکرکی محفلیں اسی بات کا شاہ خسانہ ہیں 'یہاں مذہب کی تعلیم 'دین اسلام سے مضبوطی کا رشتہ 'اسلامی اقدار کادرس دیاجاتاہے 'یہاں آخروی زندگی میں سروخروئی حاصل کرنے کے لیے دنیامیں رہنے کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔گویاکہ مسجد(اوراب مدرسہ 'خانقاہ وغیرہ) مرکزجاودانی وکامرانی ہے۔

قصہ مختصرمذہبی ادارے انسان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانندہیں 'ان کی بقاناگزیرہےورنہ زندگی ادھوری ہے۔ذیل میں مساجد کے متعلق کچھ شرعی مسائل لکھے جاتے ہیں:

مسجد چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہے 'خالق کی ملک میں بندہ کاشتراک درست نہیں ہے۔اس لیےاگرمسجد کے لیے زمیں وقف ہوچکی ہواوراسمیں مسجد کی تعمیر بھی ہوگئی ہو 'توپھراس کے اوپریانیچے دکانیں بنانااپنی ذاتی ملک کی بنیادپرکسی طرح درست نہیں ہے اورنہ ہی نیچے تہہ خانہ 'پارک اوریادکانیں بننے کی اجازت ہے۔اورمسجدکی مصالح کی خاطر بھی شرعاجائزنہیں ہے۔اوراگرتعمیرنہ ہوئی ہو 'توپھرمسجدہی کی مصلحت کے لیے نیچے دکانیں بنانا اوریااوپرامام کاکمرہ وغیرہ بنانادرست ہے 'البتہ پھربھی بہتریہی ہے 'کہ دکانیں 'پارک وغیرہ فنائے مسجد(مسجد کی حدوداربعہ سے باہر) کے حصہ میں تعمیرکیے جائے۔

<u>یادرہے:</u>

<u>یہ دکانیں کرایہ پردی جاسکتی ہیں اوراس کاکرایہ مصالح مسجدمیں خرچ کیاجاسکتاہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ تعمیرمسجد سے قبل یہ تاحال شرعی مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔</u>

اوراگروقف کی زمین نہ ہو 'بلکہ کسی کی ذاتی زمین ہو 'توپھرمسجدچاہے اوپرہو 'یانیچے ہو 'عرفی مسجد ہوگی 'شرعی مسجد نہ کہلائے گی 'یعنی وہاں شرعی مسجد کے احکام لاگونہ ہوں گے۔(مثلا: وقف 'اعتکاف کے احکام وغیرہ)

لمافی ''البحرالرائق'':

''قوله (ومن جعل مسجدا تحته سرداب أو فوقه بيت وجعل بابه إلى الطريق وعزله أو اتخذ وسط داره مسجدا وأذن للناس بالدخول فله بيعه ويورث عنه) لأنه لم يخلص لله تعالى لبقاء حق العبد متعلقا به والسرداب بيت يتخذ تحت الأرض لغرض تبريد الماء وغيره كذا في فتح القدير. وفي المصباح السرداب المكان الضيق يدخل فيه والجمع سراديب اه وحاصله إن شرط كونه مسجدا أن يكون سفله وعلوه مسجدا لينقطع حق العبد عنه لقوله تعالى { وأن المساجد لله ---} بخلاف ما إذا كان السرداب أو العلو موقوفا لمصالح المسجد فإنه يجوز إذ لا ملك فيه لأحد بل هو من تتميم مصالح المسجد فهو كسرداب مسجد بيت المقدس ,هذا هو ظاهر المذهب ------ وبما ذكرناه علم أنه لو بنى بيتا على سطح المسجد لسكنى الإمام فإنه لا يضر في كونه مسجدا لأنه من المصالح -----''

(كتاب الوقف،ج۵،ص۳۱۶ط:رشيديه)

''محمد عن يعقوب عن ابي حنيفة (رضي الله عنهم) في رجل جعل بيته مسجدا وتحته سرداب او فوقه بيت وجعل باب المسجد إلى الطريق وعزله فله ان يبيعه وان مات ورث عنه وكذلك ان اتخذ وسط داره مسجدا وأذن للناس بالصلاة فيه ----- قوله فله ان يبيعه لانه لم يخلص لله (تعالى) فلا يصير مسجدا فلا يثبت احكامه ولو كان السرداب لمصالح المسجد صح كما هو في مسجد بيت المقدس ---''

(الجامع الصغير،باب فی حکم المسجد،ج ۱،ص ۱۲۰)

''بيت فوقه بيت وهو متصل بالمسجد يتصل صف المسجد نصف البيت الأسفل ويصلي في البيت الأسفل في الصيف والشتاء، اختلف أهل المسجد وأرباب البيت الذي يسكنون العلو قال الأرباب: إن ذلك ميراث لنا فالقول قولهم؛ لأن العلو في أيديهم والقول قول صاحب اليد فثبت بقولهم أن العلو ملك لهم لا يصير السفل مسجدا؛ لأنه لا يتحقق الشرط وهو الخلوص ----''

(المحيط البرهانی :ج ۱۲،ص ۶۳)

''امالو تمت المسجدیۃ ،ثم اراد البنامنع۔''

(الدرالمختار:کتاب الوقف)

یادرہے :

مذکورہ بالامسئلہ جمہور فقہا کے مطابق ہےاور خاص کرصاحب بحرالرائق نے ہدایہ کی روایت کو ضعف پر حمل کیاہے'البتہ دورحاضر کی زرپرستی نے لوگوں کو مسجد سے کوسوں دور کیاہے'مہنگی زمینوں،اور گنجان آبادی کی وجہ سے بہت سے لوگ مکمل زمین کو مسجد کے لیے وقف نہیں کرتے ہیں خاص کرکمرشل ایریامیں اورزیادہ ہوس اورجمع پونجی کی شدت ہے۔اس لیےایسی حالت میں بوقت ضرورت صاحب ہدایہ کے قول پر فتویٰ دیاجائے 'توبہتر ہوگا۔

''وروی الحسن انہ قال:اذاجعل السفل مسجدا وعلی ظھرہ مسکن فھو مسجد؛لان المسجد ممایتابد وذلک یتحقق فی السفل دون العلو،وعن محمدؒ علی عکس ھذالان المسجدمعظم ،واذاکان فوقہ مسکن اومستغل یتعذر تعظیمہ ،وعن ابی یوسفؒ انہ جوزفی الوجھین حین قدم بغداد ورای ضیق المنازل ،فکانہ اعتبر الضرورۃ ،وعن محمدؒ انہ حین دخل الری اجازذلک کلہ۔''

(الھدایۃ:ج۲،ص ۶۲۵)

فتاوی عثمانی میں بھی اسی پر فتوی دیاگیاہے۔

(کتاب الوقف : ج۲'ص ۵۱۹)

- اورجواز کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے'کہ تقریبااس پراکثر فتاوی کا اتفاق ہے'کہ تعمیر مسجد سے قبل مسجد کے تہہ خانہ میں پارکنگ وغیرہ اوریا مسجد کے فائدہ کی خاطر نیچے دکانیں بنانے کی گنجائش ہے۔اب جب شرعی مسجد کی حدوداربعہ متعین ہوگئیں'مگرپھر بھی دکان وغیرہ کی اجازت دی جاتی ہے'جس سے یہ نتیجہ اخذ کیاجاسکتاہے'کہ مصلحت اورضرورت کی پیش نظر حکم میں تبدیلی ہوسکتی ہے۔
- اسی طرح شدید عذر کی بناپر جب نماز پڑھنے والے باقی نہ رہیں'مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا'اس کاسامان اورملبہ لے جانے کی گنجائش ہے۔

وفی جامع الفتاوی:لھم تحویل المسجد الی مکان آخر ان یترکوہ بحیث لایصلی فیہ۔

(ردالمحتار:ج۳،ص ۵۱۲)

ماخوذ از فتاوی عثمانی : ج ۲،ص ۵۱۶)

لہٰذا مسئولہ صورت کے مطابق :

❖ بڑے شہروں میں گنجان آبادی، یا مہنگی زمینوں کی وجہ سے لوگ مارکیٹ، یا پلازہ کی بالائی حصہ پر مسجدیں بناتے ہیں، عام طور نیچے دکانیں فروخت کی جاتی ہیں اور یا کرایہ پر دی جاتی ہیں، اس مسئلہ میں مخیّر حضرات کو ترغیب دی جائے کہ اوپر، نیچے مکمل حصہ مسجد کے لیے وقف کریں، بصورت ضرورت صرف بالائی حصہ یا صرف زیریں حصہ وقف کرنا درست ہے اور یہ شرعی مسجد ہو گی، یہاں مسنون اعتکاف درست ہے۔

مسئلہ اتصال صف و اعتکاف :

باجماعت نماز میں صفوں کا اتصال لازمی ہے، امام اور مقتدی کے لیے اتحاد مکان ضروری ہے، خواہ یہ اتحاد حقیقتاً ہو اور یا حکما ہو۔ اگر اتحاد پایا جائے، تو صفوں میں خالی جگہ کے باوجود بھی نماز درست ہو جائے گی، البتہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے، مکروہ ہے۔

کره كقيامه فی صف خلف صف فيه فرجة ،قلت :وبالكراهة ايضا صرح الشافعية۔

(الفتاوی الشامية)

اور بغیر ضرورت کے مکروہ تحریمی ہے۔

حکما اتحاد مکان سے مراد :

مسجد صغیر، مسجد کبیر، صحن مسجد، فنائے مسجد، عیدگاہ، مصلی ۔جب کہ جنازہ گاہ میں اختلاف ہے، تاہم اکثر مشائخ نے اس کو مصلی (جائے نماز) کے حکم میں داخل کیا ہے۔

''والمسجدوان كبرلايمنع الفاصل فيہ كذافی الوجيز للكردری۔''

''ولواقتدی بالامام فی اقصی المسجد والامام فی المحراب فانہ يجوزكذا فی شرح الطحاوی۔''

(الفتاوی الهندية:ج۱،ص ۸۸ط:دارالفكر)

''ويمنع من الاقتداء--(طريق تجری فيہ عجلة)آلة يجرها الثور(او نهرتجری فيہ السفن)ولوزرقا ولوفی المسجد(اوخلاء)ای فضا ء (فی الصحرا ء)او فی مسجدكبير جدا كمسجد القدس (يسع صفين) فاكثر الااذا اتصلت الصفوف فيصح مطلقا ----(والحائل لايمنع)الاقتدا ء (ان لم يشتبہ حال امامہ)بسماع او رؤية والمسجد وان كبرلايمنع الفاصل ---''

(الشامية:ج ۱،ص ۵۸۵،ط:دارالفكر)

اس کے علاوہ صحرا ہو، عام میدان ہو، جلسہ گاہ ہو اور یا اجتماع گاہ ہو۔ یہاں دو صفوں کی جگہ (8فٹ) چھوڑنے سے اتصال صف نہ ہو گی اور نماز جاتی رہے گی۔

اتنے فاصلہ پر کھڑا رہنا ضروری ہے' جس میں گھوڑا گاڑی وغیرہ نہ گزر سکے' باالفاظ دیگر دوصفوں کا فاصلہ یا آٹھ فٹ فاصلہ امام اور مقتدی کے درمیان 'یادرمیانی صفوں کے درمیان نماز کے لیے مانع ہے۔اس کے کم فاصلہ سے اتصال ختم نہیں ہوتاہے' چاہے وہ حصہ فنائے مسجد ہواور یااس سے متصل کسی کی ذاتی زمین ہو۔

''وفناءالمسجدلیس لہ حکم المسجد،حتی لواقتدی بالامام منہ یصح ۔۔۔دون حرمۃ مرورالجنب ونحوہ۔''

(الحلبی الکبیر،فصل فی احکام المسجد:ص ۶۱۴)

معتکف کے حکم کو واضح کرنے سے پہلے مسجد کی تعریف لازمی ہے :

شرعی مسجد : جہاں جماعت ہوتی ہوں جنبی کا وہاں رہنایاآناجانامانع ہو۔عموماًاس کے تین حصے ہوتے ہیں :

اندرونی حصہ۔باہر کابرآمدہ۔باہر کا وہ حصہ جہاں عموماً گرمیوں میں جماعت ہوتی ہے۔

کسی زمین کی مسجد بننے کے لیے تین شرطیں :

کسی جگہ کی مسجد ہونے کے لیے تین باتیں ضروری ہیں :

- واقف زمین کا حقیقی مالک ہو'اس کو وقف کرنے کااختیار حاصل ہو۔
- اس کو اپنی ملک سے اس طرح علیحدہ کردینا کہ کسی دوسرے شخص یاخود واقف کا کوئی حق اس سے متعلق نہ رہے۔
- وقف کرکے اس کو متولی کے حوالہ کردیا ہو' یاواقف کی اجازت سے اس میں ایک مرتبہ بھی باجماعت نماز آدا ہوگئی ہو۔

''اذا سلم المسجد الی المتولی یقوم بمصالحہ یجوز،وان لم یصل فیہ وھو الصحیح۔''

(الفتاوی العالمکیریۃ،کتاب الوقف، الباب الحادی عشرفیمایصیربہ مسجدا:ج۲، ۴۵۵،ط:رشیدیہ)

(کذافی کفایت المفتی :ج۱۰،ص ۳۳)

شرعی مسجد کے مذکورہ بالاتین حصوں میں سے کسی بھی حصہ میں معتکف کاجانادرست ہے' باہر کا وہ حصہ جہاں عموماً گرمیوں میں جماعت ہوتی ہے' وہاں نماز پڑھنااور نکلنادرست ہے۔اسی طرح اگردرمیان میں گزرگاہ ہو' مگر مسجد ہی کا حصہ ہو تب بھی جاسکتاہے۔البتہ اگروہ شرعی مسجد کا نہ حصہ ہو' خواہ وہ وقف کی جگہ نہ ہوبلکہ کسی کی ذاتی ملک ہو' یاوقف ہو مگر مصالح مسجد میں سے ہو۔(مثلا: پارکنگ' وضوخانہ اور غسل خانہ وغیرہ) وہاں جانے سے اعتکاف فاسد ہوجاتاہے۔

فتاوی عالمگیری میں امام محمدؒ سے مسئلہ پوچھا گیاہے'کہ مسجد کے لیے دکان بنائی گئی ہے'اس کے اور مسجد کے درمیان فاصلہ بھی ہے'تاکہ گرمیوں میں اس کے اوپر نماز پڑھی جائے'کیاوہاں نماز پڑھنے پر دوگنااجر مل جائے گا؟ انہوں نے جواب ہاں میں فرمایا۔

''۔۔۔قال :سئلت محمدا رحمہ اللہ عن دکان اتخذ للمسجد بینہ وبین المسجد طریق وھو ناء عن المسجد؛لیصلی علیہ فی الحر ایضاعف للصلاۃ فیہ الاجرکمایضاعف فی المسجد؟قال: نعم ،کذافی الذخیرۃ۔''

(الفتاوی الھندیۃ،الباب الخامس فی آداب المسجد۔۔۔ج۵،ص۳۲۰)

یادرہے: مسجد میں ضرورت کے بغیر دنیاوی باتیں کرنا' یامسجد میں داخل' یاخارج ہونے کی دعاپڑھنااور یانماز کے انتظار کی خاطر بیٹھنے پر نفلی اعتکاف کی نیت کرنے کامدار شرعی مسجد ہے۔

صحن مسجد :

صحن مسجد کا اطلاق دومعنوں پر ہوتاہے' ایک وہ حصہ جو نمازاور جماعت آدا کرنے کے لیے تیار کیاجاتاہے جس کے اوپر چھت نہیں ہوتی ہے۔اس کا حکم یہ ہے' کہ یہاں مثلا: پارکنگ وضوخانہ' وغیرہ بنانا درست نہیں ہے۔اور معتکف کاوہاں جانا درست ہے۔دوسرا وہ حصہ جو صحن مسجد تو کہلاتاہے' مگر نمازاور جماعت آدا کرنے کے لیے نہیں بنایا جاتاہے۔اس کا حکم یہ ہے' کہ یہاں وضوخانہ بنانااور جنبی کاگزرناوغیرہ درست ہے جب کہ معتکف کا وہاں جانے سے اعتکاف فاسد ہو جاتاہے۔

تفصیل کے لیے: (کفایت المفتی: ج۱۰'ص ۱۱۸)

''وفناءالمسجدلیس لہ حکم المسجد،حتی لواقتدی بالامام منہ یصح ۔۔۔دون حرمۃ مرورالجنب ونحوہ۔''

(الحلبی الکبیر،فصل فی احکام المسجد:ص ۶۱۴)

(ماخوذازکفایت المفتی:ج ۱۰،ص ۱۱۸)

''لایجوز الاعتکاف فی مسجدزقاق غیرنافذۃ ؛لان طریقہ مملوک لاھلہ الااذاکان لہ حائط الی طریق نافذفحینئذ یمکن التطرق الیہ من حق العامۃ،فیخلص للہ تعالیٰ ،فیصیرمسجدا۔قال رضی اللہ تعالیٰ عنہ:والذی اختارہ۔''

(البحرالرائق،کتاب الوقف :ج۵،ص ۴۱۸ ،ط:رشیدیہ)

معتکف کا آذان کے لیے اذان خانہ جانا :

موذن کا اذان کے لیے اذان کی جگہ جانا درست ہے۔

''وفی فتاوی قاضی خان والولوالجی :وصعود المئذنۃ ان کا ن بابھافی المسجدلایفسدالاعتکاف،وان کان خارج المسجدفکذلک فی ظاھرالروایۃ۔قال بعضھم:ھذا فی المؤذن ؛لان خروجہ للاذان یکون مستثنی عن الایجاب،اما فی غیرالمؤذن فیفسد الاعتکاف۔والصحیح ان ھذاقول الکل فی حق الکل ؛لانہ خرج لاقامۃ سنۃ الصلاۃ،وسننھاتقام فی موضعھا،فلاتعتبرخارجا۔اھ''

(البحرالرائق،باب الاعتکاف:ج۲،ص ۵۲۹)

(فتاوی محمودیہ: ج۲۲'ص ۳۹۳)

صورت مسئولہ کا جزدوم :

کسی اور کی زمین میں تصرف درست نہیں ہے' خاص کرجب مسئلہ عبادت اور نماز کا ہو۔

حکومتی زمین حکومت کی ملک ہے' اگر وہ اجازت دے تو مسجد کی تعمیر درست ہے' ورنہ اجازت لیے بغیر تعمیر سے وہ شرعی مسجد نہ ہو گی۔اسی طرح مدرسہ پر بھی وقف کے احکام لاگو نہ ہوں گے۔

فتاوی عثمانی کے ایک سوال کے جواب میں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب یوں رقمطراز ہے :

کہ اس شہر کی تمام زمین حکومت جو اثنا عشریہ ہے کی ہے' وہ لوگوں کے ہاتھ فروخت نہیں کرتی ہے' مگر یہ کہ کچھ لوگ کسی خاص حصہ میں چار دیواری نہ بنائیں' اس لیے شہر کے چند آدمی متفق ہو کر چندہ جمع کر کے ایک قطعہ زمین کو عیدگاہ کے لیے خاص کرتے ہیں' ایک آدھ بار وہاں نماز بھی پڑی گئی ہے۔۔۔۔۔سوال مذکور کے جواب میں حضرت فرماتے ہیں :

اگر وہ زمین حکومت سے نہیں خریدی گئی تھی' بلکہ صرف دیوار بنائی گئی تھی تاکہ اس کی بنیاد پر حکومت سے خریدی جائے' تو یہ زمین ابھی تک عیدگاہ کے لیے وقف نہیں ہوئی کیونکہ وقف کی صحت کے لیے واقف کا مالک ہونا شرط ہے۔

قال فی'' الشامیۃ'':

''ذکر فی البحر:ان مفاد الکلام الحاوی اشتراط کون ارض المسجدملکا للبانی۔''

(ج۳،ص ۳۷۰)

(فتاوی عثمانی:ج۲،ص۵۰۷)

''الا لاتظلمواالالایحل مال امرئ مسلم الابطیب نفس منہ ۔رواہ البہیقی فی شعب الایمان والدار قطنی فی المجتبیٰ۔''

(مشکوٰۃ:ج۱،ص ۲۵۵)

''ولذاقال فی'' الخانیۃ'':

ولوان سلطانا اذن لقوم ان یجعلوا ارضا من اراضی البلدۃ حوانیت موقوفۃ علی المسجد،او امرھم ان یزیدوا فی مسجدھم ،قالو: ان کانت البلدۃ فتحت عنوۃ وذلک لایضربالمارۃ والناس ینفذ امرالسلطان فیھا،وان کانت البلدۃ فتحت صلحالاینفذامرالسلطان ؛لان فی الاول تصیر ملکا للغانمین ،فجاز امرالسلطان فیھاوفی الثانی تبقی علی ملک املاکھا،فلاینفذ امرہ فیھا۔اھ''

(البحرالرائق ،کتاب الوقف:ج۵،ص ۴۱۷)

<u>**نکتہ :**</u> جب حکومت بغیر فتح کی ہوئی زمین میں تصرف نہیں کر سکتی ہے' تو عوام کو از خود تصرف کا اختیار کیسا ہو گا؟

لہٰذا:

سرکاری زمین (مہاجر کیمپ) پر بنی ہوئی مسجد اجازت لیے بغیر شرعی مسجد نہ ہو گی اور اس پر تعمیر شدہ مدرسہ کی خرید وفروخت بھی حکومت کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہے۔ مگر یہ کہ حکومت سے زمین خرید جائیں اور یا حکومت ہبہ کریں۔

صورت مسئولہ کا جز سوم:

رمضان مبارک میں فجر کی نماز لوگوں کی کثرت کی خاطر پہلے پڑھنا' یا ظہر کی نماز اول وقت میں پڑھنے میں اگرچہ احناف کے اولیٰ قول پر عمل نہیں ہوتا ہے' تاہم احناف فقہا نے فجر کی نماز دیر (اسفار) سے اور یا ظہر کی نماز تاخیر سے (تبرید) پڑھنے کی علتوں میں سے ایک علت کثرت جماعت بیان فرمائی ہے۔ لہٰذا جہاں جماعت کی زیادہ لوگوں کی شرکت ہو' وہاں اول وقت میں نماز پڑھنا مستحب ہے۔

واضح رہے :

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ یہی فرماتے ہیں : کہ شروع میں لوگ صوم صلوٰۃ کے پابند تھے ٬رات میں نفل وعبادت کی فضا تھی صبح کے اول وقت میں نماز پڑھنے سے لوگ جماعت سے پیچھے نہیں رہتے تھے ٬جوں جوں لوگوں پر زمانہ گزرتا گیا وہ غفلت اور سستی کے شکار ہونے لگے۔اب بھی اگر وہ فضا برقرار رہے ٬حکم تبدیل ہوگا٬کیونکہ نمازوں کے اوقات کے باب میں اول ٬درمیانہ اورآخر وقت کے متعلق مختلف احادیث موجود ہیں۔

’’والذي يَظْهَر أَنَّ العملَ في عهدِ النبيِ صلى الله عليه وسلّم كان على التَّغْلِيس ولا يجب أن يكونَ بِقَدْرِ ما رامَهُ الشافعية رحمهم الله تعالى مع أَنَّ الزمانَ إذْ ذاك كان زمانَ الشدة في العمل، والنَّاس كانوا يَتَقَيَّدون بصلاةِ الليل، فلم تَكُنِ الجماعة تَخْتَل بالتغليس، ثُمَّ إذا نشأ الإسلامُ وكَثُرَ المسلمون وعَلِمَ أَنَّ فيهم ضعفًا عَمَلَ بالإسفار في زمن الصحابة رضي الله عنهم، لئلا يُفضي إلى تقليل الجماعةِ، وقد عَلِمْتَ فيما سَبَقَ أَنَّ بُطْأَ النَّاس وتعجيلهم ممَّا قد رَاعَاه النَّبي صلى الله عليه وسلّم أيضًا، فلو اجتمع النَّاس اليوم أيضًا في التَّغْلِيس لقُلنا به أيضًا كما في «مبسوط السَرَخْسي» في باب التيمم أَنَّه يُستحب التَغْلِيس في الفجر، والتعجيل في الظُّهْر إذا اجتمع النَّاس، ثُمَّ إنَّا لا ننازعك أَنَّ الأمرَ كيف كان في عهدِ النَّبي صلى الله عليه وسلّمونرجو منك أن تعذرنا في العمل بالإسفار، فإنَّا قد أُمِرْنا به بصريحِ النَّص «أسفروا بالفجر» وليرَ كُلُّ امرىءٍ وظيفتَه ولا يبحث مما كان أو يكون، هذا هو الصراط المستقيم فاتبعوه. وبعد فقد نقل السخاوي عن الحافظِ ابن حجر كما في «شرح الإحياء» أنَّه أقرَّ بكونِ مذهبِ الحنفية أَقْوَى۔‘‘

(فیض الباری:ج 2،ص333)

’’قولہ: کنت اتسحر فی اھلی ثم یکون سرعۃ بی ان ادرک صلوٰۃ الفجرمع رسول اللہ ﷺولعل ھذالتغلیس کان فی رمضان خاصۃ ،وھکذاینبغی عندنا اذااجتمع الناس ،علیہ العمل فی دار العلوم دیوبندمن عھدالاکابر۔‘‘

(مذکورہ بالاماخذ)

لہٰذا :

احناف کے ہاں صبح کی نماز میں اسفار ٬یا گرمیوں میں ظہر کی نماز میں تاخیر کے برعکس کثرت جماعت کی وجہ سے اول وقت میں احناف کے ہاں استحباب کا فتوی دینادرست ہے۔

واللہ اعلم بالصواب ۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- ❖ واٹس ایپ پر مبیعہ کی تصویر دیکھنے سے خیار رؤیت
- ❖ عیب پانے کی صورت میں صرف نقصان کی رقم وصول کرنا
- ❖ اوصاف نہ ہونے کی صورت میں رقم وصول کرنا
- ❖ آن لائن خریداری میں ایجاب (OK) کے بٹن پر کلک کرنا
- ❖ سوشل میڈیا پر علما کرام کا وعظ
- ❖ کیا ڈیجٹل تصویر تصویر ہے؟
- ❖ ڈیجٹل تصویر کو مشابہ عکس کہنا

بسم الله الرحمن الرحيم۔

کیافرماتے ہیں علماء کرام مسائل ذیل کے بارے میں:

* WatsApp میں مبیعہ کی تصویر دیکھنے سے خیارؤیت ختم ہوگی؟

اوراگرمبیع میں مطلوبہ اوصاف ناپید ہوں ،واپسی کی صورت میں مشتری پرزیادہ خرچہ آئے گا،کیاازروئے مشتری صرف رجوع بالنقصان (چیز میں ناپیداوصاف کاعوض طلب کرنا) کرسکتاہے؟

* کیاآن لائن خریداری میں بائع کی طرف سے سکرین پر موجود چیز پرخریدارکا "ok"پرکلک (بٹن دبانا) کرنا قبول شمار ہوگا،یاصرف ایک پیشکش ہے جومالک کی طرف سے خریدنے کی دعوت ہے؟
* کیاسوشل میڈیا"social media"پرعلماء کرام کاوعظ اورنصیحت درست ہے؟

الجواب حامداومصليا

مبیعہ(خریدی ہوئی چیز) کی تصویرکوواٹس ایپ ،یاکسی اورالیکٹرونک میڈیا " electronic media"کے ذریعے دیکھنے سے خیاررؤیت ختم نہیں ہوتی ہے۔

واضح رہے:

سکرین کی شعاعیں پڑنے سے شئے کی اصل حقیقت سامنے نہیں ہوتی ہےاورفقھاء کرام نےسابقہ دورمیں ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن سے سکرین پرتصویرسے خیاررؤیت ساقط نہ ہوناواضح ہوتاہے۔

"ولو اشترى دهنا في قارورة فرأى خارج القارورة فعن محمد روايتان: روى ابن سماعة عنه أنه لا خيار له؛ لأن الرؤية من الخارج تقيد العلم بالداخل، فكأنهرآه وهو خارج.وروي عنه أن له الخيار؛ لأن العلم بما في داخل القارورة لايحصل بالرؤية من خارج القارورة؛ لأن ما في الداخل يتلون بلونالقارورةفلا يحصل المقصود من هذه الرؤية..."

(بدائع الصنائع:خيارالرؤية)

<u>"لأن ما في الداخل يتلون بلون القارورة فلا يحصل المقصود من هذه الرؤية..."</u>

مذکورہ عبارت موجودہ دور کی سکرین پر منطبق ہوسکتی ہے، کیونکہ قارورہ (شیشہ) کے اندر سے اتنی روشنی منعکس نہیں ہوتی ہے، جتنی روشنی سکرین کے اندر سے تصویر پر منعکس ہوتی ہے۔اور پھر خاص کر جب اس کی روشنی تیز کر خریدار کو پھنسانا مقصود ہو۔

"ولو اشترى دهنا في قارورة فنظر إلى القارورة ولم يصب الدهن على راحته أو على أصبعه فهذا ليس برؤية عند أبي حنيفة - رحمه الله تعالى -كذا في الخلاصة.ولو رأى ما اشتراه من وراء زجاجة أو في مرآة أو كان المبيع على شفا حوض فنظره في الماء فليس ذلك برؤية وهو على خياره كذا في السراج الوهاج.ولو اشترى سمكا في الماء يمكن أخذه من غير اصطياد فرآه في الماء قال بعضهم: لا يسقط خياره وهو الصحيح هكذا في فتح القدير."

(الفصل الثانی :فی ماتکون رؤیۃبعضہ----)

خیار رؤیت حاصل ہونے کے بعد اگر گاہک واپس کرنا چاہے ،تو بسااوقات بہت سارا خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہے اور پھر خاص کر جب بیرون ملک خرید وفروخت ہو اور یا اندرون ملک ہو، لیکن گڈز کمپنی کا خرچہ زیادہ ہو، تو اسی صورت میں حنابلہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا، کہ اگر مطلوبہ چیز میں عیب یا مطلوبہ اوصاف نہ ہوں، تو محض خیارؤیت کی بناپر واپس نہیں کر سکتا ہے، جب کہ خرچہ نہ آنے کی صورت میں احناف کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا محض خیارؤیت کی بناپر واپس کر سکتا ہے۔

چنانچہ "فقہ البیوع" میں لکھتے ہیں:

"أماخیارالرؤیۃ ،فانما یثبت اذاوقع العقد علی شیئ غائب ،وھوحق یتخیربہ المتملک بین فسخ العقد أوامضاءہ عندرؤیۃ المعقودعلیہ ،ولاخیارللمشتری فی الفسخ قبل الرؤیۃ ،أمابعدالرؤیۃ ،فللمشتری الخیارمطلقا فی البیوع المحلیۃ ،أمااذاکان البیع بین بلدین عن طریق الشحن البری أوالبحری أوالجوی،فخیارالمشتری مشروط بان یجدالبمیع مخالفا لتلک المواصفات ،ولاخیارلہ ان وجدھا مطابقۃ لھا۔"

(خیارالرؤیۃ:ج۲،ص۱۱۷۹)

عیب پانے پر یا مطلوبہ اوصاف موجود نہ ہونے پر صرف نقصان کی رقم وصول کرنا:

اگر عیب کی صورت میں چیز واپس کرنے سے مشکلات ہو اور یا زیادہ خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہو، تو بائع اور مشتری باہمی رضامندی سے مبیعہ میں نقصان کی تلافی تاوان دینے کی صورت میں کرنا چاہے، تو جواز کے لیے آپس کی مصالحت شرط ہے۔

قال فی" فقہ البیوع":

"مقتضی خیارالعیب أن المشتری لہ ان یرد المبیع الی البائع،ویطالبہ برد الثمن ،الاأن یصطلح المتبایعان علی أن یمسک المشتری المبیع ،ویحط البائع من الثمن بقدر مانقص العیب من قیمۃ المبیع ،أوبمایتراضیان علیہ ،بشرط أن یکون تابعا لشروط الصلح الشرعیۃ۔"

(ج۲،ص۱۱۸۰)

اوصاف نہ ہونے کی صورت میں:

واضح رہے: اوصاف نہ ہونے کی صورت میں چیز اس وقت واپس کرسکتاہے،جب مطلوبہ اوصاف دوران بیع لازم قرار دیے گئے ہوں،تو یہاں بھی باہمی رضامندی اور مصالحت سے رجوع بالنقصان کرسکتاہے۔

"أن يكون الوصف المرغوب فيه مشروطافى العقد۔۔۔۔ومقتضى خيارفوات الوصف أنه يحق للمشترى عندفقدان الوصف المشروط أن يرد المبيع ويسترد الثمن ۔أماااذاتعذرالردلمانع من موانع الردفى خيارالعيب،فله مطالبة فرق القيمة بين الموصوف بذلك الوصف،وبين غيرالموصوف۔"

(فقه البيوع:ج۲،ص۱۱۸۴)

یادرہے:

یہ فتوی ضرورت کی بناء پردیاجاسکتاہے،ورنہ خیار عیب کی صورت میں کتب فقہ میں دوہی اختیارہے،یامبیعہ واپس کرے اوریاعیب کے ساتھ رکھنے پرراضی ہوجائے۔

❖ آن لائن خریداری میں ایجاب پرکلک کرنا:

آن لائن خریداری میں گاہک کاصرف okبٹن پر click کرنے سے قبول شمارنہ ہوگا۔

واضح رہے:

بائع کی طرف سے جوچیزیں ویب پرپیش کی گئی ہیں،یہ دراصل ایک پیشکش ہے،باقاعدہ ایجاب نہیں ہے،بلکہ دعوت ایجاب ہے،اس لیے مشتری کے کلک کرنے سے بائع کو قبول کرنے کااختیار optionموجود ہوتاہے۔

اوربسااوقات اس چیز کی صرف تصویرسکرین پرموجودہوتی ہے،مشتری کے کلک کرنے سے بائع اس کو مہیاکرنے کی تیاری کرتاہے۔یہ واضح ثبوت ہے،کہ خریدار کابٹن پرکلک کرنے سے بیع تام نہیں ہوتی ہے۔

قال فى "فقه البيوع":

"ثم الذى يظهرمن الفروع التى ذكرها جمهورالفقهاءفى تفسيرالايجاب والقبول أنهم يتصورون تحقق الايجاب اذاكان موجها الى شخص معين،أوجهة معينة،وان كان هذالشرط غيرموجود بهذه الصراحة فى عامة كتب الفقه۔۔۔۔۔۔۔والذى يتحصل من كلام الفقهاء كماذكرناأن عرض السلع ليس ايجابا فى عامة الأحوال الااذااتصل به تصريح من البائع يدل على أن عرضة يمثل الايجاب بحيث لايريد لانشاء البيع الا القبول من المشترى ،وبما أن هذاالشرط مفقود فى عامة العروض ؛فانها لاتعد ايجابا ،وانما هى دعوة للشراء،وكذلك الدعوة

العامة عن طريق النشرة فی الصحف والمجلات والاعلانات المنشورة عن طريق المذياع ،والتلفزيون ليست ايجابا ،وانما هی دعوة عامة للتعاقد،فان تقدم أحد بايجاب الشراء اعتمادا على هذه النشرات أو الأسعار ،فالبائع له خيارالقبول ،ولايتم البيع الا بقبول منه"

(المبحث الاول :ج١،ص ٣٧)

یادرہے:

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ کے ویب سائٹ پر بھی خریدار کا قبول کرنے سے بیع مکمل نہ ہونے کا فتویٰ دیا گیاہے۔اور ساتھ یہ مثال بھی دی ہے،کہ جیسے بائع نے فروخت کرنے کے لیے چیزیں آویزاں کی ہو،گاہک اس کو صرف اٹھاکر دیکھ لے،تو اس کو ایجاب وقبول نہ کہاجائے گا۔

❖ سوشل میڈیاپر علماءکرام کا وعظ ونصیحت:

چونکہ مسئلہ کا تعلق تصویر سے ہے،اگرڈیجیٹل تصویر تصویر ہو،تواس کاالگ حکم ہوگااورعکس کے مشابہ ہونے پر حکم الگ ہوگا۔

کیا ڈیجیٹل تصویر تصویرہے۔۔۔۔؟

ذیل میں چند فقہی قواعد لکھے جاتے ہیں:

قاعدہ:

غیر منصوص میں منصوص کے حکم کوثابت کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں:

منصوص میں حکم کی علت معلوم کرنا۔

علت کاغیر منصوص میں پایاجانا۔

قاعدہ:

ماضی میں جاندار کی شبیہ کی چار قسمیں ہمارے سامنے ہیں:

مورتی اور مجسمہ۔۔۔۔تصویر۔۔۔۔عکس۔۔۔۔ ظل اور سایہ۔

اوراب ڈیجیٹل تصویر۔۔۔کہ کیااس سے تصویر کہاجائے،یاعکس اوریا شبیہ عکس۔

قاعدہ:

محرم اور مبیح میں تعارض ہو تو ترجیح محرم کو ہوتی ہے۔

قاعدہ:

جس چیز کی حقیقی علت پر اطلاع مشکل ہو، تو حکم کا مدار سبب ہوتا ہے۔

مثال: سفر میں علت مطلق سفر ہے، چاہے مشقت ہو، یا نہ ہو۔اسی طرح نیند مطلقاً ناقض وضو ہے، چاہے استرخاء مفاصل ہو یا نہ ہو۔

قاعدۃ:

احکام کثیرہ کا مدار عرف پر ہونا مسلم ہے۔

علت حرمت منصوص میں: مضاہاۃ لخلق اللہ (اللہ تعالیٰ کی صفت خلق میں مشابہت اختیار کرنا)۔

یاد رہے: **مضاہاۃ لخلق اللہ** ایسی علت منصوصہ ہے جو خود الفاظ میں مذکور ہے۔علت منصوصہ کے بجائے علت مستنبطہ کو ترجیح حاصل نہ ہوگی۔

مذکورہ بالا علت ڈیجیٹل تصویر میں پورے طور پر پائی جارہی ہے اور یہ انسان کی صنعت اور اختیار سے ہے۔

"(أشد الناس عذابا عند الله يوم القيامة الذين يضاهون بخلق الله) أي يشابهون..."

(التيسيربشرح جامع الصغيرللمناوى)

"لله موحد ولنبيه عليه السلام مصدق أهو اشد عذابا أم فرعون وآله ؟ فإن قلت : من صور صورة ، قيل : قد قال الله خلاف ذلك : (أدخلوا آل فرعون أشد العذاب ...) قيل: ليس فى خبر ابن مسعود خلاف للتنزيل بل هو له مصدق ، وذلك أن المصور الذى أخبر النبى عليه السلام أنه له أشد العذاب هو الذى وصفه النبى عليه السلام - فى حديث عائشة بقوله : (الذين يضاهون خلق الله) .قال المؤلف : المتكلف من ذلك مضاهاة ماصوره ربه فى خلقه أعظم جرما من فرعون وآله ، لأن فرعون كان كفره بقوله : (أنا ربكم الأعلى) من غير إدعاء منه أنه يخلق ولا محالة منه أن ينشىء خلقا يكون كخلقه تعالى شبيها ونظيرا ، والمصور المضاهى بتصويره ذلك منطو على تمثيله نفسه بخالقه ، فلا خلق أعظم كفرا منه فهو بذلك اشادهم عذابا وأعظم عقابا ، وأما من صور صورة غير مضاه ماخلق ربه ، وإن كان بفعله مخطئا ، فغير داخل فى معنى من شاهى ربه بتصويره . فإن قيل : ومالوجه الذى تجعله به مخطئا إذا لم يكن فى تصويرة لربه مضاهيا ؟ قيل : لاتهامه نفسه عند من عاين تصويره أنه ممن قصد بذلك المضاهاة لربه ، إذ كان الفعل الذى هو دليل على المضاهاة منه ظاهرا ، والاعتقاد الذى هوخلاف اعتقاد المضاهى باطن لا يصل إلى علمه راءوه ."

(شرح بخاری لابن بطال)

"الوجه الأول : أن العلة هي ما في التصوير من مضاهاة خلق الله تعالى وأصل التعليل بذلك وارد في الأحاديث المتقدمة ، كلفظ حديث عائشة رضي الله عنها : الذين يضاهون بخلق الله--الوجه الثاني : كون التصوير وسيلة إلى الغلو في غير الله تعالى بتعظيمه حتى يئول الأمر إلى الضلال والافتتان بالصور ---الوجه الثالث: أن العلة مجرد الشبه بفعل المشركين الذين كانوا ينحتون الأصنام ويعبدونها ، ولو لم يقصد المصور ذلك ، ولو لم تعبد الصورة التي يصنعها ، لكن الحال شبيهة بالحال . كما نهينا عن الصلاة عند طلوع الشمس وعند غروبها-------------الوجه الرابع : أن وجود الصورة في مكان يمنع دخول الملائكة إليه . وقد وردالنص على ذلك في حديث عائشة وحديث علي .----"

(الموسوعة الفقهية)

<u>ڈیجیٹل تصویر کو عکس کا مشابہ کہنا:</u>

عکس میں انسان کی صنعت اور اختیار کا عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔اس میں انسان کی کاریگری اور اختیار نہیں ہوتا ہے۔

"(قوله؛ لأن المرئي مثاله إلخ) يشير إلى ما في الفتح من الفرق بين الرؤية من الزجاج والمرآة، وبين الرؤية في الماء، ومن الماء حيث قال:كأن العلة والله سبحانه وتعالى أعلم أن المرئي في المرآة مثاله لا هو وبهذا عللوا الحنث فيما إذا حلف لا ينظر إلى وجه فلان فنظره في المرأة أو الماءوعلى هذا فالتحريم به من وراء الزجاج، بناء على نفوذ البصر منه فيرى نفس المرئي بخلاف المرأة، ومن الماء، وهذا ينفي كون الإبصار من المرآةوالماء بواسطة انعكاس الأشعة، وإلا لرآه بعينه بل بانطباع مثل الصورةفيهما، بخلاف المرئي في الماء؛ لأن البصر ينفذ فيه إذا كان صافيا فيرى نفس ما فيه، وإن كان لا يراه على الوجه الذي هو عليه، ولهذا كان له الخيار إذا اشترى سمكة رآها في ماء بحيث تؤخذ منه بلا حيلة. اهـ

وبه يظهر فائدة قول الشارح مثاله، لكنه لا يناسب قول المصنف تبعا للدرربالانعكاس، ولهذا قال في الفتح وهذا ينفي إلخ، وقد يجاب بأنه ليس مرادالمصنف بالانعكاس البناء على القول بأن الشعاع الخارج من الحدقة الواقع على سطح الصقيل كالمرآة والماء ينعكس من سطح الصقيل إلى المرئي، حتىيلزم أنه يكون المرئي حينئذ حقيقته لا مثاله، وإنما أراد به انعكاس نفس المرئي، وهو المراد بالمثال فيكون مبنيا على القول الآخر ويعبرون عنه بالانطباع، وهو أن المقابل للصقيل تنطبع صورته، ومثاله فيه لا عينه، ويدل عليه تعبير قاضي خان بقوله؛ لأنه لم ير فرجها، وإنما رأى عكس فرجها فافهم."

(الدرالمختاروحاشیہ ابن عابدین:فروع طلق امرء تہ تطلیقتین ولھامنہ لبن)

الانطباع اور تنطبع دونوں سے واضح ہوتا ہے، کہ عکس میں انسان کی صنعت اور اختیار کا کوئی دخل نہیں۔

عکس ہمیشہ ذوالعکس کا تابع ہوتا ہے،جب کہ ڈیجیٹل تصویر میں شبیہ اصل کے تابع نہیں ہوتی ہے،بسااوقات اصل خاک میں مدفون ہوتا ہے،جب کہ شبیہ سکرین پر نظر آرہی ہے۔

فرمان حضرت تھانوی (رحمہ اللہ):

آئینہ کے اندر کوئی انتقاش باقی نہیں رہتا،زوال محاذاۃ کے بعد وہ عکس بھی زائل ہوجاتاہے،بخلاف فوٹو کے اور یہ بالکل ظاہر ہے اور پھر صنعت کے واسطے سے ہے،اس لیے بالکل دستی تصویر کے ہے۔

(امدادالفتاوی: ج۴،ص ۲۵۳)

فرمان مفتی رشید احمد صاحب (رحمہ اللہ):

تصویر اور عکس دونوں بالکل متضاد چیزیں ہیں ،تصویر کسی چیز کا پائیدار اور محفوظ نقش ہوتی ہے،عکس ناپائیدار اور وقتی نقش ہوتاہے،اصل کے غائب ہوتے ہی اس کا عکس بھی غائب ہوجاتاہے۔

(احسن الفتاوی: ج۸،ص۸۸)

ایک دوسری جگہ پر حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں:

اس کو عکس کہنا بھی صحیح نہیں ہے،اس لیے کہ عکس اصل کے تابع ہوتاہے اور یہاں اصل کی موت کے بعد بھی اس کی تصویر باقی رہتی ہے۔

(احسن الفتاوی: ج۹،ص ۸۸)

ڈیجیٹل تصویر کو شبیہ یا عکس کہنا:

مارشل برین کی تحقیق کے مطابق ڈیجیٹل کیمرا،کیمکاڈر اور یا ویب کیم دراصل برقی رو کو برقی ذرات میں تبدیل کرکے ان کو فلاپی ڈیسک، سی ڈی اور یا ہارڈ ڈسک پر ریکارڈ کرتے ہیں اور یہ درحقیقت روشنی کی ایک لہر ہے،جو تصویر سے آر پار ہوتی ہے،جس میں تصویر کی گرفت ہی نہیں ہوتی۔

شعاعی مناظر کی معلومات سی ڈی یا چپس وغیرہ میں اس طرح محفوظ ہیں جس طرح آڈیو کیسٹ میں مقناطیسی فیتے پر آوازوں کی صوتی لہریں محفوظ ہوتی ہیں، جنہیں ہم کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے ہیں،تاہم بوقت ضرورت جب کسی ٹیپ ریکارڈ یا آڈیو مشین میں رکھ کر کیسٹ کو چلایا جاتاہے،تو خاص آلہ کی مدد سے صوتی لہریں نکل رہی ہوتی ہیں اور ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ میں کہیں بھی قائم اور ثابت نہیں ہوتیں۔

<u>جواب بزبان احسن الفتاویٰ:</u>

تصویر ہونے نہ ہونے کااعتبار عرف پر ہوناچاہیے،نہ کہ سائنسی تدقیقات پر۔۔۔۔۔۔جیسے شریعت نے صبح صادق اور طلوع وغروب کاعلم کسی دقیق علم وفن پر موقوف نہیں رکھا،ظاہری وسہل علامات پر رکھاہے۔

(احسن الفتاوی: ج۹، ص۸۹)

سوال: کوئی حکم شرعی سائنسی تحقیق پر رکھنادرست نہیں،تاہم اگرسائنسی ماہرین سے ایجاد کی حقیقت معلوم کرکے اس کاحکم شرعی معلوم کیاجائے،تواس میں کونساحرج ہے؟

جواب: کسی بھی عرف وعادت سے ثابت شدہ شیئ کوغلط ثابت کرنے لیے یقینی دلیل کا ہوناضروری ہے۔

- لہٰذااس کو تأبیرالنخل (جیساکہ فریق دوم نے ڈیجیٹل تصویر کواس پر قیاس کی ہے۔) پراس لیے قیاس نہیں کیاجائے گا،کیونکہ تأبیرالنخل کا فائدہ عرف عام،عادت اور مشاہدہ میں مفید ہونا ثابت ہوا،جب کہ اسکرین پرآنے والامنظرانسان کی صنعت اوراختیار سے ہے،تواس کوکیسایقینی تصویر سے نکال کرمارشل کی تحیقیق پر منطبق کیاجائے۔
- ڈیجیٹل کیمرامیں روشنی برقی ذرات میں تبدیل ہوکراور تیزی سے حرکت کرنے کو یہاں تک تسلیم کرنادرست ہے کہ تصویراسکرین پر ظاہر ہو،لیکن اگر اس کواپنےاختیار سے باقاعدہ save (محفوظ) کیاجائے اورجب بھی چاہیے پائیدارشکل میں چلائی جائے،تواس کوتصویرہی کہاجائے گا۔
- سابقہ کتب میں ایسی نظیریں ملتی ہیں،کہ تصویر کے لیے مجسم ہوناضروری نہیں،بلکہ اس کے علاوہ بھی ہوسکتی ہے۔

"قال أصحابنا وغيرهم من العلماء تصوير صورة الحيوان حرام شديد التحريم وهو من الكبائر لأنه متوعد عليه بهذا الوعيد الشديد المذكور فى الأحاديث وسواء صنعه بما يمتهن أو بغيره فصنعته حرام بكل حال لأن فيه مضاهاة لخلق الله تعالى وسواء ما كان فى ثوب أو بساط أودرهم أو دينار أو فلس أو اناء أو حائط أو غيرها۔۔۔"

(شرح النووی علی مسلم:باب تحریم التصویر۔۔۔)

<u>**"وسواء ما كان فى ثوب أو بساط أودرهم أو دينار أو فلس أو اناء أو حائط أو غيرها۔۔۔۔"**</u>

<u>اس عبارت سے صاف واضح ہوتاہے،کہ تصویرکسی بھی شکل میں ہو،وہ تصویر ہوتی ہے،لہٰذاڈیجیٹل تصویر(حقیقت سے اشبہ ہونے کے باوجود) کو شبیہ عکس کہناقرین قیاس نہیں ہے۔</u>

"قال بن بطال في هذا الحديث دلالة على أنه صلى الله عليه و سلم كان ينقض الصورة سواء كانت مما له ظل أم لا وسواء كانت مما توطأ أم لاسواء في الثيابوفي الحيطان وفي الفرش والأوراق وغيرها۔۔۔۔"

(فتح الباری:باب نقض الصور---)

"سواء فی الثیاب وفی الحیطان وفی الفرش والأوراق وغیرها...."

اس عبارت سے معلوم ہوتاہے، کہ تصویرآلات تصاویر کی جدت کے ساتھ جدت اختیار کرجاتی ہے۔

- چونکہ علت حقیقی کا یقینی علم نہیں ہے،یعنی یہ یقینی نہیں ہے، کہ یہ درحقیقت تصویر ہے، یاروشنی کے ذرات کو محفوظ کردیاگیاہے،تواس کو سفر کی طرح سمجھاجائے گا،یعنی کہ جیسے وہاں علت مخدوش ہونے کے ناطے مطلق مشقت پر حکم کامدار ہوگا،اسی طرح یہاں بھی حرمت کامدار مطلق تصویر ہوگا۔
- احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے، کہ اس سے تصویرہی کہاجائے، کیونکہ یہ بالکل یقینی نہیں ہے، کہ ڈیجیٹل تصوہر شبیہ عکس ہے اور برقی ذرات کوسکرین پر منتقل کیے گئے ہیں۔
- عرف میں بھی تصویر سمجھی جاتی ہے، یہ کہناعرف میں بانڈز کو انعام کہاجاتاہے، درحقیقت وہ سود ہے اوریاپراویڈنٹ فنڈ پراضافہ رقم کو سود کہاجاتاہے، حالانکہ وہ انعام ہے۔لہٰذا یہاں بھی عرف کااعتبار نہ ہوناچاہیے۔

تو اس کا جواب یہی ہوگا، کہ ان مسائل میں حقیقت واضح ہے،اس لیے عرف کا اعتبار نہ ہوگا۔جب یہاں تو مسئلہ پیچیدہ ہے، اورعلت حقیقی کاتاحال علم نہیں ہوسکاہے۔لہٰذاقیاس درست نہ کیاجائے۔

سوشل میڈیاپرویڈیوبیانات :

- تصویری اور فلمی تبلیغ کے ہم مکلّف نہیں۔
- تبلیغ کے نام پر شریعت کے ایک ایک حکم کو پامال کرناپڑے گا۔
- بسااوقات فحش ڈرامے اور فلمیں اس آڑ میں دیکھے جاتے ہیں۔

حضرت علامہ محمد یوسف بنوریؒ :

ایک مرتبہ آپؒ سے ٹی وی پر تقریر کرنے کی درخواست کی گئی، توصاف انکارفرمایا:

اس بات کے مکلّف نہیں کہ لوگوں کو پکامسلمان بناکر چھوڑیں۔

- اس بات کے مکلّف نہیں کہ ناجائز ذرائع کواختیار کرکے لوگوں کو دین کی دعوت دیں۔
- اس کامیابی کی اللہ کے ہاں کوئی قیمت نہیں۔

- اس طرح تبلیغ کے نام پر دین کے ایک ایک حکم کو پامال کرنے کے مرتکب ہو جائیں گے۔
- مذکورہ بالا تحقیق سے تصویر ثابت ہو گئی ، لہٰذا بغیر ضرورت شدیدہ کے علاوہ جواز کا فتوی نہیں دیا جائیگا، ضرورت شدیدہ سے مراد دشمن کو اپنی شرعی سیاسی وجہادی قوت دکھانا ہو اور وہ بھی اس وقت جب ویڈیو پیغام آڈیو پیغام سے باآور ثابت ہو۔

واللہ اعلم بالصواب۔
السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- ❖ کھوجی کتے کے متعلق سوالات
- ❖ تعزیر مالی فقہا کی زبانی
- ❖ کھوجی کتے پر لگائے گئے مصارف کا ذمہ دار کون؟

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

کھوجی شخص یا کھوجی کتے کے متعلق تین سوالات :

1....... کیا کھوجی شخص ، یا کھوجی کتے سے چوری ثابت نہ کرنے کی صورت میں مدعی علیہ ہتک عزت کا دعوی کر سکتا ہے؟ اور اپنی بدنامی کے عوض مال وغیرہ وصول کر سکتا ہے؟

2......... کیا کھوجی شخص کی اجرت، یا کھوجی کتے کی فیس مدعی کے ذمہ ہو گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

3......... کھوجی شخص، یا کھوجی کتا بدنامی کا ذریعہ بھی ہو سکتے ہیں ، کیونکہ بسااوقات چوری ثابت نہ ہونے کی صورت میں اور یا غیر چور کو چور ثابت کرنے کی صورت میں نہ ختم ہونے والے اختلافات رونما ہو جاتے ہیں، تو از روئے شرع کھوجی شخص، یا کتا ہر ایک لا سکتا ہے، یا حکومت ہی کی سرپرستی ضروری ہے۔۔۔۔۔؟

الجواب حامداومصليا

بے عزتی کا دعوی کرنے والے اگر ہتک عزت کا دعوی کرے اور اس پر مال کا مطالبہ کرے ،مال دیے بغیر مسئلہ کسی صورت حل نہ ہوتا ہو، تو گاؤں کے معتبر اور ثقہ عالم کی سرپرستی میں مالی جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جب حکومت سے اپنے حق لینے کی کوئی امید نہ ہو اور نظام سلطنت جبر اور رشوت پر مبنی ہو، تو اس وقت تعزیر مالی سے تصفیہ کرایا جا سکتا ہے۔

بہتر یہ ہے کہ اس معمہ کو جرگہ کمیٹی سے حل کرایا جائے اس میں کم از کم ایک ثقہ عالم کا ساتھ ہونا، یا اس کی تائید کا حاصل ہونا ضروری ہے، تاکہ قاضی کی مٹی ہوئی شکل کم از کم رونما ہو جائیں۔۔۔۔

چنانچہ علامہ مفتی محمود رحمہ اللہ رقمطراز ہے :

''والبلدة التی لاوالی فیها ولاحاکم ،او کان ولایحکم بحکم الشرع ،فالعالم الثقة الذی یعتمده المسلمون هناك بمنزلة القاضی ---''

(جلد ۳،صفحہ ۶۵۴)

(کذافی معارف السنن:کتاب الصوم)

(کذافی احسن الفتاوی:کتاب الصوم)

تعزیر مالی فقہا کی زبانی۔۔۔۔

تعزیر مالی (مالی جرمانہ) کے متعلق حضرات فقہاء نے اپنی اپنی کتابوں میں کافی تفصیلی بحث کی ہیں، ان تمام تفصیلات اور بحثوں کا حاصل یہ ہے کہ حضرات طرفین کے نزدیک مالی جرمانہ سرے سے جائز نہیں ہے اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک حاکم وقت کے لئے تعزیر مالی کو جاری کرنا جائز و درست ہے۔ اور ساتھ میں یہ بات واضح رہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تعزیر مالی کا جواز مطلقاً ہر جگہ جائز نہیں ہے؛ بلکہ جہاں پر ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو مصلحت سمجھے گی وہاں پر جاری کرے گی۔ اور فقہاء نے

حضرات طرفین کے نزدیک عدم جواز کی جو بات نقل فرمائی ہے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ تعزیر مالی شروع اسلام میں جائز تھی بعد میں یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے، لیکن فقہ السنہ کے اندر منسوخ ہونے کی بات کی تردید کی گئی ہے کہ جن لوگوں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ مالی جرمانہ شروع اسلام میں جائز تھا بعد میں منسوخ ہوچکا ہے، ان لوگوں کے پاس منسوخ ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے اور یہ دعویٰ بلا دلیل کے ہے؛ اس لئے یہ حکم آج بھی بدستور باقی ہے؛ لہٰذا جہاں ذمہ دار شخصیت تعزیر مالی کو جاری کرنا مصلحت سمجھے گی وہاں آج بھی تعزیر مالی (مالی جرمانہ) جاری کرنے کی گنجائش ہے۔

اور اگر وقتی طور پر کچھ مال ضبط کرکے رکھ لیں اور بعد میں جب وہ اپنے جرم سے تائب ہوجائے تو اسے واپس کردیں، تو ایسا کرنا سب کے نزدیک جائز ہے اور تائب نہ ہونے کی صورت میں امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق متاثر کے حوالہ کرنے کی گنجائش ہے۔ اب فقہاء کے جزئیات ملاحظہ فرمایئے:

''فقہ السنہ''

"ومن قال: إن العقوبة المالية منسوخة فقد غلط على مذاهب الأئمة نقلا واستدلالا، وليس يسهل دعوى نسخها والمدعوون للنسخ ليس معهم سنة، ولا إجماع يصحح دعواهم. "

(فقه السنة ٢/ ٥٣٥)

"وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ الأموال جائز للإمام.

(تبيين الحقائق قديم مكتبہ إمداديہ ملتان ٣/ ٢٠٨، جديد زكريا ٣/ ٦٣٤)

وعن أبي يوسف أن التعزير بأخذ المال جائز للإمام، وعندهما والشافعي ومالك وأحمد لا يجوز بأخذ المال، وما في الخلاصة: سمعت من ثقة أن التعزير بأخذ المال إن رأى القاضي ذلك أو الوالي جاز، ومن جملة ذلك رجل لا يحضر الجماعة يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلك من المشايخ لقول أبي يوسف."

(حاشية چلپی على الزيلعي، قديم ٣/ ٢٠٨، جديد زكريا ٣/ ٦٣٤)

"الأصل في مذهب أبي حنيفة أن التعزير بأخذ المال غير جائز، فأبو حنيفةومحمد لا يجيزانہ، بل إن محمدا لم يذكره في كتاب من كتبہ، أماأبويوسف فقد روى عنہ أن التعزير بأخذ المال من الجاني جائز إن رؤية فيہ مصلحة."

(الموسوعة الفقهية الكويتية ١٢/ ٢٧٠)

"يجوز تعزيره بأخذ المال مبني على اختيار من قال بذلك من المشايخ كقول أبي يوسف، وقال التمرتاشي:يجوز التعزير الذي يجب حقا الله تعالى لكل أحد بعلة النيابة عن الله تعالى."

(فتح القدير، زكريا ٥/ ٣٣٠)

''درمختار مع الشامی'' میں اس کو ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے، کافی تفصیل موجود ہے، اس میں سے تھوڑی سی عبارت اقتباس کے ساتھ ذیل میں درج کی جاتی ہے:

"لا بأخذ المال في المذهب (بحر) وفيہ عن البزازية وقيل: يجوز ومعناه أن يمسكہ مدة لينزجر ثم يعيده لہ، فإن أيس من توبتہ صرفہ إلى مايرى، وفي المجتبى: أنہ كان في ابتداء الإسلام ثم نسخ، وتحتہ في الشامية: وعن أبي يوسف يجوز التعزير للسلطان بأخذ المال وعندهماوباقى الأئمة لا يجوز."

(درمختار مع الشامي، زکریا ۶/ ۱۰۵-۱۰۶، کراچی ۴/ ۶۱)

"بزازیہ" میں اس کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے:

"والتعزير بأخذ المال إن المصلحة فيه جائزة قال مولانا خاتمة المجتهدين مولانا ركن الدين أبو يحيى الخوارزميؒ: معناه أن نأخذ ماله ونودعه، فإذا تاب نرده عليه كما عرف في خيول البغاة وسلاحهم، وصوبه الإمام ظهير الدين التمرتاشي الخوارزمي، قالوا: ومن جملته من لا يحضر الجماعة يجوزتعزيره بأخذ المال۔"

(البزازية على الهندية ۶/ ۴۲۷، زکریا جدید ۳/۲۵۱)

کھوجی کتے پر لگائے گئے مصارف کا ذمہ دار کون۔۔۔؟

دعوی کو ثابت کرنے کے لیے جتنی بھی رقم خرچ کی ہو، وہ مدعی ہی کے ذمہ ہے، تاہم اگر ثابت ہونے کے بعد مدعی علیہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرے اور چوں وچرا کر کے جان چھڑانے کی کوشش کرے، تو اس وقت جتنا بھی پیسہ خرچ ہو جائے، اس کا تاوان مدعی علیہ سے لیا جائے گا۔

"واجرة المحضر على المدعى هو الاصح' وفى الخانية على المتمرد وهو الصحيح وفى الشامية : والحاصل ان اجرة الشخص بمعنى الملازم على المدعى و بمعنى الرسول المحضر على المدعى عليه لو تمرد بمعنى امتنع عن الحضور والا فعلى المدعى هذا خلاصة ما فى شرح الوهبانية،،،"

(الدرالمختار مع رد المحتار' كتاب القضاء ۳۷۲/۵ ط سعيد)

وأجرة المحضر على المدعي هو الأصح بحر عن البزازيةوفي الخانية على المتمرد وهو الصحيح ---

(الدرالمختار)

"مطلب في أجرة المحضر قوله (وأجرة المحضر الخ) بضم أوله وكسر ثالثه هو من يحضر الخصم وعبارة البحر هكذاوفي البزازية ويستعين بأعوان الوالي على الإحضار وأجرة الأ شخاص فيبيت المال وقيل على المتمرد في المصر من نصف درهم إلى درهم وفيخارجه لكل فرسخ ثلاثة دراهم أو أربعة وأجرة الموكل على المدعي وهوالأصح وفي الذخيرة أنه المشخص وهو المأموربملازمة المدعى عليه ا هوالإشخاص بالكسر بمعنى الإحضار فقد فرق بين المحضر وبين الملازم وهذا غير ما نقله الشارح فتأمل وفي منية المفتي مؤنة المشخص قيل في بيت المال وفي الأصح على المتمرد ا هـ"

(حاشيه ابن عابدين)

"وأجرة المحضر على المدعي هو الأصح بحر عن البزازية وفي الخانية على المتمردوهوالصحيح وكذا السلطان والمفتي والفقيه (أو) في (داره) ويأذن عموما.(قَوْلُهُ : وَأُجْرَةُ الْمُحْضِرِ إلَخْ) بِضَمِّ أَوَّلِهِ وَكَسْرِ ثَالِثِهِ هُوَ مَنْ يُحْضِرُ الْخَصْمَ ،وَعِبَارَةُ الْبَحْرِ هَكَذَا وَفِي الْبَزَّازِيَّةِ : وَيَسْتَعِينُ بِأَعْوَانِ الْوَالِي عَلَى الْإِحْضَارِ ،وَأُجْرَةُ الْأَشْخَاصِ فِي بَيْتِ الْمَالِ وَقِيلَ عَلَى الْمُتَرَدِّدِ فِي الْمِصْرِ وَمِنْ نِصْفِ دِرْهَمٍ إلَى دِرْهَمٍ وَفِي خَارِجِهِ لِكُلِّ فَرْسَخٍ ثَلَاثَةُ دَرَاهِمَ أَوْ أَرْبَعَةٌ ، وَأُجْرَةُ الْمُوَكِّلِ عَلَى الْمُدَّعِي وَهُوَ الْأَصَحُّ وَفِي الذَّخِيرَةِ أَنَّهُ الْمُشَخِّصُ وَهُوَ الْمَأْمُورُ بِمُلَازَمَةِ الْمُدَّعَى عَلَيْهِ ا هـ ، وَالْإِشْخَاصُ بِالْكَسْرِ بِمَعْنَى الْإِحْضَارِ فَقَدْ فَرَّقَ بَيْنَ الْمُحْضِرِ وَبَيْنَ الْمُلَازِمِ ، وَهَذَا غَيْرُ مَا نَقَلَهُ الشَّارِحُ فَتَأَمَّلْ .وَفِي مُنْيَةِ الْمُفْتِي مُؤْنَةُ الْمُشَخِّصِ قِيلَ فِي بَيْتِ الْمَالِ وَفِي الْأَصَحِّ عَلَى الْمُتَمَرِّدِ اهـ ، وَهَذَا مَا فِي الْخَانِيَّةِ .وَالْحَاصِلُ :أَنَّ الصَّحِيحَ أَنَّ أُجْرَةَ الْمُشَخِّصِ بِمَعْنَى الْمُلَازِمِ عَلَى الْمُدَّعِي

وَبِمَعْنَى الرَّسُولِ الْمُحْضِرِ عَلَى الْمُدَّعَى عَلَيْهِ لَوْ تَمَرَّدَ بِمَعْنَى امْتَنَعَ عَنْ الْحُضُورِ وَإِلَّا فَعَلَى الْمُدَّعِي ، هَذَا خُلَاصَةُ مَا فِي شَرْحِ الْوَهْبَانِيَّةِ ."

(ردالمحتار،مطلب : فی الاجتهاد وشروطه)

"الجواب: جب کسی کو اپنے حق کی حفاظت کے لئے بمجبوری نالش کرنا پڑے اور فریق مخالف کی طرف سے بالکل مخاصمانہ کارروائیوں کی وجہ سے بہت سے مصارف برداشت کرنا پڑیں تو اس صورت میں خرچہ کا روپیہ بہت سے علماء کے نزدیک (ومنهم مولانا رشید احمد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ) جائز ہے۔ یا اگر کسی حساب-------------------------------ثم حاصل ماذکرہ من ضمان الساعی أنہ لو سعی بحق لا یضمن ولو بلا حق، فإن کان السلطان یغرم بمثل ہذہ السعایۃ البتۃ یضمن، وإن کان قد یغرم وقد لا یغرم لا یضمن، والفتوی علی قول محمدؒ من ضمان الساعی بغیر حق مطلقا ویعزر۔ (شامی، کتاب السرقۃ، مطلب فی ضمان الساعی، زکریا دیوبند ۶/ ۱۴۸، کراچی ۴/ ۸۹) ولو غرم السلطان بمثل ہذہ السعایۃ ضمن، وکذا یضمن لو سعی بغیر حق ."

(امداد الفتاوى)

"مطلب في ضمان الساعي قوله (أو سعى إلى سلطان) الظاهر أن هذه المسألةوالتي بعدها لا ضمان فيهما اتفاقا لإزالة الضرر اه ط قوله (قد يغرم وقد لا يغرم)بتشديدالراء على البناء للفاعل من مزيد الثلاثي قال في المنح والفتوى اليوم بوجوب الضمان على الساعي مطلقا قوله (فقال) الأول إسقاطه قوله(إنه وجد كنزا) زاد في جامع الفصولين فظهر كذبه ضمن إلا إن كانعدلا أو قديغرم وقد لا يغرم ورمز أيضا السعاية الموجبة للضمان أنيتكلم بكذب يكون سبباالأخذ المال منه أو لا يكون قصده إقامة الحسبة كمالو قال إنه وجد مالا وقد وجدالمال فهذا يوجب الضمان إذ الظاهر أنالسلطان يأخذ منهالمال بهذا السبب اه قوله (وبه يفتى) أي دفعا للفسادوزجرا له وإن كان غير مباشر فإن السعي سبب محض لإهلاك المال والسلطانيغرمه اختيارا لا طبعا هذا وفي الإسماعيلية مايفيدأنه ورد نهي سلطاني عن سماع القضاة هذا الدعوى فإنه أفتى بأنه لا يقضي عليه بالضمان إلا بأمرسلطاني۔۔۔"

(الشامیہ)

"لَوْ سَعَى إِلَى سُلْطَانٍ بِمَنْ يُؤْذِيهِ ، وَالْحَالُ أَنْ لَا يَدْفَعَ بِلَا رَفْعٍ إِلَى السُّلْطَانِ أَوْسَعَى بِمَنْ يُبَاشِرُ الْفِسْقَ وَلَا يَمْتَنِعُ بِنَهْيِهِ أَوْ قَالَ لِسُلْطَانٍ قَدْ يُغَرِّمُ وَقَدْ لَا يَغْرَمُ إِنَّهُ قَدْ وَجَدَ كَنْزًا فَغَرَّمَهُ السُّلْطَانُ شَيْئًا لَا يَضْمَنُ فِي هَذِهِ الْمَذْكُورَاتِ ، وَلَوْغَرَّمَ السُّلْطَانُ أَلْبَتَّةَ بِمِثْلِ هَذِهِ السِّعَايَةِ ضَمِنَ ، وَكَذَا يَضْمَنُ لَوْ سَعَى بِغَيْرِ حَقٍّ عِنْدَ مُحَمَّدٍ زَجْرًا لَهُ : أَيْ لِلسَّاعِي وَبِهِ يُفْتَى وَعُزِّرَ ،وَلَوْ السَّاعِي عَبْدًا طُولِبَ بَعْدَ عِتْقِهِ ، وَلَوْ مَاتَ السَّاعِي فَلِلْمَسْعِيِّ بِهِ أَنْ يَأْخُذَ قَدْرَ الْخُسْرَانِ مِنْ تَرِكَتِهِ هُوَالصَّحِيحُ جَوَاهِرُ الْفَتَاوَى ."

(الشامیہ)

اختلاف سے بچنے کی خاطر حکومت یاایسے سربراہ کی سرپرستی ضروری ہے، جس سے مسئلہ کا تصفیہ ہوجائے، کیونکہ ایک مسئلہ کی وجہ سے دیگر کئی قسم کے مسائل جنم لینے سے حالات مزید پچیدہ ہوسکتی ہیں۔۔۔۔ جہاں احادیث میں ذکر ملتاہے، تواس میں حکومت وقت کوخطاب ہے، اس سے ثابت ہوتاہے، کہ جنائی مقدمات کا تصفیہ حکومت ہی کی سرپرستی میں ہوناچاہیے۔۔۔۔

حدثنا عبد الله بن محمد حدثنا محمد بن بكر حدثنا أبو داود حدثنا سعيد بن عمرو الحضرمي حدثنا إسماعيل بن عياش حدثنا ضمضم بن زرعة عن شريح بن عبيد عن جبير ابن نفير وكثير بن مرة وعمرو بن الأسود بعن

المقدام ابن معدي كرب وأبي أمامة عن النبي عليه السلام قال "إن الأمير إذا ابتغى الريبة في الناس أفسدهم" .(إن الأمير إذا ابتغى الريبة الخ) الريبة بالكسر أي طلب أن يعاملهم بالتهمة والظن السوء ويجاهرهم بذلك قال في النهاية أي إذا اتهمهم وجاهرهم بسوء الظن فيهم أداهم ذلك إلى ارتكاب ما ظن بهم ففسدوا انتهى۔قال المناوي ومقصود الحديث حث الإمام على التغافل وعدم تتبع العورات(أن الأمير إذا ابتغى الريبة في الناس أفسدهم) قال العلقمي."• قال في النهاية أي إذا اتهموهم وجاهرهم بسوء الظن فيهم أداهم ذلك إلى ارتكاب ما ظن بهم ففسدوا انتهى قال المناوي ومقصود الحديث حث الإمام على التغافل وعدم تتبع العورات---"

وفي البزازية ويستعين بأعوان الوالي على الإحضار-------

بزازیہ کی عبارت سے واضح ہوتاہے، کہ حکومت کے کارندوں کے ذریعے مدعی علیہ کو مطلب کیاجائے، بنابرایں ہروہ چیز جس کا تعلق مدعی علیہ پرفردجرم عاءد کی صورت میں ہو، حکومت وقت سے مدد طلب کی جائے

واللہ أعلم بالصواب۔

السید کلیم اللہ الحرمزئی ۔

- ایزی پیسہ / موبی کیش اکاؤنٹ
- کمپنی کی طرف سے قرض لینے پر کٹوتی
- کمپنی کی طرف سے میڈیکل انشورنس
- انشورنس میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ
- ایک سوال وجواب
- مدت کا مجہول ہونا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

موبی کیش یاایزی پیسہ کے مسئلہ میں مشکل یہ ہے،کہ کمپنی والے کہتے ہیں کہ اپنے اکاؤنٹ میں ہزار یادوہزار رقم جمع کریں ،اس کو نہ نکالیں اس پر آپ کو روزانہ یا ہفتہ وار اتنے منٹس دیے جائیں گے۔کیا یہ منٹس لینا جائز ہے،اگر نہیں تو جو کمپنی کی طرف سے خود بخود آتے ہیں اس کا کیا کیا جائے۔

کبھی موبائل میں جمع رقم یا منٹ ختم ہو کر کمپنی والے قرض دینے کی سفارش کرتے ہیں قرض پندرہ روپے دیتے ہیں ،جب کہ کٹوتی بیس کا کرتے ہیں ، کیااس طرح رقم لیناسود تو نہیں ہے۔نیز دیگر متعلقہ پیش آمدہ صورتیں اوران کے احکام کی بھی شرعی حیثیت واضح کیجیئے۔

الجواب حامداومصليا

ایزی پیسہ اکاؤنٹ(easy paysa account) کمپنی کی طرف سے ایک سہولت ہے،جس میں صارفین بلوں کی آدائیگی، یارقوم کی منتقلی ، موبائل وغیرہ میں بیلنس کااستعمال اور دیگر فوائد حاصل کرتے ہیں۔

دراصل ان رقوم کی پشت پرایک micro(مائیکرو) بینک ہوتاہے،جس میں عموماچھوٹے سرمایہ داروں کے پیسے سودپر رکھے جاتے ہیں اور اس میں سے چھوٹے کاروباروں کے لیے سودپر قرضے بھی دیے جاتے ہیں۔جس کو micro-financing (Telenor bank) کہاجاتاہے۔

اس کی شرعی حیثیت یہ ہے،کہ اکاؤنٹ میں جمع کردہ رقم قرض ہے ،قرض کے بدلے کسی قسم کا منافع جائز نہیں ہے۔لہٰذا مخصوص رقم جمع کرنے پر یومیہ فری منٹس (free minuets)اورمیسجز(massages)اورایمبیز (sBM) کی سہولت اور یارقم کی منتقلی پر ڈسکاؤنٹ وغیرہ وصول کرنادرست نہ ہوگا۔

اگر کوئی ایزی پیسہ اکاؤنٹ کھلوا چکا ہو تو فوراًاپنااکاؤنٹ ختم کرےاور صرف اپنی جمع کردہ رقم واپس لے، بصورت دیگر صرف جمع کردہ رقم سے استفادہ کرلیں،اس پر ملنے والے اضافی فوائد حاصل نہ کریں۔

یادرہے:

مذکورہ بالا تحقیق اس وقت ہے،جب رقم جمع کرنے پر اضافی فوائد مشروط اورلازمی ہوں،تاہم اگر صارفین ایزی پیسہ اکاؤنٹ میں اپنی مرضی کے مطابق جتنی رقم رکھناچاہے ،رکھ سکتے ہوں اورجب بھی چاہے رقم نکال سکتے ہوں اور کمپنی بھی

اپنےہی صوابدید پرجب چاہے اضافی فوائد (فری منٹس ،ایمیمیزاور میسیجز وغیرہ) دےاورجب چاہے ،نہ دے۔غرض رقم رکھنے والے اور کمپنی کے درمیان رقم رکھنے پر کوئی معاہدہ نہ ہواہو،ہرایک آزاد ہو،نفع مشروط نہ ہو،تو کمپنی کی طرف سے دیے جانے والے فوائد حاصل کرنا جائز ہوگا۔

موبی کیش (mobi cash) بھی بینک اکاؤنٹ کی طرح ایک اکاؤنٹ ہے ،جس میں اکاؤنٹ ہولڈر (Account Holder) کو کمپنی کی طرف سے مختلف سہولیات اورخدمات حاصل کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔مثلا: بل جمع کرنے کی سہولت ،اکاؤنٹ سے اکاؤنٹ تک رقم منتقل کرنے کی سہولت وغیرہ۔اس کے لیے کمپنی کی طرف سے اکاؤنٹ میں کوئی خاص رقم رکھنے کی شرط نہیں ہوتی ہے۔البتہ فری منٹس ،فری میجسزاورایمیز کی سہولت حاصل کرنے کے لیے آپ کے اکاؤنٹ میں مخصوص رقم (مثلا:2000)رکھناضروری ہے۔لہٰذا مخصوص مقدارپر نفع دینے کی شرط سود کے زمرے میں آنے کی وجہ ناجائز ہے۔اورخاص مقدار میں رقم رکھنے کی شرط نہ ہوتو سہولت سے فائدہ اٹھانادرست ہے۔

"كل قرض جر منفعة قال الكرخي هذا إذا كانت المنفعة مشروطة في العقد بأن أقرض غلة ليرد عليه صحاحا أو ما أشبه ذلك فإن لم تكن المنفعة مشروطة في العقد فأعطاه المستقرض أجود مما عليه فلا بأس به وكذلك إذا أقرض رجلا دراهم أو دنانير"

(الفتاوى الهنديہ:الباب التاسع عشرفی القرض والاستقراض)

"وَتَأْوِيلُ هَذَا عِنْدَنَا أَنْ تَكُونَ الْمَنْفَعَةُ مُوجِبَةً بِعَقْدِ الْقَرْضِ مَشْرُوطَةً فِيهِ ، وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ مَشْرُوطَةٍ فِيهِ فَاسْتَقْرَضَ غَلَّةً فَقَضَاهُ صِحَاحًا مِنْ غَيْرِ أَنْ يَشْتَرِطَ عَلَيْهِ جَازَ ، وَكَذَلِكَ لَوْ بَاعَهُ شَيْئًا ، وَلَمْ يَكُنْ شَرَطَ الْبَيْعَ فِي أَصْلِ الْعَقْدِ جَازَ ذَلِكَ ، وَلَمْ يَكُنْ بِهِ بَأْسٌ إلَى هُنَا لَفْظُ الْكَرْخِيِّ فِي مُخْتَصَرِهِ ، وَذَلِكَ ؛ لِأَنَّ الْقَرْضَ تَمْلِيكُ الشَّيْءِ بِمِثْلِهِ فَإِذَا جَرَّ نَفْعًا صَارَ كَأَنَّهُ اسْتَزَادَ فِيهِ الرِّبَا فَلَا يَجُوزُ ؛ وَلِأَنَّ الْقَرْضَ تَبَرُّعٌ وَجَرُّ الْمَنْفَعَةِ يُخْرِجُهُ عَنْ مَوْضِعِهِ ، وَإِنَّمَا يُكْرَهُ إذَا كَانَتْ الْمَنْفَعَةُ مَشْرُوطَةً فِي الْعَقْدِ ، وَإِذَا لَمْ تَكُنْ مَشْرُوطَةًفِيهِ يَكُونُ الْمُقْتَرِضُ مُتَبَرِّعًا بِهَا فَصَارَ كَالرُّجْحَانِ الَّذِي دَفَعَهُ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فِي بَدَلِ الْقَرْضِ ، وَقَدْ رُوِيَ عَنْ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ كَانَ يَسْتَقْرِضُ فَإِذَا خَرَجَ عَطَاؤُهُ أَعْطَاهُ أَجْوَدَ مِمَّا أَخَذَ."

(تبين الحقائق :فصل فی البيع)

"حكم اشتراط منفعة في القرض من شروط صحة القرض أن لا يكون فيه جر منفعة، فإن كان لم يجز، نحو ما إذا أقرضه وشرط شرطا له فيه منفعة أو أقرضه دراهم غلة على أن يرد عليه صحاحا لما روي أن رسول الله ﷺ قال : كل قرض جر منفعة فهو ربا هذا إذا كانت الزيادة مشروطة."

(الموسوعة الفقہية:حكم اشتراط منفعة فی القرض)

"الحسابات الجارية من أنواع القروض التي تجر نفعا:القاعدة أن كل قرض جر نفعا فهو ربا . والمقصود هنا النفع الذي يجره القرض للدائن، أما المدين فإنه إنما اقترض لينتفع بالقرض. ولابد لإعمال القاعدة أن يكون هذا النفع مشروطا، قال ابن المنذر : (أجمعوا على أن المسلف إذا شرط على المستلف زيادة أو هدية فأسلف على ذلك أن أخذ الزيادة على ذلك ربا). والقاعدة (أن المعروف عرفا كالمشروط شرطا) والمدين هو البنك

، والدائن في الحسابات المصرفية هو العميل المودع للنقود في حساباته لدى البنك وهو يتلقى أنواعا متعددة من الخدمات، بل وتتسابق البنوك في تقديم الخدمات الخاصة لأصحاب هذه الحسابات."

(مجلة مجمع الفقه الاسلامی ،الحاسابات والودائع المصرفية)

"فإن لم يكن مشروطا ولامتعارفا عليه، فللمقترض أن يقضي خيرا من القرض في الصفة أو يزيد عليه في المقدار، أو يبيع منه داره إن كان قد شرط أن يبيعها منه، وللمقرض حق الاخذ دون كراهة، لما رواه أحمد ومسلم وأصحاب السنن."

(فقہ السنۃ:کل قرض جرنفعافھوربا)

قال في '' فيض القدير '' :

'' كل قرض جرّ منفعة فهو ربا '' ۔

(28/5)

لما في '' السنن الكبرى للبيهقي '' :

عن فضالة بن عبيد صاحب النبي ﷺ أنه قال : '' كل قرض جّر منفعة فهو وجه

من وجوه الربا '' ۔ موقوف ۔

(كتاب البيوع ، باب كل قرض جر منعفة فهو ربا)

قال في '' الدر المختار مع الشامية '' :

وفي الخلاصة : القرض بالشرط حرام ، والشرط لغو --- وفي الأشباه : كل قرض

جرّ نفعا حرام ۔

(باب المرابحة والتولية ، مطلب كل قرض جرّ نفعا حرام)

(ماخوذ ازمسائل مہمہ:ج۷)

کمپنی سے قرض لینے پر کٹوتی :

قرض لینے پر کمپنی کی طرف سے کٹوتی درست ہے۔

واضح رہے :

فقہ حنفی میں سود کے لیے جنس اور کیل میں اتحادلازمی ہے،جب کہ بیلنس اور پیسوں کی جنس ایک نہیں ہے،اس لیے کہ بیلنس سے صرف آپ بذریعہ فون بات کرسکتے ہو،یامیسجزاورنیٹ کا کوئی پیکج خرید سکتے ہو،جب کہ پیسوں سے آپ کھانے پینے اورخوردونوش کے علاوہ دیگر ساماں بھی خرید سکتے ہو۔اورنہ ہی دونوں کیلی ہیں،توجنس اور کیل ایک نہ ہونے پر کمی وبیشی درست ہو گی۔

"خرج مسألة صرف الجنس بخلاف جنسه (بمعيار شرعي) وهو الكيل والوزن فليس الذرع والعد بربا۔"

(الدرالمختار،باب الربوا)

"(مع الجنس فإن وجدا حرم الفضل) أي الزيادة (والنساء) بالمد التأخير فلم يجز بيع قفيز بر بقفيز منه متساويا وأحدهما نساء (وإن عدما) بكسر الدال من باب علم ابن ملك (حلا) كهروي بمرويين لعدم العلة فبقي على أصل الإباحة۔"

(الدرالمختار،باب الربوا)

(الفتاوی الھندیۃ:الفصل الثالث فی الزیادۃ والحط فی الصرف)

کبھی کبھار کسی شخص کے موبائل فون کا بیلنس ختم ہوجاتا ہے، تو وہ کمپنی کی طرف سے بیلنس لون منگواتا ہے، جس کی کٹوتی میں کمپنی کچھ زائد پیسے بطورِ ٹیکس چارج لیتی ہے، شرعاًاِن زائد پیسوں پر سود کی تعریف صادق نہیں آتی، کیوں کہ یہ حقیقت میں اُدھار کی وجہ سے کال ریٹ کا بڑھانا ہے، جو بلاشبہ جائز ہے۔

لمافی" الھدایۃ":

"ألا يُرى أنہ يزاد في الثمن لأجل الأجل ۔ "

(کتاب البیوع ، باب المرابحۃ والتولیۃ 58/3)

وفي ''مجمع الأنہر '':

ويصح البيع بثمن حال ومؤجل بأجل معلوم ۔

(کتاب البیوع:13/3)

(ماخوذ ازالمسائل المھمۃ فیماابتلت بھاالامۃ:ج۷)

❖ بیلنس ختم ہونے کی صورت میں کمپنی سے قرض لینے کو اجارہ میں بھی داخل کیاجاسکتاہے اور وہ اس طرح کہ کمپنی کی طرف سے آپ کو باتیں کرنے جو سہولت (وقت) ملی ہے،اس کے عوض وہ آپ سے رقم بطور اجرت لیتی ہے۔

"(أما تفسيرها شرعا) فهي عقد على المنافع بعوض، كذا في الهداية."

(الفتاوی الھندیہ :کتاب الاجارہ، الباب الأول فی تفسیرالاجارہ ورکنھاوالفاظہا)

"وإذا عرف أن الإجارة بيع المنفعة...."

(البدائع:فصل فی رکن الاجارۃ ومعناھا)

<u>نوٹ:</u> سوال مذکور میں ایزی پیسہ اکاؤنٹ کے متعلق دیگر مسائل دریافت کیے گئے تھے، جن میں ایک مسئلہ انشورنس کا ہے ،وہ اس طرح ہے کہ جس شخص کا اکاؤنٹ بناہو، کمپنی یہ آفر کرتی ہے، کہ آپ مثلا: ماہانہ سولہ سو(۱۶۰۰) روپے جمع کیا کریں، اگرآپ

کو کوئی حادثہ لاحق ہوا، تو کمپنی اس نقصان کو برداشت کرے گی، اور فوتگی کی صورت میں آپ کی مکمل جمع کردہ رقم آپ کے ورثہ کو ملے گی۔ تو اس کا حکم عام بیمہ کی طرح ہے، جو کہ شرعی طور پر ناجائز اور حرام ہے۔

کمپنی کی طرف سے میڈیکل انشورنس کی سہولت:

اگر کوئی کمپنی خود اپنی طرف سے صارفین /ملازمین کو میڈیکل انشورنس کی سہولت دیتی ہے، اس کے لیے صارفین /ملازمین سے اُن کی تنخواہوں میں سے کوئی پیسہ نہیں لیتی ہے، تو اس سہولت سے فائدہ اُٹھانے کی گنجائش ہے۔

انشورنس میں جمع شدہ رقم پر زکوۃ:

کار، دوکان اور کاروبار کے انشورنس میں جو رقم جمع کی جاتی ہے اس کی واپسی حتمی اور یقینی نہیں ہوتی، اس لئے اس پر زکوۃ واجب نہ ہوگی؛ البتہ لائف انشورنس (زندگی کا بیمہ) کی رقم بہر حال واپس ملتی ہے؛ اس لئے اس میں جمع شدہ اصل رقم ملنے کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب ہوگی، یہ دینِ قوی کے درجہ میں ہے، اور اصل رقم سے بڑھ کر جو رقم ملنے والی ہے وہ چوں کہ سود اور حرام ہے؛ اس لئے اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔

فتجب زکوتہا اذا تم نصاباً وحال الحول لکن لا فوراً بل عند قبض اربعین درہماً من الدین القوی کقرض۔

(درمختار زکریا ۳،۲۳۶، ومثلہ فی الخانیۃ ۱،۲۵۳، ہندیۃ ۱،۱۷۵، بدائع الصنائع ۲،۹۰)

(ماخوذ ازالمسائل المھمۃ فیماابتلت بھاالامۃ:ج۷)

سوال کا جواب:

واضح رہے: کمپنی سے عقد اجارہ ہوتا ہے جس کا مطلب کمپنی اپنے صارف کو منٹس استعمال کرنے کی سہولت دیتی ہے اور اس کے بدلے اجرت لیتی ہے۔ اجرت در حقیقت وہ رقم ہے جس کے ذریعے صارف بیلنس کارڈ خرید کر اپ لوڈ کرتا ہے، ظاہر سی بات ہے وہ پیسہ ہے اس کے عوض آپ کو سہولت ملتی ہے، جو کہ مختلف الجنس ہونے کی بناپر درست ہے۔ اب یہ کہنا کہ بیلنس بیلنس کے مقابلہ میں کٹتا ہے جو کہ متحد الجنس ہونے کی وجہ سے درست نہیں ہونا چاہیے؟ تو اس کا جواب یہ ہے، کہ در حقیقت یہ اجارہ رقم کی ہے، اس کے ضمن میں بیلنس کٹتا ہے، اور آپ یہ بھی کہہ سکتے ہو، کہ جب آپ نے کارڈ خریدا تو اس میں سے پچیس روپے کم ہوگئے، کیونکہ یہی کارڈ اگر کسی اور سم میں اپ لوڈ کریں گے تو بیلنس نہیں کٹتا ہے، جب کہ قرض لی گئی سم سے بیلنس کٹتا ہے، تو اس کا

مطلب یہی ہوگا کہ کمپنی کی طرف سے پہلے ہی سے آپ سے بیلنس کے عوض میں رقم کٹ گئی ہے، جس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے، جب آپ کارڈ اپ لوڈ کرتے ہو۔

یاد رہے:

کمپنی کی طرف سے لکھے ہوئے میسج سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ بیلنس بمقابلہ رقم ہے، جو کہ مختلف الجنس ہونے کی بنا پر جائز ہے ۔قرض لینے کا میسج یوں لکھا ہوتا ہے: آپ 25 کا زونگ فوری لون حاصل کریں sR.3.5 میں جو اگلے recharge پر لاگو ہوں گے۔

"(أما تفسيرها شرعا) فهي عقد على المنافع بعوض، كذا في الهداية."

(الفتاوی الهندیہ :کتاب الاجارہ، الباب الأول فی تفسیرالاجارہ ورکنهاوالفاظہا)

"وإذا عرف أن الإجارة بيع المنفعة....."

(البدائع:فصل فی رکن الاجارۃ ومعنابا)

مدت کا مجہول ہونا:

مجہول مدت کا اس وقت اعتبار ہوتا ہے، جب طرفین کے آپس میں اختلاف اور یا جھگڑا کرنے کا احتمال ہو، بصورت دیگر وہ مدت مجہولہ قابل برداشت ہے، جس میں اختلاف اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے۔

(تفصیل کے لیے فتاوی عالمگیری: ج۴، ص۱۱۴)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- مشترکہ کاروبار میں بڑے بھائی کا حج آدا کرنا
- مشترکہ کاروبار میں ایک بھائی کی شادی کا خرچہ
- مشترکہ کاروبار میں بھتیجے کی محنت
- ہر بیٹے کا پیشہ کاروبار مختلف ہو، تو تقسیم عمل
- جدید مواصلاتی ذرائع سے قتل کا ثبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علماء کرام درج ذیل مسائل کے بارے میں کیافرماتے ہیں :

1۔۔۔مشترکہ کاروبار میں چندبڑے بھائیوں نےفریضہ حج آداکیا،جب کہ دیگربھائیوں نے فریضہ حج آدانہیں کیاہے۔کیا تقسیم جائیداد کے وقت چھوٹے بھائیوں کابڑے بھائیوں سے فریضہ حج کے اخراجات کا مطالبہ درست ہے ؟

2۔۔۔مشترکہ کاروبار میں چندبھائیوں کی شادیاں ہوئی ہیں،اخراجات بھی مشترکہ سرمایہ سے آداکیے گئے ہیں،جب کہ دیگربھائی غیر شادی شدہ ہیں۔کیاان کا شادہ بھائیوں سے شادی کے اخراجات کا مطالبہ درست ہے ؟

3۔۔۔مشترکہ کاروبار میں ایک بھائی نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادی کی،جب دیگربھائیوں کی اولاد میں کوئی شادی شدہ نہیں ہے۔کیا تقسیم کے دوران ان کے حصہ سے شادی پراخراجات کی رقم کی کٹوتی ہوگی؟

4۔۔۔مشترکہ کاروبار میں بڑے بھائی کے بیٹے (بھتیجے) عرصہ دراز سے کام کررہے ہیں جب کہ دوسرے بھائیوں کے بیٹے چھوٹے ہیں،شروع میں بھتیجوں کے کام کی شرعی حیثیت معلوم نہ کی گئی ہو۔اب تقسیم جائیداد کے وقت عرصہ درازسے کام کرنے والے بھتیجوں کو مشترکہ جائیداد سے حصہ دیاجائے گا؟

5۔۔۔ایک شخص کے چاربیٹے ہیں ،ہرایک کا پیشہ الگ الگ ہیں۔مثلا:ایک دوکان چلاتاہے،دوسرا زمیندارہ کا کام کررہاہے، تیسراسرکاری ملازم ہے۔اور تیسرا تعلیم حاصل کررہاہے ۔کیاوالدکے وفات کے بعد تقسیم جائیداد کے دوران دیگربھائی ملازم کی تنخواہ میں شریک ہیں اور بعد میں ملنے والا پنشن میں شرکاء برابر کے حصہ دار ہوں گے ؟

6۔۔۔جدید مواصلاتی ذرائع قرینہ قاطعہ کے حکم میں ہیں،یانہیں۔۔۔اگرہیں،توکیااس سے حدودوقصاص ثابت ہوں گے ؟

الجواب حامداومصليا

شریعت مطہرہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے،اس کا ہر حکم زندگی کی آسانی اورآسائش کا سامان مہیاکرتاہے،ہمیشہ وہ لوگ ترقی کی راہ پرگامزن ہوئے ہیں ، جنھوں نے ہر مشکل موڑپر شریعت کو سینے سے لگایاہیں۔ہمارے سماج اور معاشرہ میں آئے روزنت نئے مسائل رونماہوتے ہیں ، یہاں تک کہ مشترکہ خاندانی نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) میں رسومات اور غیر شرعی چیزیں سرایت کرگئی ہیں،جس سے مسائل حل ہوئے بغیر زندگی دوبھر ہوگئی ہے،ہرایک اس تگ ودو میں مگن ہے،کہ کسی طرح ہم اس دلدل سے نکل جائے۔۔۔لیکن شریعت کواختیار کیے بغیراس کاازالہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

باپ کی زندگی میں بیٹے کے کام کی نوعیت اوراس کی شرعی حیثیت معلوم ہونی چاہیے،کہ وہ کس بنیادپروالد کا ہاتھ بٹھاتاہے ؟ کیاوہ شریک ہے۔۔۔یامعاون اور۔۔۔یااجیر ؟اسی طرح والد کے انتقال کے بعد بھی ہر بھائی اور بہن کا شرعی حصہ متعین ہوناچاہیے اورمشترکہ کاروبارکی صورت میں ہرایک کی شرعی حیثیت معلوم کرنی چاہیے۔عربی کامشہورمقولہ

ہے :تعاملوا کالاجانب،تعاشروا کالاخوان۔اس وقت چشم پوشی کا معاملہ ہے اور بعد میں گھمبیر اور نہ ختم ہونے والے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لہٰذا بھائی کا بھائی کے ساتھ کاروبار میں شرکت ،مضاربت ،اجارہ اور یا محض تعاون کی تعین ضروری ہے۔۔۔بہر حال مسلمانوں کے دین سے دوری رسومات پر چلنے سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں،ان کا ازالہ بھی ایک عالم اور مفتی کی ذمہ داری ہے تاکہ بچی کچی دین پروری ہاتھ سے نہ نکلے۔درجہ ذیل سوالات کے جوابات اور اس کا شرعی نقطہ نظر یوں ہے :

1۔۔۔مشترکہ کاروبار میں چند بڑے بھائیوں کا فریضہ حج آدا کرنا اگر دوسرے بھائیوں کی اجازت اور رضامندی کے ساتھ ہو،تو تقسیم کے وقت حج کے اخراجات کا مطالبہ درست نہیں۔

2,3۔۔۔مشترکہ کاروبار میں چند بھائیوں کی شادیاں اور یا ایک بھائی کے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں دوسرے بھائیوں کی اجازت سے ہوئی ہوں،تو دوران تقسیم شادیوں پر اخراجات کا مطالبہ درست نہیں ہے۔

بصورت دیگر ہر شریک کا تصرف ذاتی شمار ہوگا اور بھائیوں کا مشترکہ سرمایہ سے آدا کی گئی رقم کا مطالبہ درست ہے

"وکل مااستدانہ أحدھم،یطالب بہ وحدہ۔"

(الشامیۃ:ج٦،ص ٣٤٢)

"وماشتراہ أحدھم لنفسہ ،یکون لہ ویضمن حصۃ شرکائہ من ثمنہ اذا دفعہ من المال المشترک....''

(مذکورہ بالاماخذ:ج ٦،ص ٣٤٢)

"سئل فی اخوۃ أربعۃ متفاوضین تزوج اثنان منھم کل زوجۃبمھرمعلوم قضاء من مال مشترک وطالبھماالباقیان بنصیبیھما من ذلک ،ولزم أحدھما دین التجارۃ واستقراض،فھل لھما مطالبتھمابہ ،ومالزم أحدھم من الدین یلزم الباقی۔الجواب: حیث کانوامتشارکین شرکۃ مفاوضۃ،أحدھم من الدین ،یلزم الباقی۔۔۔وللباقین مطالبۃ المتزوجین بنصیبیھما من المھرالذی دفعاہ۔۔۔الاطعام أھلہ وکسوتھم۔۔۔ویرجع الأخر علی المشتری بقدرحصتہ۔"

(تنقیح الحامدیۃ:ج١،ص ٩٥)

(کذا فی فتاوی دارالعلوم دیوبند:شرکت اوربٹوارہ کابیان:52/13)

"اذابذر بعض الورثۃ الحبوب المشترکۃباذن الکبار أو وصی الصغارفی الارض المورثۃ ،تصیرجملۃ الحاصلات مشترکۃ بینھم،وأما لوبذر أحدھم بغیراذن بقیۃ الورثۃ،فالغلۃللزارع فقط۔۔ولکن لوبذر أحدھم لنفسہ،فالحاصلات لہ خاصۃ،لکنہ یضمن لبقیۃالورثۃ حصتھم ممانقصت الأرض بزراعتۃ۔"

(المجلہ:مادہ ١٠٨٩)

اور شرکت ملک کا قانون :

وکل منھماأجنبی فی نصیب الآخرحتی لایجوز التصرف فیہ الاباذن الآخر،کغیرالشریک؛لعدم تضمنھما الوکالۃ.....

(مجمع الأنھر،کتاب الشرکۃ:543/2ط:دارالکتب العلمیۃ،بیروت)

(ماخوذازدارالعلوم دیوبند : شرکت اور بٹوارہ کابیان : 52/13)

واضح رہے :

باپ کے انتقال کے بعد بھائیوں کے درمیان عموماشرکت ملک ہوتی ہے،اس شرکت میں ہرایک دوسرے کے حصہ میں اجازت کے بغیر اجنبی ہوتاہے۔تاہم ایک شریک کی رضامندی اوراجازت سے دوسرے شریک کاتصرف کرنادرست ہے۔اورشرکت عنان میں اگرچہ شریک کی طرف سے مشترک مال میں تصرف کااختیار رکھتاہے،تاہم ہر وہ تصرف جومشترکہ تجارت سے تعلق نہ رکھتاہو،اس کاخرچہ وہ خود برداشت کرے گا،البتہ اگرشریک اجازت دے اوریاراضی ہو،توحرج نہیں ہے۔

کچھ ایسے قرینے ہیں جن کی اجازت عرف پرمبنی ہے۔جب کہ بڑے اخراجات کا اجازت لیے بغیرنہ عرف میں قابل برداشت ہیں اورنہ ہی شریعت اجازت دیتی ہے۔

"وعن أبي يوسف رحمه الله تعالى إذا مرض أحد الشريكين أو سافر أو بطل فعمل الآخر كان الأجربينهما ولكل واحد منهما أن يأخذ الأجر وإلى أيهما دفع الأجر برئ وإن لم يتفاوضا وهذا استحسان كذا في فتاوى قاضي خان ـ"

(الفتاوی الهندیهة:ج٢،ص٣٢٩،الباب الرابع فی شرکةالوجوه)

4۔۔۔مشترکہ کاروبارمیں بڑے بھائی کے بیٹے (بھتیجے) اپنی شرعی حیثیت معلوم کریں،کہ وہ کس بناپر والداورچچاکے ساتھ سرمایہ کاری کرتے ہیں۔کیاوہ شرکاء ہیں،یااجیر۔۔۔۔اوریامعاونین۔۔۔؟تاکہ اسی کے مطابق حق دیاجائے۔لیکن اگرسوال کے مطابق کوئی حیثیت متعین نہ تھی ،تو عرف قرینہ ہوگا۔ہمارے ہاں وہ صرف معاونین شمارہوں گے۔لہٰذادوران تقسیم مشترکہ جائیداد میں ان کا مستقل حصہ نہ ہوگا۔البتہ اگرچچااخلاقی طورپرکچھ رکھناچاہے توحرج نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے : مشترکہ خاندانی نظام)

البتہ اگربھائی نے اپنے بیٹے کے حصہ کا مطالبہ کیا(جب کہ دوران عقدکچھ طے نہ ہواتھا)اوردوسرابھائی یہ کہہ کرمسترد کرتاہے،کہ بھتیجے کا حصہ باقاعدہ طورپرمقررنہیں ہواتھا،میں صرف محنت کی اجرت دینے پر راضی ہوں ،تواجرت مثل پر فیصلہ ہوگا۔

(تفصیل کے لیے : فتاوی حقانیہ : کتاب الشرکۃ)

5۔۔۔چاروں بھائی اگرچہ مختلف کاروبارکرتاہو،تاہم یہ سارے شریک ہےاورملازم کاوصول شدہ تنخواہ بھی مشترکہ مال کا حصہ ہوگا۔البتہ پنشن حکومت کی طرف سے ایک عطیہ ہے،جوملازم کی فی الحال ذاتی ملک نہیں ہے۔اوریہ حکومت کی صوابدیدپر مبنی ہے،جس سے دیناچاہے۔تاہم اگرملازم نے اپنی مرضی سے اوریابھائیوں کے کہنے سے اس کو شرکت کاحصہ بنایا،تودوسرے بھائی وصول شدہ تنخواہ کے علاوہ پنشن میں شریک ہوں گے۔

"لو اجتمع إخوة يعلمون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي ا هـ وفي الخانية زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم وإن أقروا أنه كان يوم موته فهو ميراث من الأب."

(الشامية :مطلب **:اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت ج۴،ص ۳۲۵)**

"وفي الخانية: زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير، فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته: إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم، وإن أقروا أنه كان يوم موته فهو ميراث من الأب. (قوله: بإعانة صاحبه) سواء كانت الإعانة بعمل كما إذاأعانه في الجمع والقلع أو الربط أو الحمل أو غيره أو بآلة، كما لو دفع له بغلا أو راوية ليستقي عليها أو شبكة ليصيد بها حموي وقهستاني ."

(الشامیہ:فصل فی الشرکہ الفاسدہ،ج ۴،ص ۳۲۵)

کہ والد کی زندگی میں اور والد کے انتقال کے بعد سب بھائیوں نے جو بھی اجتماعی یا انفرادی طور پر کاروباری محنتیں کی ہیں، وہ مشترک سمجھ کر کی ہیں اور اس کی آمدنی میں سب بھائیوں کا حصہ ہوگا، اور یہ صورت اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ حسبِ حصصِ شرعیہ ہر وارث کا حصہ الگ اور متعین نہ ہو جائے۔

(کفایت المفتی ۳۰۹،۹، فتاویٰ رحیمیہ ۵۴۷،۱۰)

’’سئل في إخوة خمسة سعيهم وكسبهم واحد وعائلتهم واحدة حصلوا بسعيهم وكسبهم أموالاً، فهل تكون الأموال المذكورة مشتركة بينهم أخماسًا؟‘‘

(بحوالہ : کتاب النوازل: ج ۱۸، ص ۱۴۱)

یہاں تک کہ ایک ملازم کی دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو پنشن دینے میں بھی حکومت خود مختار ہے۔ مرنے کے بعد گورنمنٹ کی طرف سے جو پنشن ملتی ہے یہ میت کے ترکہ میں شمار نہیں ہے؛ بلکہ سرکار کی طرف سے محض تبرع واحسان ہے؛ لہٰذا قانوناً جس کے نام یہ پنشن آتی ہو وہی اُس کا مالک ہے، دوسرے لوگ شرعاً وقانوناً اُس کے حق دار نہیں ہیں۔ صورتِ مسئولہ میں جب کہ بڑی بیوی کے نام پر پنشن جاری ہے تو چھوٹی بیوی کو اُس میں سے لینے کا حق نہ ہوگا۔

(مستفاد: امداد الفتاویٰ ۳۴۲،۴)

لأن التركة ما تركه الميت من الأموال صافيًا عن تعلق حق الغير بعين من الأموال.

(ردالمحتار، کتاب الفرائض: ۷۵۹،۶ ،ط: دار الفکر بیروت)

(بحوالہ ،کتاب النوازل: ج۱۸، ص ۳۳۶)

6۔۔۔ جدید مواصلاتی ذرائع نہ ہر وقت قرینہ قطعیہ کے حکم میں ہیں اور نہ ہی اس سے ہر حال میں نظر انداز کیا جائے گا۔

شریعت مطہرہ میں ایک طرف حدود وقصاص کو ادنی شبہ سے ساقط کرنے کا حکم دیا ہے، یہاں تک کہ شریعت مطہرہ میں عورتوں کی چشم دید گواہی بھی قابل قبول نہیں ہے، چہ جائیکہ جدید ذرائع پر فیصلہ کیا جائے۔اور محض گواہی بھی قابل قبول نہیں ہے، بلکہ گواہ بھی عاقل، بالغ ،دیانت دار، گواہی دینے کی وجہ دشمنی اور یا محض نفع حاصل کرنے کی بنیاد پر نہ ہو۔

قال فی " الھندیۃ":

"أماالثانی فانواع:ما یرجع الی الشاھد،وھوالعقل،والبلوغ والحریہ،والبصر،والنطق،وأن لایکون محدودافی قذف عندنا،وأن یشھدللہ تعالی ،ولایجرالشاھدالی نفسہ مغنما،ولایدفع عن نفسہ مغرما،وأن یکون عالما بالمشھودبہ ،لاعندھما۔ھکذافی البدائع۔"

(450/3 ط:رشیدیہ)

"عن ابن عباس رضی اللہ عنھماعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:لویعطی الناس بدعواھم لادعی ناس دماء رجال وأموالھم،ولکن الیمین علی المدعی علیہ رواہ مسلم ۔۔۔عن ابن عباس رضی اللہ عنھما مرفوعا:لکن البینہ علی المدعی والیمین علی من أنکر۔"

(مشکواۃ المصابیح،باب الأقضیۃ)

"قال النووی:

ھذالحدیث قاعدہ شریفہ کلیہ من قواعد أحکام الشرع ففیہ أنہ لایقبل قول الانسان فیمایدعیہ بمجرددعواہ،بل یحتاج الی بینہ أو تصدیق المدعی علیہ۔"

(مرقاۃ المفتاتیح:ج۷،ص ۲۵۰،ط:متکبہ امدادیہ،ملتان)

جب کہ دوسری طرف بہت سارے قرینوں کے ذریعے حدود وقصاص وغیرہ کے فیصلہ مرتب کیے گئے ہیں۔

لیکن یاد رہے ،وہ محض قرینہ نہیں ہوتا ہے بلکہ قطعی اور یقینی ہوتا ہے، جس سے اٹھنے والا احتمال بغیر کسی دلیل کے ہوتا ہے (اصول فقہ کی اصطلاح میں :الاحتمال غیر ناشئی عن دلیل) اس قرینہ پر قطعی حکم لگے گا۔مثلا: قاتل مقتول کے گھر سے نکلے، اس کے ہاتھ میں خون لگے اوزار ہو، گھر میں اس کے علاوہ کوئی ایک نہ ہو اور مقتول تازہ خون سے لت پت ہو، یا قاتل کے گھر سے نکلے سے خون کے ٹپکتے قطرے ہوں۔تو اس وقت اس کو قاتل سمجھا جائے گا۔اور یہ کہنا: کہ شاید اس دوران کوئی اور دیوار پھلانگ کر کے آیا ہو، قابل سماعت نہ ہوگا۔یا جیسا کہ ایک غیر شادی شدہ خاتون کا حمل ظاہر ہو، تو اس سے وہ زانیہ ہی شمار ہوگی۔یا جیسا کہ سیدنا حضرت یعقوب علی نبینا وعلیہ الصلوہ والسلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قمیص پر خون کے نشانات دیکھے ،لیکن باوجودیکہ قمیص کئی سے پھٹا ہوا نہ تھا، تو آپ علیہ السلام نے بیٹوں پر جھوٹے ہونے کا الزام لگایا۔اسی طرح غزوہ بدر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قتل ابی جہل اور مال غنیمت کا فیصلہ تلوار پر لگے خون سے

کیا۔یا جیسا کہ :خاتون نے ایک مرد پر زنا کا الزام اس طرح لگایا، کہ انڈہ کی سفیدی اپنے کپڑوں اور رانوں پر مل لیااور یوں حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں زنا کا فیصلہ دائر کیا،جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرم پانی ڈالنے سے وہ سفیدی جم گئی سونگنے سے انڈہ کی بوآنے لگی ،جس سے اس کا کیس خارج کردیا۔

"القضاء بالقرينة القاطعة : القرينة لغة : العلامة ، والمراد بالقرينةالقاطعة في الاصطلاح ما يدل على ما يطلب الحكم به دلالة واضحة بحيث تصيره في حيزالمقطوع به ، كما لو ظهر إنسان من دار ، ومعه سكين في يديه ، وهو متلوث بالدماء ، سريع الحركة ، عليه أثر الخوف ، فدخل إنسان أو جمع من الناس في ذلك الوقت ، فوجدوا بها شخصا مذبوحا لذلك الحين ، وهو متضمخ بدمائه ، ولم يكن في الدار غير ذلك الرجل الذي وجد على الصفة المذكورة وهو خارج من الدار ، فإنه يؤخذ به ، إذ لا يشك أحد في أنه قاتله واحتمال أنه ذبح نفسه ، أو أن غير ذلك الرجل قتله ثم تسور الحائط وهرب ، ونحو ذلك ، فهو احتمال بعيد لا يلتفت إليه ، إذ لم ينشأ عن دليل . ولا خلاف بين فقهاء المذاهب في بناء الحكم على القرينة القاطعة ، مستدلين بالكتاب والسنة وعمل الصحابة :على الأثر في السيف .وأما عمل الصحابة ، فمنه حكم عمر رضي الله عنه برجم المرأة إذا ظهر بها حمل وليس لها زوج . وجعل ذلك يقوم مقام البينة في أنها زانية ، وكذلك السكران إذا قاء الخمر ."

(القضاء بالقرينہ القاطعہ:244/1)

جدید مواصلاتی ذرائع میں شبہ بہرحال ہے،کیونکہ یہ مشینری بھی انسانی دماغ کی ایجادہے،جس میں غلطی کا امکان بہرحال موجودہے۔اور پھر خاص کرجب اس میں جعل سازی کے احتمالات میں بھی کافی حدتک ہوں،توحدودوقصاص کے نافذنہ ہونے کے لیے ادنی شبہ بھی کافی ہے۔تاہم ان ذرائع سے تائیدحاصل کی جاسکتی ہے۔مثلا: قتل کے موقع میں پانچ بندے پکڑے گئے ہیں ،جن کا قتل کرنا یقینی ہے،لیکن متعین نہیں ہے،تو اس وقت ڈی این اے ٹیسٹ سے مدد لی جاسکتی ہے۔یاایسے معاملے میں جہاں کسی حکم کے ثبوت کا کوئی یقینی ذریعہ تصدیق یاتردیدنہ ہو،توجدیدآلات کے ذریعہ سہارالیاجاسکتاہے۔مثلا:بے گناہ بندے پر قتل کا الزام لگایا گیا،تو فنگرپرنٹس ،یافرانزک ٹیسٹ کے ذریعے قاتل ثابت نہ ہوسکا،توبری قرار دیا جائے گا۔اورخاص کرزنامیں چارگواہوں کا ملنابہت مشکل ہے اورویسابھی زنا کاارتکاب انتہائی خفیہ مکان پر کیاجاتاہے،سابقہ ادوارمیں بھی زنا کی ثبوت اقرار کے تحت ہوئی ہے ،جب کہ آج کے دور میں کون اقرار کرے گا۔۔۔۔؟اس سے مزید عورت ظلم اور تشدد کا نشانہ بنتی رہے گی ۔لہٰذاجدید مواصلاتی ذرائع سے مجرم کو تعزیری سزادی جائے گی۔

(تفتیش جرائم اوراسلام: ص ۳۰۷)

لہٰذاجہاں عینی شہادتیں ،یااعتراف جرم ہو،تواس وقت جدید مواصلاتی ذرائع پر عمل نہ ہوگا،لیکن جہاں نہ عینی شہادتیں ہوں اورنہ ہی اعتراف جرم ہو۔۔۔۔اوریاعین موقع پر گرفتار کیے ہوئے مجرموں کی تعدادزیادہ ہوں،البتہ خاص مجرم معلوم نہ ہو،یازچگی سینٹراوریاکسی اور حادثہ میں بچوں کی شناخت کا پتہ نہ چلے،تواس وقت مظلوم کی دادرسی کی خاطرجدید مواصلاتی ذرائع سے تائیدحاصل کی جائے گی۔

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزئی۔

- بھائیوں کے درمیان شرکت کی کونسی قسم

کیاملازم بھائی کی تنخواہ بھی شرکت کا حصہ ہے؟

- ملازم کا تنخواہ سے کچھ رقم الگ محفوظ کرنا
- آسمانی آفت سے خریداہوا تباہ شدہ باغ
- خریداہوا تباہ شدہ باغ کا کچھ حصہ بچ گیا
- کھڑی فصل کو سیلاب سے نقصان پہنچا

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

مشترکہ خاندانی نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) میں تین بھائی شریک ہیں۔ایک تاجر، دوسرا زمیندار اور تیسرا حکومتی ملازم ہے۔اور تینوں مشترکہ طور پر اخراجات برداشت کرتے ہیں:

1۔۔۔ازروئے شرع ان کے درمیان کونسی شرکت ہے؟

2۔۔۔کیا ملازم کی تنخواہ بھی مشترکہ مال کا حصہ ہے؟

3۔۔۔اگر ملازم دوران ملازمت تنخواہ سے مخصوص مقدار اپنے پاس جمع کرتا رہے، تو دوران تقسیم جمع شدہ رقم میں دیگر بھائیوں کا حق ہوگا؟

4۔۔۔اگر جمع کی ہوئی رقم ملازم کی ہے کیا ملازم بھائی کے لیے دوسرے بھائیوں کو دوران شرکت یہ بتانا لازم ہے کہ میں تنخواہ سے کٹوتی کرتا ہوں؟

مالک باغ نے اپنا باغ کسی ٹھیکہ دار کو بیچا، ٹھیکدار نے پوری یا بعض رقم ادا کی۔فروختگی کے دوران قدرتی آفت (سیلاب) کی وجہ سے نقصان ہوا ہے اب پوچھنا یہ ہے کہ:

5۔۔۔یہ نقصان ٹھیکدار کا شمار ہوگا یا مالک باغ کا؟ یعنی ٹھیکدار کے لیے مالک باغ سے نقصان کے ازالے کے لیے رقم چھوڑنے کا مطالبہ شرعا درست ہوگا، یا نہیں؟ جب کہ باغ مکمل یا جزوی طور تباہ ہوا ہے۔اسی طرح مالک باغ کے لیے ٹھیکدار سے باقی ماندہ رقم کا مطالبہ جائز ہوگا یا نہیں؟ جب کہ ٹھیکدار کے پاس منڈی میں فروخت کرنے کے لیے کچھ نہیں؟

6۔۔۔بعض جگہ مالک باغ سے رقم کم کرواکر ٹھیکدار قدرتی آفت کے بعد باقی ماندہ فصل بھی لیتا ہے اور مالک باغ کو اس کا عوض نہیں دیتا ہے، کیا ایسا شرعا جائز ہے؟

الجواب حامداومصلیا

شریعت مطہرہ ہمارے لیے مشعل راہ ہے، اس کا ہر حکم زندگی کی آسانی اور آسائش کا سامان مہیا کرتا ہے، ہمیشہ وہ لوگ ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں، جنہوں نے ہر مشکل موڑ پر شریعت کو سینے سے لگایا ہیں۔ہمارے سماج اور معاشرہ میں آئے روز نت نئے مسائل رونما ہوتے ہیں، یہاں تک کہ مشترکہ خاندانی نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) میں رسومات اور غیر شرعی چیزیں سرایت کرگئی

ہیں، جس سے مسائل حل ہوئے بغیر زندگی مزید دوبھر ہوگئی ہے، ہر ایک اس تگ ودو میں مگن ہے، کہ کسی طرح ہم اس دلدل سے نکل جائے۔۔۔؟ لیکن شریعت کو اختیار کیے بغیر اس کا ازالہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اور یہ بھی یاد رہے: کہ سابقہ ادوار میں شرکت کی انتہائی سادہ صورتیں تھیں، موجودہ ترقی یافتہ معاشی دور میں ایسے مسائل درپیش ہوتے ہیں، جن کی عملی شکلیں پہلے دور میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں۔ انہی مسائل میں سے ایک مسئلہ بھائیوں کی شراکت کی ہے، جن کی شکل مثلا یہ ہے: کہ تین بھائی آپس میں شریک ہیں، ان میں سے ایک ملازم ہے، دوسرا تاجر اپنی دوکان چلاتا ہے اور تیسرا زمیندار ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں اس کی چند صورتیں بنتی ہیں:

- ❖ زمین اور دوکان باپ کا ترکہ ہو، تو باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں کی یہ شرکت شرکت ملک کہلاتی ہے، شرکت ملک میں تمام شرکا برابر شریک ہیں اور ہر ایک دوسرے کے حصہ میں اجنبی ہے، یعنی کوئی ایک دوسرے کی اجازت کے بغیر اس کے حصہ میں تصرف نہیں کر سکتا ہے۔

اور شرکت ملک کا قانون:

وکل منهماأجنبی فی نصیب الآخرحتی لایجوز التصرف فیہ الاباذن الآخر،کغیرالشریک؛لعدم تضمنهما الوکالۃ-----

(مجمع الأنهر،کتاب الشرکۃ:543/2ط:دارالکتب العلمیۃ،بیروت)

(ماخوذازدارالعلوم دیوبند: شرکت اور بٹوارہ کا بیان: 52/13)

<u>شرکت ملک کا حکم:</u>

شرکت ملک میں مال تمام ورثا کے درمیان برابر تقسیم ہوگا۔

"لو اجتمع إخوة يعلمون في تركة أبيهم ونما المال فهو بينهم سوية ولو اختلفوا في العمل والرأي ا هوفي الخانية زوج بنيه الخمسة في داره وكلهم في عياله واختلفوا في المتاع فهو للأب وللبنين الثياب التي عليهم لا غير فإن قالوا هم أو امرأته بعد موته إن هذا استفدناه بعد موته فالقول لهم وإن أقروا أنه كان يوم موته فهو ميراث من الأب."

(الشامية :مطلب :اجتمعا في دار واحدة واكتسبا ولا يعلم التفاوت ج۴،ص ۳۲۵)

- ❖ البتہ ملازم کی تنخواہ جب درمیان میں شامل ہوگئی اور پھر باقاعدہ صراحۃ یا دلالۃ عقد شرکت طے پایا گیا، جس سے شرکت بحکم عنان ہوگئی۔ عنان میں کافی وسعت ہے، نہ سرمایہ کی برابری، نہ کاروبار کا اتحاد اور نہ ہی تمام شرکا کا کام کرنا ضروری ہے اور اس پر مزید یہ ہے کہ ملازم نے جب اپنی تنخواہ مال مشترکہ میں جمع کی، تو جمع شدہ تنخواہ بھی مشترکہ سرمایہ میں مال کی حیثیت اختیار کر گئی۔

سئل فی اخوۃخمسۃسعیھم وکسبھم واحد،وعائلتھم واحدۃ حصلوا بسعیھم وکسبھم اموالا،فھل تکون الاموال المذکورۃ مشترکۃ بینھم اخماسا۔(الجواب)ماحصلہ الاخوۃ الخمسۃ بسعیھم وکسبھم یکون بینھم اخماسا۔

(تنقیح الحامدیۃ: ج۱،ص ۹۵،ط:رشیدیہ)

یادرہے:عبارت میں جو**کسبھم واحد**کی قیدہے،یہ قیدِاتفاقی ہے،احترازی نہیں ہے۔اوریایہ سابقہ دورپر مبنی ہے۔دورِحاضر کی جدید تجارتی شکلوں میں یہ ایک اتفاقی قید کی حیثیت اختیار کر گئی۔

نوٹ:شرکت عنان کی تعریف اور شرائط کتب فقہ میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

- اوراگرباپ کا کوئی ترکہ نہ ہو،بھائیوں نے الگ الگ محنت کی ہو،کسی نے زمین خریدی ہو،اس پر کاشت کی ہو،دوسرے نے دوکان خریدی ہواوروہ اس کو چلارہاہو،جب کہ تیسراملازم ہو۔اب یہ تینوں آپس میں شریک ہوناچاہتے ہیں تو یہ شرکت فاسدہ ہوگی۔

اورشرکت فاسدہ کا حکم یہ ہے،کہ اگر ہرشریک کا حصہ معلوم ہو اوراس کاآمدن جداہوسکتا ہو،تووہ اپنی کمائی کا مالک ہے۔اوراگرآمدن کاجداکرناممکن نہ ہو،توہرایک منافع اور نقصان میں برابرشریک ہوگا۔

فاذاکان سعیھم واحدا ولم یتمیزماحصلہ کل واحدمنھم بعملہ ،یکون ماجمعوہ مشترکا بینھم بالسویۃ ،وان اختلفوا فی العمل والرای کثرۃ وصوابا۔

(ردالمحتار:کتاب الشرکۃ،مطلب فیمایقع کثیرا۔۔ج ٦،ص ۳۴۲)

(ماخوذازدارالعلوم دیوبند:شرکت اور بٹوارہ کابیان:ج ۱۳،ص ۹۰)

فی زوج امراۃ وابنھااجتمعا فی داروا‌حدۃ ،واخذ کل منھما یکتسب علی حدۃ ،ویجمعان ولایعلم التفاوت ولاالتساوی ولاالتمیز،فاجاب:بانہ بینھما سویۃ ،

(الشامیۃ:کتاب الشرکۃ الفاسدۃ)

(ماخوذازدارالعلوم دیوبند:شرکت اور بٹوارہ کابیان:ج ۱۳،ص ۹۰)

عبارت مذکورہ بالاسے معلوم ہواکہ ملازم کا تنخواہ مشترکہ سرمایہ میں جمع کرنے سے پہلےکچھ رقم اپنے پاس رکھنا بوجہ شرکت فاسدہ کے ملازم ہی کاحق بنتاہے۔کیونکہ عربی عبارتوں میں جمع کا لفظ استعمال ہواہے،یعنی شرکت اس وقت معتبر سمجھی جائے گی ،جب وہ اپنا کمایاہواسرمایہ جمع کرے۔لیکن باپ کاترکہ زمین اوردکان کی صورت میں موجودہو،توباپ کے مرنے کے بعدبھائیوں نے ملازم کو کاروبارسے اس لیے دست بردار کیاہے،کہ وہ دوسرے ذریعہ (ملازمت) سے سرمایہ جمع کررہاہے،اس لیےملازم بھائی کو تنخواہ سے رقم کاٹنادرست نہیں ہے،کیونکہ :

- اگرملازم یاتاجراوریا کوئی اور بھائی کچھ رقم بتائے بغیر منہاکر کے بقیہ رقم مشترکہ سرمایہ میں جمع کرے،تواس پر دیگر شرکاہر گزراضی نہ ہوں گے۔
- دوسرا یہ ہے کہ ہر بھائی ایک دوسرے کے سہارے پر شرکت کر رہاہے ،اب اگر کوئی شریک یاملازم تنخواہ سے کچھ رقم اپنے پاس رکھے، توپھر شرکت کی اصل حکمت فوت ہو جائے گی۔
- تیسرا یہ ہے کہ اس میں ایک شریک کااطلاع دیے بغیر کم روپیہ دینا،جب کہ دوسرے کازیادہ رقم جمع کرنے سے الزام تراشی اور جھگڑے کی نوبت ضرور آئے گی۔
- چوتھاہمارے عرف میں یہ معیوب سمجھاجاتاہے، بعد میں طعنہ دیاجاتاہے کہ فلان بھائی نے اتنی رقم چھپائی تھی، جو شرکت کے دوران ظاہر نہیں کی تھی۔

چنانچہ بھائیوں کی مذکورہ شرکت کے حوالے سے فتاوی عثمانیہ میں درج ہے:

''لہٰذاصورت مسئولہ میں اگربھائیوں کے درمیان شراکت مذکورہ بالاقسموں میں سے کوئی ایک ہو،تو تمام جائیداداورمال میں دونوں بھائی مساوی حصہ کے مستحق ہوں گے۔''

(کتاب الشرکہ: ج ۷، ص ۴۲)

''البتہ اگرشروع میں باقاعدہ معاہدے کے تحت کسی عامل شریک کاحصہ زیادہ مقرر کیاجائے ،تو پھراس کو زیادہ حصہ دیناجائزہے۔''

عنوان: مشترکہ خاندانی کاروبار میں حصص کی تقسیم۔۔۔دارالافتاجامعۃ الرشید

''بالائی منزل کی تعمیر کے وقت زیداوراس کے بھائیوں کے درمیان کوئی معاملہ ہواتھایانہیں،اگر کوئی معاملہ ہواہو،تواسے لکھیں اگر کوئی معاملہ نہ ہواہوتوزید بالائی منزل کا تنہامالک ہوگا۔دوسرے بھائیوں کااس تعمیر میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

عنوان: مشترکہ خاندانی نظام میں ذاتی خرچ سے بنائے گئے گھر کی حیثیت۔۔۔۔دارالعلوم دیوبند

1۔۔۔لہٰذا: مشترکہ خاندانی نظام (جوائنٹ فیملی سسٹم) میں تین بھائیوں کی شرکت شروع میں شرکت ملک ہے اور بعد صراحۃ یادلالۃ عقد سے شرکت عنان ہوگی۔

2۔۔۔ملازم کی تنخواہ (باپ کا ترکہ موجود ہو) مشترکہ سرمایہ میں جمع کرنے سے پہلے مشترکہ مال کا حصہ ہے۔

3۔۔۔اگر دوران شرکت ملازم بھائی نے یہ وضاحت کردی ہو، کہ میں اتنی رقم مشترکہ سرمایہ میں جمع کرتا رہوں گا اور یا بھائیوں کی طرف سے اس پر ایک مخصوص مقدار مقرر ہو، تو دوران ملازمت اپنی تنخواہ سے مخصوص مقدار اپنے پاس جمع کرنا ملازم کا حق ہے۔

4۔۔۔جی ہاں ملازم بھائی کے لیے دوسرے بھائیوں کو دوران شرکت یہ بتانا لازم ہے کہ میں تنخواہ سے کٹوتی کرتا ہوں۔

- اور اگر تینوں بھائی کے پاس کوئی سرمایہ نہ ہو اور نہ ہی باپ نے ترکہ چھوڑا ہو، تو اس وقت ان کی یہ شرکت شرکت اعمال ہو گی۔اور منافع میں تمام بھائی برابر شریک ہوں گے۔

واذاعقدواالشركة بان جعلوا عملهم راس اعمال على تقبل العمل من آخر اى تعهده والتزمه وعلى ان يقسمواالكسب الذى سيحصل اى الاجرة بينهم ،فتكون شركة اعمال ۔

(مادہ: ۱۳۳۲)

قال فی دررالحکام:

لايشترط اتحادالاعمال والصنائع فى شركة اعمال ،فتجوزالشركة المذكورة فى الاعمال المختلفةالجنس ايضا۔۔۔

(مادہ: ۱۳۶۸)

باغ اور آفت آسمانی

ذیل میں چند اتفاقی صورتیں لکھی جاتی ہیں، جن پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے:

- ✓ بیع قبل بدوالصلاح اس شرط کے ساتھ ہو، کہ خریدار پھل درختوں پر چھوڑے گا، اس وقت آسمانی آفت سے تباہ شدہ باغ کا نقصان باغ کا مالک برداشت کرے گا۔

نوٹ: فقہا کرام نے عرف کی وجہ سے درختوں پر پھل چھوڑنے کی شرط سے بھی بیع جائز قرار دیا ہے۔لہٰذا اس صورت میں بیع تام اور مکمل ہو گی اور نقصان ٹھیکدار کا شمار ہو گا۔

- ✓ بیع قبل بدوالصلاح، یا بعد بدوالصلاح اس شرط کے ساتھ کہ خریدار درختوں سے پھل توڑے گا، لیکن باغ کے مالک نے خریدار کو قبضہ یا تخلیہ کا موقع نہ دیا، تو اس وقت بھی آسمانی آفت سے تباہ شدہ باغ کا نقصان باغ کے مالک کا ہو گا۔

- ✓ بیع قبل بدوالصلاح، یابعدبدوالصلح ہو ،اور پھر پھل پک جائے ، لیکن توڑنے سے قبل باغ آسمانی آفت سے تباہ ہوجائے تواس وقت آسمانی آفت سے تباہ شدہ باغ کا نقصان خریدار برداشت کرے گا۔

''ان یبیع قبل بدو صلاحہابشرط التبقیۃ علی الاشجار،ثم تصیبیہاآفۃفالحکم فیہاان الآفۃمن ضمان البائع بالاجماع۔۔۔ان یبیعہاقبل بدوالصلاح اوبعدہ بشرط القطع،ولایخلی بینہاوبین المشتری ،ولایقبضہاالمشتری حتی تصیبہاآفۃ فتہلک فالضمان ھھناایضا علی البائع بالاجماع ۔۔۔۔ان یبیعہاقبل بدو الصلاح اوبعدہ ثم یحین الجذاذ،وتصیبہاآفۃ قبل ان یجذہاالمشتری ،فالآفۃ ھھنا من ضمان المشتری بالاجماع۔۔۔۔۔

- ✓ بیع بعدبدوالصلاح بغیرکسی شرط کے پھل درختوں پر چھوڑدیاگیا، پھرآفت سے باغ تباہ ہوگیا، تواس صورت میں اختلاف ہے:

بعض ائمہ (امام احمدابن حنبلؒ ،ابن تمیہؒ اورابن قیمؒ وغیرہ) کا کہناہے: کہ درختوں پر موجود پھل فروٹ پر قبضہ تام نہیں ہواہے جسے مشتری یاٹھیکہ دار کی ملک ناقص ہے۔اس لیے یہ نقصان باغ کے مالک کا شمار ہوگا۔ان کی دلیل یہ ہے:

ان النبی ﷺ امربوضع الجوائح۔

آپ ﷺ نےآسمانی آفت کے سبب نقصان کو معاف کرنے کا حکم دیاہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کاارشادہے:

بم تاخذمال اخیک بغیرحق۔

تم اپنے بھائی کامال ناحق کیوں لیتے ہو۔

(مجموع الفتاوی لشیخ ابن تیمیۃ:ج۲۹،ص۳۸۴)
(صحیح مسلم:المساقاۃ:باب وضع الجوائح)
(اعلام الموقعین:ج۲،ص ۲۹)

جب کہ امام ابو حنیفہ،حضرت لیث بن سعد،امام شافعی فی الجدید،وابو جعفرالطبری،وامام داو،وامام ثوری اورجمھورسلف (رحمھم اللہ) کے نزدیک خریداراورٹھیکہ دار کا نقصان شمار ہوگا۔

''ان یبیعہابعدبدو الصلاح لابشرط القطع ویخلی بینہا وبین المشتری ،ثم تصیبہاآفۃ ،فتہلک وھذاموضع اختلاف بین الفقہائ واختلفوافیہ علی اقوال :الاول:انہ من ضمان المشتری مطلقاوھومذہب ابی حنیفۃ،والیث بن سعد،والشافعی فی الجدید،وابی جعفرالطبری،وداو ،والثوری،وجمھورالسلف(رحمھم اللہ)کمافی عمدۃ القاری۔۔۔۔۔عن ابی سعیدالخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ،قال:اصیب رجل فی عھدرسول اللہ ﷺفی ثمارابتاعہا،فکثردینہ،فقال رسول اللہ ﷺ:تصدقواعلیہ ،فتصدق الناس علیہ،فلم یبلغ ذلک وفائ دینہ ،فقال رسول اللہ ﷺ لغرمائہ :خذواماوجدتم ۔ولیس لکم الاذلک۔۔۔۔ثبت ان الجوائح کان فی یدالمشتری لاتکون واضعۃ عنہ شیئا من الثمن الذی علیہ للبائع۔ابتاع رجل ثمرحائط فی زمان رسول اللہ ﷺ،فعالجہ وقام فیہ

حتی تبین لہ النقصان ،فسال رب الحائط ان یضیع لہ او یقیلہ ،فحلف ان لایفعل ،فذہبت ام المشتری الی رسول اللہ ﷺ ،فذکرت ذلک لہ ،فقال رسول اللہ ﷺ: تالی ان لایفعل خیرا۔ووجہ الاستدلال منہ ان وضع الجائحۃ لوکان واجبا لاجبرہ علیہ ،ولکن النبی ﷺلم یجبرہ علی ذلک ،وانمالامہ علی ترک الاحسان ......فلفظ المعروف والخیریدل علی ان ھذالوضع کان من قبیل الاحسان ،لامن قبیل الوجوب.....والامربوضع الدین ھناک للاستحباب بالاجماع۔''

(تکملۃفتح الملھم،امربوضع الجوائح:ج١،ص ٣٠٩)

''ان یکون الامرللوجوب ،اویکون محمولاعلی ماقبل قبض المشتری؛فان الجائحۃ حینئذ تکون من مال البائع بالاجماع۔''

(تکملۃفتح الملھم،امربوضع الجوائح:ج١،ص ٣٠٩)

''اماھلاکہ اوتعییبہ بافۃ سماویۃ فھو ضمان المشتری،کلماکان البیع صحیحالازما؛لان الضمان ینتقل بالعقد،ولولم یقبض المشتری المبیع۔''

(الموسوعۃ الفقہیۃ :ھلاک البیع اوالثمن المعین کلیا اوجزئیا قبل التسلیم۔ص٣٦،ج١٠)

''واختلفوا فیمااذاا صابت الثمارجائحۃ ۔فقال ابوحنیفۃؒوالشافعیؒ فی احدقولیہ ،وھو اظہرھما جمیع ذلک من ضمان المشتری ،فلایجب لہ وضع شیئ منھا۔وھذالمسئلۃ مثبۃ علی اختلافہم فیمااذا الآفۃ الثمرۃ بعدان یخلی البائع بین الثمرۃ وبین المشتری ،فیقبضھاعلی مذہب ابی حنیفۃؒ والشافعیؒ واحمدؒ سوا کانت الثمرۃ مماتحتاج الی التبقیۃ اولم تکن۔۔۔''

(اختلاف الائمۃ العلما:باب بیع الاصول :ج١،ص ٣٨٢)

''یملک المشتری المبیع ،ویملک البائع الثمن ،ویکون ملک المشتری للمبیع بمجردعقدالبیع الصحیح،ولایتوقف علی التقابض ،وان کان للتقابض اثرہ فی الضمان ۔''

(الموسوعۃ الفقہیۃ:الآثارالمرتبۃ علی البیع:ج٩،ص ٣٦)

''اذاھلک المبیع کلہ بعدالقبض :ان کان بآفۃ سماویۃ اوبفعل المشتری او بفعل المبیع او بفعل الاجنبی،فلاینفسخ البیع ،ویکون ھلاکہ علی ضمان المشتری ؛لان المبیع خرج عن ضمان البائع بقبض المشتری ،فتقرر الثمن علیہ ،ویرجع بالضمان علی الاجنبی حال کون الاعتداء منہ ۔''

(الفقہ الاسلامی وادلتہ:ج٥،ص ٣٣٤٦)

''واماالامربوضع الجوائح،فھوعندنا امرند ب بعدالقبض ،وامروجوب قبلہ۔''

(اعلاالسنن،ابواب البیع،باب بیع الثمار:45/14)

لہٰذامذکورہ بالاعبارتوں کی روشنی میں مالک باغ نے اپناباغ کسی ٹھیکہ دار کوبیچا، ٹھیکدار نے پوری یا بعض رقم آداکی۔فرو ختگی کے دوران قدرتی آفت (سیلاب) کی وجہ سے کیاہوا نقصان ٹھیکدار کا شمار ہوگا،مالک باغ کانہیں یعنی ٹھیکدار کے لیےمالک باغ سے نقصان کے ازالے کے لیے رقم چھوڑنے کا مطالبہ شرعادرست ہوگا۔جب کہ باغ مکمل یاجزوی تباہ ہواہے۔اسی طرح مالک باغ

کے لیے ٹھیکدار سے باقی ماندہ رقم کامطالبہ جائز ہوگا اگرچہ ٹھیکدار کے پاس منڈی میں فروخت کرنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔تاہم باغ کے مالک کے لیے کل رقم،یا بعض رقم معاف کر دینا مستحب ہے۔

بعض جگہ مالک باغ سے رقم کم کرواکر ٹھیکدار قدرتی آفت کے بعد باقی ماندہ فصل لینا اورمالک باغ کو اس کا عوض نہ دیناشرعاجائز نہیں ہے۔

البتہ کھیتی باڑی کی صورت میں اجارہ پرلی ہوئی زمین میں جب زراعت مکمل طورپر تباہ ہوجائیں اورزمین قابل کاشت نہ رہیں،تواجیر پرباقی ماندہ مہینوں کی اجرت واجب نہیں ہے۔

''اماان زرعها،فاصاب الزرع آفۃ فهلک الزرع ،او غرقت بعدالزرع ولم ینبت ففی احدی الروایتین عن محمدؒ یکون علیہ الاجر کاملاوالمختارفی الفتوی انہ لایکون علیہ اجرلمابقی من المدة بعدهلک الزرع۔''

(الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ:احکام اجارة الارض الزراعیۃ:ج۱،ص ۲۸۱)

(الفتاوی الهندیۃ:کتاب الاجارة، الباب التاسع عشرفی فسخ الاجارةبالعذر:ج۴،ص ۴۶۲)

(المحیط البرهانی :کتاب الاجارات ،الفصل الثامن عشرفی فسخ الاجارة بالعذر:ج۷،ص ۵۰۸)

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

انتقال وراثت،وتقسیم میراث

کیافرماتے ہیں علماء کرام درجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

محمد زمان ولد گل زمان کا انتقال ہوا، مرحوم کے ورثہ میں آٹھ اولاد : پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں زندہ ہیں لہٰذا مرحوم کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کو ورثا کے نام منتقل کیا جائے اور از روئے شرع ہر وارث کا شرعی حصہ بھی بتائے۔

الجواب حامدا ومصليا

بصورت صدق مسئلہ میت کے انتقال کے وقت ملک میں جتنی چیزیں ہیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، منقولی ہوں یا غیر منقولی جیسے : سوئی ،دھاگہ ،کپڑے، سونا چاندی نقدی وغیرہ، غرض تمام مملوک چیزوں میں میراث جاری ہوتی ہے ،چنانچہ ان میں سب سے پہلے اس کے متوسط اخراجات مثلا تجہیز اور تکفین کی بندوبست کی جائے گی ،بشر طیکہ کسی نے بطور تبرع نہ کیا ہو، پھر اس پر جتنا قرض ہے اس کو اداء کیا جاے گا پھر جتنا ترکہ رہ جائے ،اسکے ایک تہائی میں اسکی وصیت نافذ ہو جائے گی بشر طیکہ مرحوم نے زندگی میں وصیت کی ہو۔بقیہ ترکہ 104 حصوں میں تقسیم کر کے بیوہ (بی بی سعدیہ) کو 13 حصے، بیٹوں میں سے ہر ایک کو 14 حصے، جب کہ بیٹیوں میں سے ہر ایک کو 7 حصے ملیں گے ۔

نوٹ : غیر منقولہ جائیداد میں سے ایک عدد دکان (417 مربع فٹ) جو کہ وزیر محمد روڈ کوئٹہ میں واقع ہے۔

"(قوله بخلاف الميراث) فإنه فيه {للذكر مثل حظ الأنثيين} [النساء: 11]"

(الدرالمختار:ج٦،ص٦٠٠،كتاب الاقرار)

"وأخرج البخاري في صحيحه عن عطاء وابن عباس - رضي الله تعالى عنهم - قال: كان المال للولد، فكانت الوصية للوالدين فنسخ الله ذلك بأحب، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين-----"

(الفتاوى الشاميہ:كتاب الوصايا)

"وفي الميراث يقسم بينهما للذكر مثل حظ الأنثيين--"

(التفتاوى الهنديہ:الباب الرابع فيمن يصح لہ الاقرار)

"وفي الإرث للذكر مثل حظ الأنثيين---"

(البحرائق :باب الاستثناء فى الاقرار)

"ويقسم بينهم للذكر مثل حظ الأنثيين ---"

(فتح القدیر:فصل فی کیفیۃ القسمۃ)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ۔

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

انتقال وراثت،وتقسیم میراث

کیافرماتے ہیں علماء کرام درجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

گوہر بیگم زوجہ سید عبدالصمد کاانتقال ہوا،مرحومہ کے ورثہ میں شوہراورسات اولاد: پانچ لڑکےاور دولڑکیاں زندہ ہیں لہٰذامرحومہ کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کو ورثا کے نام منتقل کیاجائےاورازروئے شرع ہر وارث کاشرعی حصہ بھی بتائے۔

الجواب حامدا ومصليا

بصورت صدق مسئلہ میت کے انتقال کے وقت ملک میں جتنی چیزیں ہیں خواہ چھوٹی ہوں یابڑی،منقولی ہوں یاغیر منقولی جیسے: سوئی،دھاگہ،کپڑے،سوناچاندی نقدی وغیرہ،غرض تمام مملوک چیزوں میں میراث جاری ہوتی ہے،چنانچہ ان میں سب سے پہلے اس کے متوسط اخراجات مثلا تجہیزاور تکفین کی بندوبست کی جائے گی،بشرطیکہ کسی نے بطور تبرع نہ کیاہو،پھراس پر جتنا قرض ہے اس کو اداء کیا جاے گا پھر جتناترکہ رہ جائے،اسکے ایک تہائی میں اسکی وصیت نافذ ہوجائے گی بشرطیکہ مرحومہ نے زندگی میں وصیت کی ہو۔بقیہ ترکہ 48 حصوں میں تقسیم کرکے شوہر (سید عبدالصمد) کو12حصے،بیٹوں میں سے ہرایک کو 6حصے،جب کہ بیٹیوں میں سے ہرایک کو3حصے ملیں گے ۔

"(قوله بخلاف الميراث) فإنه فيه {للذكر مثل حظ الأنثيين} [النساء: 11]"

(الدرالمختار:ج٦،ص٦٠٠،كتاب الاقرار)

"وأخرج البخاري في صحيحه عن عطاء وابن عباس - رضي الله تعالى عنهم - قال: كان المال للولد، فكانت الوصية للوالدين فنسخ الله ذلك بأحب، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين-----"

(الفتاوى الشاميہ:كتاب الوصايا)

"وفي الميراث يقسم بينهما للذكر مثل حظ الأنثيين--"

(التفتاوى الهنديہ:الباب الرابع فيمن يصح لہ الاقرار)

"وفي الإرث للذكر مثل حظ الأنثيين---"

(البحرائق :باب الاستثناء فى الاقرار)

"ويقسم بينهم للذكر مثل حظ الأنثيين ---"

(فتح القدير:فصل فی كيفية القسمة)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیافرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں :

کہ محمد یونس بن دلاور کاانتقال ہو گیا' مرحوم نے ترکہ میں منقولی وغیر منقولی جائیداد چھوڑی ہے۔اور ورثاء میں ایک بیوہ بنام سعدیہ اور تین بیٹیاں بنام رابعہ 'مرحمہ 'رحمتہ اور ایک بہن بنام سراج بی بی چھوڑدی ہے۔

آپ برائے مہربانی حصص کی تعیین کرکے فتوی دے کہ ہم تمام جائیدادان ورثاء کے نام کرنا چاہتے ہیں۔

الجواب حامداومصلیا

میت کے انتقال کے وقت ملک میں جتنی چیزیں ہیں خواہ چھوٹی ہو یابڑی'منقولی ہو یاغیر منقولی جیسے : سوئی 'دھاگہ 'کپڑے 'سوناچاندی نقدی وغیرہ 'غرض تمام مملوک چیزوں میں میراث جاری ہوتی ہے 'چنانچہ ان میں سب سے پہلے اسکے متوسط اخراجات مثلا تجہیزاور تکفین کی بندوبست کی جائے گی 'بشرطیکہ کسی نے بطور تبرع نہ کیاہو' پھراس پر جتنا قرض ہے اس کو اداء کیا جاے گا پھر جتناترکہ رہ جائے 'اسکے ایک تہائی میں اسکی وصیت نافذ ہوجائے گی۔بقیہ ترکہ 72 حصوں میں تقسیم کی جائے ان میں بیوہ کو9 حصے بہن کو15 حصے اور ہر بیٹی کو 16 حصے ملیں گے۔مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق :

نام	حصے	فیصدی
سعدیہ	9	12 . 5
رابعہ	16	22 .22
مرحمہ	16	22 .22
راحمتہ	16	22. 22
سراج	15	20. 83

نوٹ : مذکورہ تقسیم کے مطابق جائیدادورثاء کے نام کیاجائے۔

لمافی ''القرآن المجید'':

(فان کان لکم ولدفلهن الثمن مماترکتم)

وقال ایضا:

(فان کن نساءفوق اثنتين فلهن ثلثاماترک)۔

وفي السراجي في الميراث:

قال علمائنا رحمهم الله تتعلق بتركة الميت حقوق اربعة مرتبة :الاول يبدأبتكفينه وتجهيزه من غير تبذير ولاتقتير ثم تقضى ديونه من جميع مابقي من ماله،ثم تنفذ وصاياه من ثلث مابقي بعد الدين،ثم يقسم الباقي بين ورثته بالكتاب والسنة وإجماع الأمة ۔

(المقدمة:ص5،ط:البشری)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ الحرمزی

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

انتقال وراثت

کیافرماتے ہیں علماء کرام درجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں:

ملک غلام نبی مرحوم نے تقریباآج سے عرصہ تیس (30)سال قبل حاجی عبدالرحیم پر تقریباآدھاایکڑزمین اپنی زندگی میں بیچ دی ،جس کا باقاعدہ ثبوت اور اسٹامپ پیپر بھی موجود ہے(جوکہ شرعی فتویٰ) کے ساتھ لف ہے۔ملک مرحوم کی صرف تین اولاد :ایک لڑکا اور دولڑکیاں ہیں۔جب کہ اس کے ورثہ میں سے صرف ایک بیٹا عبدالولی اور ایک بیٹی بی بی لالی زندہ ہیں،بی بی بودوجہ والدہی کی زندگی میں انتقال کرگئی ہے ،لہٰذاازروئے شرع ہر وارث کا شرعی حصہ کیاہوگا۔

الجواب حامدا ومصليا

ملک غلام نبی کی اپنی زمین زندگی میں فروخت کرنادرست ہے،مالک کوملکیت کی بناپرازروئے شرع ہر قسم کااختیار حاصل ہے۔جب کہ وراثت کی شرعی تقسیم یوں ہوگی:

بعداز تجہیز و تکفین ،وآدائے دین از کل مال ،واجراء وصیت از ثلث مال,مکمل جاءیداد متروکہ کو تین حصوں میں تقسیم کرکے عبدالولی کو دوحصے ملیں گے،جب کہ بی بی لالی کوایک حصہ ملے گا۔

نوٹ: منقولی اور غیر منقولی جائیداد عبدالولی اوربی بی لالی کے نام منتقل کی جائے۔

"(قوله بخلاف الميراث) فإنه فيه {للذكر مثل حظ الأنثيين} [النساء: 11]"

(الدرالمختار:ج٦،ص٦٠٠،كتاب الاقرار)

"وأخرج البخاري في صحيحه عن عطاء وابن عباس - رضي الله تعالى عنهم - قال: كان المال للولد، فكانت الوصية للوالدين فنسخ الله ذلك بأحب، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين-----"

(الفتاوی الشامیہ:کتاب الوصایا)

"وفي الميراث يقسم بينهما للذكر مثل حظ الأنثيين--"

(التفتاوى الهنديہ:الباب الرابع فيمن يصح له الاقرار)

"وفي الإرث للذكر مثل حظ الأنثيين---"

(البحرائق :باب الاستثناء فی الاقرار)

"ويقسم بينهم للذكر مثل حظ الأنثيين ---"

(فتح القدیر:فصل فی کیفیۃ القسمۃ)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ۔

مسائل میراث ٬انتقال وراثت و مجلس تحکیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسئلہ انتقال وراثت

کیافرماتے ہیں علما کرام مسئلہ ذیل کے بارے میں :

سید سراج الدین مرحوم کاانتقال ہوگیاہے،اس کے ورثہ میں سے اہلیہ مسماۃ بی بی رافیہ، چار بیٹے:

(سید نجم الدین، سید قطب الدین ، سید شمس الدین اور سید خلیل احمد) اور دو بیٹیاں (بی بی بختورہ ،بی بی رنگینہ) رہ گئیں ،اس کے بعد مسماۃ رافیہ کاانتقال ہوگیا۔

لہٰذا شریعت کی روشنی میں مذکورہ بالاورثہ کے نام مرحوم سراج الدین کی وراثت منتقل کریں۔

الجواب حامداومصليا

کفن ودفن اور قرض کی آدائیگی مکمل جائیداد سے اور وصیت مرحوم کی ایک تہائی مال (اگر مرحوم نے وصیت کی ہو) سے نکالنے کے بعد تمام منقولی اور غیر منقولی جائیداد کو80 حصوں پر تقسیم کر کے بیٹوں میں سے ہرایک کو16،16حصے،جب کہ بیٹیوں میں سے ہرایک کو8،8حصے دیے جائیں۔

"(قوله بخلاف الميراث) فإنه فيه {للذكر مثل حظ الأنثيين} [النساء: 11]"

(الدرالمختار:ج٦،ص٦٠٠،كتاب الاقرار)

"وأخرج البخاري في صحيحه عن عطاء وابن عباس - رضي الله تعالى عنهم - قال: كان المال للولد، فكانت الوصية للوالدين فنسخ الله ذلك بأحب، فجعل للذكر مثل حظ الأنثيين----"

(الفتاوى الشاميہ:كتاب الوصايا)

"وفي الميراث يقسم بينهما للذكر مثل حظ الأنثيين--"

(التفتاوى الهنديہ:الباب الرابع فيمن يصح لہ الاقرار)

"وفي الإرث للذكر مثل حظ الأنثيين---"

(البحرائق ،باب الاستثناء فى الاقرار)

"ويقسم بينهم للذكر مثل حظ الأنثيين ---"

(فتح القدير:فصل فى كيفية القسمة)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فیصلہ دربیان دعوی اراضی، تقریباآٹھ ایکڑ مشترکہ

حدود اربعہ:

شرقا: روڈ، غربا: ندی، جنوبا: حضرت آقا زمین، شمالا: حاجی شام زمین

فریق اول:

عبدالرحیم ،رحمت اللہ ، قوم عشے زئی، سکنہ کٹوان

فریق دوم:

حضرت آغا، عبدالولی،، محمد ہاشم، امان اللہ، قوم کاکڑ، سکنہ کٹوان

بیان فریق اول:

عبدالرحیم نے ایک ایکڑزمین عبدالولی سے بعوض تین لاکھ پچیس ہزار325000خریدی،اس نے کچھ رقم یکمشت ادا کی ،جب کہ بقایارقم اس شرط پر دی کہ زمین کا معاملہ صاف کیاجائے،تاکہ کل کوئی روکاوٹ نہ بنے،جب عبدالرحیم نے نجیب اللہ نامی شخص جومخالف فریق کارشتہ دار بھی ہے۔ سے یقین دہانی کرائی کہ زمین کے مالکان ایک ایکڑفروخت کرنے پرراضی ہے،اسی اعتماد پراس نے بقایارقم دیدی، لیکن جب زمین کاشت کرنے کے لیے ٹریکٹر چلاناشروع کیا،توباقی شرکاء نے کام روک لیا۔کہ نہ ہمیں اعتماد میں لیاہے اورنہ ہی ہم نے اجازت دی ہے۔لہٰذا عبدالرحیم کاپوچھناہے کہ کیاازروئے شروع میں زمین کامالک ہوں۔

یادرہے:

عبدالرحیم سے جب پوچھاگیا،کہ نجیب اللہ نے کہا: کہ میں نے عبدالرحیم سے صاف کہاکہ وہ زمین دینے پر راضی نہیں ہے۔

توعبدالرحیم نے دوبارہ بیان اس طرح کیا: کہ نجیب اللہ نے فون پر مجھے بتایا،کہ عبدالولی کو بقایارقم کیوں نہیں دیتے ہو؟

میں نے جواباکہا: عبدالرزاق وغیرہ اعتراض کرے گا،جس سے میری خریدی زمین خطرے میں پڑجائے گی ،تو نجیب اللہ نے کہا: عبدالرزاق سے زیادہ قریب ہم ہیں ،لہٰذا کوئی اعتراض نہیں کرے گا،اپنابقایاپیسہ حوالہ کردو،جس کے بعد میں نے بقایارقم دیدی۔بقول عبدالرحیم یہ گفتگو میں نجیب اللہ کے ساتھ فون پر کیاہے۔

بیان فریق دوم:

زمین ہماری مشترکہ ہے ،ہم نے باقاعدہ یہ معاہدہ کیاہے کہ کاکڑ قوم کے علاوہ کوئی بھی کسی اور قوم کے بندے پرزمین فروخت نہ کرے۔لہٰذاعبدالولی نے ہماری اجازت اور تقسیم کیے بغیر مشترکہ زمین سے ایک ایکڑفروخت کی ،لہٰذاہمارامطالبہ ہے کہ ہماری زمین ہمارے حوالہ کی جائے۔ کیاازروئے شرع شریک دیگرشرکاء کی اجازت کے بغیرزمین سے کچھ حصہ فروخت کرسکتاہے۔

بیان گواہ فریق اول:

مولوی حیات اللہ کا کہناہے،کہ زمین عبدالرحیم نے خریدی ،اسٹام پیپر کے دوران میں موجود تھا،کچھ رقم یکمشت دی ،جب کہ بقایا رقم بعد میں دی اوردواسٹام پیپراس لیے لکھے گئے ،کہ ایک پر تاریخ فروخت درج ہے،جب کہ دوسرے پرتاریخ وصول درج ہے دوسرے اسٹام پیپرکا یہ مطلب ہرگزنہیں کہ انہوں نے پہلے خریدوفروخت ایک لاکھ بیس ہزار120000پرکیا،بعد میں اس کو چھپانے کے لیے تین لاکھ پچیس ہزا125000رپردوبارہ عقد کیا۔

مجھے علم ہے کہ زمین مشترکہ ہے ،البتہ یہ معلوم نہیں کہ کون شریک ہے۔

رحمت اللہ نے بھی گواہی دی جس کی گواہی مولوی حیات اللہ کی طرح تھی تاہم انہوں نے باقاعدہ مشترکہ زمین کے شرکاء کے نام بھی ذکر کیے۔

واضح رہے: رحمت اللہ خریدنے میں شریک بھی ہے اور گواہی دینے کا اصرار بھی تھا۔

بیان گواہ فریق دوم:

ملک عبدالرزاق کا کہناہے کہ زمین مشترکہ ہے،میں شفیع ہوں ،ہماری قوم نے باقاعدہ یہ معاہدہ کیاہے کہ غیر قوم کے کسی بھی شخص پرزمین فروخت کرنامنع ہے۔یہ زمین ایک تو مشترک ہے، تقسیم سے قبل عبدالولی نے فروخت کی ،اگریہ لوگ دیناچاہے،تب بھی میں شفع کا دعویدار ہوں۔مجھے پتہ بھی نہیں تھا،کہ عبدالولی نے زمین فروخت کی ، نجیب اللہ اسٹام پیپرلے

کرآیا کہ عبدالرحیم نے کہا زمین حوالہ کرو، جس پر میں نے اعتراض کیا۔اور دوسرا یہ ہے کہ اسٹام پیپر پر لکھا تھا کہ زمین کی قیمت ایک لاکھ 100000 نقد، جب کہ بیس ہزار 20000 ادھار۔اب انہوں نے اس کو چھپایا اور دیگر اسٹام پیپر دکھانا شروع کیا۔

اسی طرح ملک عبدالودود کا کا بھی یہی کہنا ہے، کہ میری زمین اس زمین کے ساتھ متصل ہے، ہم نے باقاعدہ یہ طے کیا ہے، کہ زمین اپنے ہی قوم کے افراد پر بیچی جائے گی۔جب کہ عبدالرحیم نے مشترکہ زمین خریدی ہے جس کی ہم اجازت نہیں دیتے۔

فیصلہ :

فریقین کے بیانات اور گواہوں کے بیانات سننے کے بعد عبدالرحیم کا ایک ایکڑ زمین خریدنا شرعا درست نہیں ہے۔

- ❖ مشترکہ زمین ہے ، تقسیم سے پہلے کسی بھی شریک کو اپنا حصہ فروخت کرنا درست نہیں۔
- ❖ مشترکہ زمین میں حصے بھی متعین نہیں ہیں، عبدالولی کا مجہول حصہ فروخت کرنا ازروئے شرع درست نہیں ہے۔
- ❖ دیگر شرکاء میں سے کسی نے بھی فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔
- ❖ نجیب اللہ ایک تو اس بات کا انکار کرتا ہے کہ میں نے عبدالرحیم کو صاف کہ دیا: وہ زمین دینے کے لیے تیار نہیں ہے ،اس کا مجھ پر یہ محض تہمت ہے کہ میں نے عبدالرحیم سے کہا: کہ عبدالولی اور ان کے رشتہ دار بیع پر راضی ہیں۔
- ❖ عبدالرحیم کا نجیب اللہ کے فون پر گواہ نہ ہونے کی صورت میں نجیب اللہ کو قسم دی گئی ،انہوں نے قسم اٹھائی، لہٰذا عبدالرحیم کے مزید مطالبہ کا حق ساقط ہو گیا۔
- ❖ اس پر مزید یہ ہے کہ اسٹام پیپر (23\6\2022) میں بھی مشترک زمین کا ذکر ہے: کہ فریق اول (عبدالولی) دس (10) یوم کے اندر اندر زمین کو اپنے دیگر ساتھیوں سے تقسیم کر کے اپنا مذکورہ بالا زمین عبدالرحیم کو حوالہ کرے گا۔

اس سے بھی معلوم ہوا، کہ دونوں فریق مشترک زمین کے قائل ہیں۔

لہٰذا مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر عبدالرحیم کی خرید درست نہیں ہے۔

ایک شریک کا تصرف کے دوران سب شرکاء سے اِجازت لینا اور اُن کا حق ادا کرنا لازم ہے

قال فی درر الحکام:

الشریک اذاباع نصفامعینا من الدارالمشترکَ علی وجہ الشیوع بینہ وبین شریکہ الاخر فالبیع لایجوز،فلوباع الشریک غرفَ معینَ من الدارالمشترکَ بینہ وبین آخرالی اجنبی فالبیع غیرصحیح

فی حصَ البائع ولافی حصَ شریکہ لان الغرفَ التی بیعت لیست للبائع فقط،بل للشریک الاخر شرکَ فی کل جزء منہاکماللاول ۔بزازیۃ

(دررالحکام فی شرح مجلَ الاحکام:ج ۱،ص ۱۸۹)

وکل منہمای کل واحدمن الشریکین او الشرکاء شرکَ ملک اجنبی فی نصیب الاخر،حتی لایجوز لہ التصرف فیہ الاباذن الاخر۔

(مجمع الانہر فی شرح ملتقی الابحر:ج۲،ص ۵۴۳)

وکل من شرکاء الملک أجنبي في الامتناع عن تصرف مضرٍّ في مال صاحبہ لعدم تضمنہا الوکالۃ۔

(الدر المختار، کتاب الشرکۃ / مطلب الحق أن الدین یملک ۶،۴۶۷ زکریا)

نوٹ: زمین کی اصل قیمت کیاہے؟اسٹام پیپرکتنے لکھے گئے ہیں ؟اس کا متعلقہ فیصلہ سے تعلق نہیں ہے۔یہ رقم عبدالولی کے ذمہ ہے کہ عبدالرحیم ودیگر کو حوالہ کرے،اگران کا اصل رقم پراتفاق ہے،جیساکہ ان کے بیانات سے واضح ہوچکاہے،تو ٹھیک ہے،ورنہ وہ الگ اپناکیس جمع کریں۔

راضی نامہ

فریق اول:

میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ولد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کو اراکین دارالافتاء والقضاء جامعہ دارالعلوم حرمزئی کو شرعی فیصلہ کرنے کا حاکم بناتا ہوں، لہٰذا ان کا فیصلہ مجھے قبول ہے، بعد میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔

دستخط/انگوٹھانشان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فریق دوم:

میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ولد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کو اراکین دارالافتاء والقضاء جامعہ دارالعلوم حرمزئی کو شرعی فیصلہ کرنے کا حاکم بناتا ہوں، لہٰذا ان کا فیصلہ مجھے قبول ہے، بعد میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔

دستخط/انگوٹھانشان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دستخط: اراکین جامعہ دارالعلوم حرمزئی، دارالافتاء والقضاء

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نوٹ: یہ فیصلہ فریقین کو نہیں سنایا گیا ہے اور نہ ہی دارالافتاء سے شائع ہوا ہے۔ البتہ افادہ عام کی خاطر نشر کیا جا رہا ہے۔

سید کلیم اللہ

فریق اول : حاجی جلال الدین، پائیدین ، فارالدین، جمال الدین، رحیم الدین وغیرہ مختار : حاجی جلال الدین	حکم (ثالث) : اراکین دارالافتاء والقضاء جامعۃ دارالعلوم حرمزئی۔	فریق دوم : سید عبدالعزیز، سید عبدالباقی وغیرہ مختار : سید عبدالعزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحمٰن

فیصلہ دربابت زمین :

بیان فریق اول (مدعی) :

ہماری مشترکہ زمین جو کہ دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے، جن کا مجموعہ 26 ایکڑ ہے،اس میں کل 46 شرکاء ہیں، جن میں ایک حصہ زمین ہماری ہے،جب کہ فریق مخالف منکر ہے۔کیونکہ ہمارے ہاں طے شدہ ہے، کہ ہر چیالیس حصوں میں ایک حصہ ہمارا ہوتا ہے۔اب جب ہم نے اپنے ہی حصہ کا مطالبہ کیاتو مدعی علیہ نے انکار کیا۔

متنازعہ زمیں کی حدود اربعہ :

غربا: چر کا کازی	شرقا: روڈ	شمالا: شراف الدین ، عزیز الدین کی زمین	جنوبا: ضیاوالدین کا باغ

لہٰذا میرامطالبہ یہ ہے کہ از روئے شرع میراحق دیاجائے۔

بیان فریق دوم (مدعی علیہ) :

تقریبا عرصہ تیس سال قبل تقسیم ہوئی ہے،مدعی کے والد بھی کھڑے تھے،جب ہم نے اپنی تقسیم شدہ زمین ناپی،تو مقررہ پیمائش سے کم نکلی، ہم نے اعتراض کیا، کہ ہماری زمین تالاب تک ہے،تو مدعی نے رفع دفع کے لیے راز محمد اور پائندین نامی شخص

کو بھیجا، جس سے دوبارہ ہمارا تعلق بحال ہوا،اس وقت تک مدعی خاموش تھا، بعد میں ہم پانچ بھائیوں نے اپنی زمین تقسیم کی،اس پر بھی مدعی نے اپنے حق کا دعوی نہ کیا۔۔۔اب عرصہ دوسال سے مدعی نے ہماری زمین میں درخت وغیرہ رکھ لیے، جس سے ہم نے بہت سمجھایا، لیکن بازنہ آیا،آخر ہم نے ٹریکٹر سے اپنی زمین سے درخت وغیرہ صاف کرنے کاارادہ کیا، جس سے مدعی نے کہااس ٹکڑے (نیمکے تقریبا گیارہ ایکڑ) میں میرا حق ہے۔حالانکہ اس کا کوئی بھی حق کسی بھی صورت میں نہیں ہے ۔لہٰذا میرا مطالبہ ہے کہ مدعی کے استغاثہ کو غیر شرعی قرار دے کر خارج کیا جائے۔

زمین کے حدود اربعہ:

غربا: چڑکاکازی	شرقا: روڈ	جنوبا: ضیاوالدین باغ	شمالا: عزیزالدین زمین

الجواب حامداومصليا

فریقین کے بیانات سننے اور قلم کرنے کے بعد مدعیان سے گواہ طلب کیا گیا، جس سے وہ لانے سے قاصر تھے، کہ دوران تقسیم کوئی دوسرا شخص نہیں تھا،اس لیے مدعیان علیھم کو قسم دینا پڑا۔انہوں نے قسم کھائی۔

واضح رہے:

قسم دینے کے لیے مسجد کا انتخاب ہوا،اور ان الفاظ سے قسم دی گئی، کہ اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر، باہوش وسمجھ قسم کھاتا ہوں،اگر جھوٹ بولا،تو میرا منہ کالا ہوجائے۔کہ متدعویہ زمین میں مدعیان کا کوئی حصہ نہ ہے۔

لہٰذاازروئے شرع فریقین اول (مدعیان) کا زمین میں کسی قسم کا حق نہیں ہے۔

"(و) الأصل أن (البينة حجة متعدية) تظهر في حق كافة الناس...."

(الدرالمختار:باب الاستحقاق)

"للحديث المشهور «البينة على من ادعى واليمين على من أنكر»"

(البحرالرئق:كتاب القاضى)

"لأن البينة هي الحجة في الأصل فأما اليمين فكالخلف عن البينة؛ لأنها كلام الخصم صير إليها للضرورة فإذا جاء الأصل انتهى حكم الخلف كأنه لم يوجد أصلا۔"

(البحرالرئق:كتاب الدعوى)

(المحيط البرهانی:الفصل فی المتفرقات:ج٥،ص ٥٦٦)

(هكذا فی فتح القدير:كتاب القضاء)

(دررالحكام فی شرح مجلة الاحكام:المادة:١٦٣٤)

"ولا يحتاج إلى إعادة البينة إذا حضر الغائب (ولو قضى على غائب بلا نائب ينفذ) في أظهر الروايتين عن أصحابناذكره منلا خسرو في باب خيار العيب."
(فرع فی الاشباه والمنظومة المحبية)

"ادعى على آخر سرقة كان على المدعي البينة، وعلى المدعى عليه اليمين..."

(الفتاوى الهندية:الباب الاول فی بيان السرقة...)

(كذا فی الفتاوى الهندية: فی بيان غصب الوقف)

"والقول قول المنكر عند عدم البينة مع يمينه والله عز وجل أعلم."

(البدائع :فی بيان معنى التوكيل)

(هكذافی دررالحكام فی شرح مجلة الاحكام:المادة:١٦٣٢)

(الجامع الصغير:ج١،ص ٣٥٥)

واللہ اعلم بالصواب۔

السیدکلیم اللہ۔

<u>نوٹ : یہ فیصلہ فریقین کو نہیں سنایا گیا ہے۔البتہ افادہ عام کی خاطر شائع کیاجاتاہے۔</u>

راضی نامہ

ہم فریقین :

فریق اول----------------------------------

فریق دوم----------------------------------

اراکین جامعہ دارالعلوم حرمزی (دارالافتاء والقضاء) کو حکم (ثالث) بناتے ہیں لہذاان کو شرعی فیصلہ کے مکمل اختیارات حاصل ہیں۔اوران کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

دستخط فریق اول:------------------------------

گواہ شد:------------------------------------

گواہ شد:------------------------------------

دستخط فریق دوم:------------------------------

گواہ شد:------------------------------------

گواہ شد:------------------------------------

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

دارالافتاء والقضاء

ہم فریق اول (مولوی محمد مراد وغیرہ) اور فریق دوم (سلطان محمد اکا) بہوش وحواس اراکین دارالافتاء والقضاء کو مصالحت/شریعت پر فیصلہ کرنے کا مکمل (کلی وجزئی) اختیار دیتے ہیں۔ان کے کسی بھی فیصلہ سے اعراض نہیں کریں گے۔

__نوٹ:__ فریقین کے بیانات سننے کے بعد حاجی صلاح الدین اور لالا کو عدم علم پر قسم دی گئی، کہ مجھے مشترکہ کوچہ کا کوئی علم نہیں ہے، سفر محمد اکااور وزیر محمد اکانے مشترکہ کوچہ کی بات کی، البتہ ان کے پاس اس دعوے پر گواہان موجود نہ تھے۔آخر میں فریق مخالف سلطان محمد اکا کو قسم دینے کا کہا، تاہم اس کو منت سماجت کر کے اس بات پر آمادہ کیا، کہ قسم سے دست بردار ہو جائے۔اس لیے مدعی علیہ (سلطان محمد اکا) نے قسم سے دست بر داری کا اعلان کیا۔

لہٰذا آج سے سلطان محمد اکا وغیرہ کو متنازع کوچہ /گلی میں شرعا/مصالحتاذاتی کوئی حق نہیں ہے، بلکہ یہ گلی مشترکہ ہوگی۔

فیصلہ حاضرین مجلس وآراکین دارالافتاء والقضاء کے سامنے روبرو سنایا گیا۔

یادرہے: فیصلہ شریعت پر کیا گیا، تاہم مصالحت کی بنا پر فریق اول مولوی محمد مراد وغیرہ کو اس مشترکہ کوچہ میں بوقت ضرورت صرف چار گیٹ لگانے کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی اس کا پابند کر دیا گیا کہ لگائے ہوئے پرنالے مشترکہ کوچہ سے ہٹائیں گے۔اور نہ ہی مشترکہ گلی میں کوئی سامان مثلا: ریت، بجری اور مٹی وغیرہ کا ڈھیر ڈالیں گے اور نہ ہی اس گلی میں گاڑی کھڑی کریں گے، تاکہ آنے جانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئیں اور نہ ہی اس گزرگاہ میں کوئی روکاوٹ حائل ہو جائیں۔ہر فریق اپنے ہر فرد کو نقصان نہ پہنچانے کا ذمہ دار ہوگا۔اور اگر فریق کے کسی بھی شخص نے دوسرے فریق کے کسی بھی شخص کو نقصان پہنچایا، تو دوسرا فریق مجرم شمار ہوگا۔اور 12 فٹ گلی مشترکہ ہوگی، مولوی محمد مراد وغیرہ اپنے گیٹ کے پلرز اپنی دیوار کے 1/5 ڈیڑھ فٹ کے اندر بنائیں گے۔ سلطان محمد اکا کی زمین سے لے کے کرماندہ تک مشترکہ گلی کے اندر سرکاری فنڈ کے علاوہ کوئی تعمیراتی کام کرنے کی اجازت کسی کو نہیں دی جائے گی۔

یادرہے: ماندہ مشترکہ گزرگاہ ہوگا، کسی بھی فریق کو روکنے کی اجازت نہ ہوگی۔

دستخط/انگوٹھانشان فریق اول:------------------

دستخط/انگوٹھانشان فریق دوم:------------------

گواہ شد:1------------2------------3------------

دارالافتاء والقضاء، جامعہ دارالعلوم حرمزی

بسم اللہ الرحمن الرحمن

فیصلہ درباہت زمین :

فریق اول : حاجی جلال الدین، پائیدین، فارالدین، جمال الدین، رحیم الدین وغیرہ)

مختار : حاجی جلال الدین

فریق دوم : (سید عبدالعزیز، سید عبدالباقی وغیرہ)

مختار : سید عبدالعزیز

حکم۔۔۔۔۔ثالث : اراکین دارالافتاء والقضاء جامعۃ دارالعلوم حرمزئی۔

بیان فریق اول (مدعی) :

ہماری مشترکہ زمین ہے : جو 26ایکڑپر مشتمل ہے،اس میں کل 46شرکاء ہیں،ایک حصہ زمین ہماری ہے،جب کہ فریق مخالف منکر ہے۔

متنازعہ زمیں کی حدوداربعہ :

مغرب : چرکاکازی۔

مشرق : قلعہ عبداللہ تاپشین روڈ۔

جنوب : شراف الدین، عزیزالدین کی زمین۔

شمال : ضیاوالدین کا باغ۔

بیان فریق دوم : (مدعی علیہ) :

فریق دوم یعنی مدعی علیہ مدعی کے قول کاانکار کرتاہے، کہ فریق مخالف کادعوی منگڑت اور بے جاہے۔لہٰذااس سے مجلس تحکیم سے نکال باہر کیاجائے اور ہماراحق شریعت کی روشنی میں ہمیں دیجیے۔

فیصلہ :

فریقین کے بیانات اور جرح کے بعد درج ذیل شرعی نکات پر فیصلہ ہوا:

(و) الأصل أن (البينة حجة متعدية) تظهر في حق كافة الناس----

(الدرالمختار:باب الاستحقاق)

للحديث المشهور «البينة على من ادعى واليمين على من أنكر»

(البحرالرئق:كتاب القاضى)

لأن البينة هي الحجة في الأصل فأما اليمين فكالخلف عن البينة؛ لأنها كلام الخصم صير إليها للضرورة فإذا جاء الأصل انتهى حكم الخلف كأنه لم يوجد أصلا،

(البحرالرئق:كتاب الدعوى)

(المحيط البرهانى:الفصل فى المتفرقات:ج٥،ص ٥٦٦)

(هكذا فى فتح القدير:كتاب القضاء)

(دررالحكام فى شرح مجلة الاحكام:المادة:٦٣٤)

ولا يحتاج إلى إعادة البينة إذا حضر الغائب (ولو قضى على غائب بلا نائب ينفذ) في أظهر الروايتين عن أصحابناذكره منلا خسرو في باب خيار العيب
(فرع فى الاشباه والمنظومة المحبية)

ادعى على آخر سرقة كان على المدعي البينة، وعلى المدعى عليه اليمين---

(الفتاوى الهندية:الباب الاول فى بيان السرقة---)

(كذا فى الفتاوى الهندية: فى بيان غصب الوقف)

والقول قول المنكر عند عدم البينة مع يمينه والله عز وجل أعلم.

(البدائع :فى بيان معنى التوكيل)

(هكذافى دررالحكام فى شرح مجلة الاحكام:المادة:١٦٣٢)

(الجامع الصغير:ج١،ص ٣٥٥)

والله اعلم بالصواب۔

السيدكليم الله۔

نوٹ : یہ فیصلہ فریقین کو نہیں سنایا گیاہے ‘البتہ افادہ عام کی خاطر نشر کیاجاتاہے۔

بسم الله الرحمن الرحیم

فریق اول:

حاجی نور محمد (مرحوم) کے چار بیٹے ہیں: حاجی محمد حنیف، حاجی محمد میر، حاجی محمد اور ولی محمد۔

فریق دوم:

حاجی محمد عظیم (مرحوم) کی دو بیویاں ہیں: ایک بیوی سے چار بیٹے ہیں: بشیر احمد، محمد عارف، نذیر احمد اور وزیر۔

جب کہ دوسری بیوی سے چار بیٹے ہیں: محمد عابد، عرب، محمد بلال اور محمد عباس (مرحوم)

یہ دو فریق ہیں، ان کے درمیان ایک مکان مشترک تھا، فریق دوم نے فریق اول پر اپنا حصہ فروخت کیا، مکان کی قیمت تیس لاکھ مقرر کی گئی، فریق اول کو پندرہ لاکھ دینے تھے، لیکن ایک لاکھ چوالیس رقم نہ دی، بلکہ یہ طے پایا: کہ انتقال جائیداد کے دوران ان کو بقایا رقم دی جائے گی۔ حاجی محمد نے اپنے چچا محمد عظیم (مرحوم) سے کہا: کہ جو دوکان فریق اول کے نام ہے، حساب میں فریق دوم کو ملی ہے، ہم اس کو آپ کے نام منتقل کردیں گے اور آپ (فریق دوم) مکان کا فروخت کیا ہوا حصہ ہمارے نام منتقل کردیں، جس پر تقریباً دس ہزار کا خرچہ آئے گا، وہ ہم فریقین برابر تقسیم کریں گے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہوسکا۔۔۔۔

حاجی محمد اعظم (مرحوم) نے اپنی جائیداد بیٹوں کے نام کر کے ان کو قبضہ بھی دیا، ہر اہلیہ کے بیٹوں کو اپنی ملکیت میں موجود جائیداد تقسیم کرادی، اور خود محمد عابد، عرب اور محمد بلال کے پاس رہائش اختیار کی اور طے یہ پایا: کہ دوسری اہلیہ کے بیٹے: حاجی بشیر احمد وغیرہ مجھے آٹھ لاکھ روپے دیں گے، یہ میرا ان پر قرضہ ہے، چنانچہ انہوں نے دو لاکھ روپیہ دے دیے، جب کہ چھ لاکھ روپے جائیداد کی صورت میں حوالہ کردیے۔ اور وہ اس طرح کہ حاجی محمد عظیم (مرحوم) چونکہ محمد عابد وغیرہ کے ساتھ رہتا ہے، ہم اپنے والد کے چھ لاکھ قرض جائیداد کی صورت میں حوالہ کریں گے لہٰذا اسی رقم کے مطابق جائیداد میں اضافہ کیا۔ لیکن یہ معلوم نہ کیا، کہ کس جائیداد میں یہ اضافہ ہے؟

حاجی محمد عظیم نے اپنی زندگی میں ایک دوکان کا کرایہ مدارس، مساجد اور غرباء کے لیے وقف کیا ہے۔

اب دریافت طلب سوالات یہ ہیں:

- حاجی بشیر احمد یہ کہتاہے :کہ نور محمد کے بیٹوں (حاجی محمد حنیف اور حاجی محمد میر وغیرہ) نے جو میرا ایک لاکھ چوالیس ہزار رقم انتقال کی وجہ سے روکا تھا،اب مجھے آج کے حساب سے رقم چاہیے ،کیونکہ اس رقم پر کافی عرصہ بیت چکاہے۔اس رقم سے میں اب تک بہت کچھ کما چکا ہوا تھا۔کیا ان کا یہ دعوی درست ہے ؟
- حاجی بشیر احمد وغیرہ ہے کا کہناہے :کہ ہم نے چھ لاکھ روپیہ والد کو جائیداد کی صورت میں قرض دیا تھا،والد کے انتقال کے بعد جائیداد کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہواہے اور یہ رقم اب میراث ہے ۔لہٰذاہمیں آج کے حساب چھ لاکھ کے تناسب سے جائیداد میں حصہ ملناچاہیے۔کیا ان کا یہ مطالبہ ازروئے شرع درست ہے ؟
- حاجی بشیر احمد وغیرہ کہتے ہیں :کہ ہم وقف شدہ کرایہ کو روک لیں گے ،دوکان کو فروخت کر کے ہم آپس میں تقسیم کریں گے۔والد کے انتقال کے بعد بھی ہم نے کہا تھا:کہ دوکان فروخت کردو،یا کرایہ کے استعمال میں ہمیں بھی اعتماد میں لے لو۔چنانچہ نہ ہمیں کرایہ ملا،نہ ہی ہمارے صوابدید پر مدارس اور مساجد اور فقراء کو دیا گیاہے۔لہٰذاوالد کے انتقال سے لے کرتاحال جتنا بھی کرایہ وصول ہواہے وہ ہمیں چاہیے ۔کیاان کا یہ مطالبہ درست ہے ؟جب کہ فریق دوم : محمد عابد کا کہناہے :کہ کرایہ کی رقم سے ہم نے دوسال والد کا قرضہ اتاراہے اور بقیہ رقم ہم نے والد ہی کی وصیت کے مطابق غریبوں پر تقسیم کیاہے۔

الجواب حامداومصليا

واضح رہے :

باپ کے انتقال کے بعد جائیداد میں تمام ورثہ شریک ہوں گے ،بیٹوں کا جائیداد لے کر والدہ اور بہنوں کو محروم کرنا شریعت کی دھجیاں اڑاناہے۔اسی کا نتیجہ ضروریہی نکلے گا،کہ آپس میں نہ ختم ہونے والے اختلافات اور باہمی کشاکشی ہو گی ۔

- پہلی صورت مسؤلہ میں (بصورت صدق واقعہ) حاجی بشیر احمد وغیرہ کو صرف ایک لاکھ چوالیس ہزار رقم ملے گی ۔ان کا یہ کہنا :کہ مجھے آج کے حساب سے زیادہ رقم ملنی چاہیے ۔ازروئے شرع ناجائز اور سود ہے ۔

لہٰذانہ ہی زائد رقم کا مطالبہ درست ہے اورنہ ہی اسی رقم کی مد میں جائیداد سے حصہ دینادرست ہے۔

"عن فضالہ بن عبیدصاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم أنہ قال:کل قرض جرمنفعہ،فھووجہ من وجوہ الربا۔"

(السنن الکبری للبہیقی،کتاب البیوع،ط: دارالفکر،بحوالہ :فتاوی قاسمیہ:با ب القرض:ج ۲۱)

" کل قرض جر نفعا،فھو ربا۔۔۔۔۔"

(الدر مع الرد، کتاب البیوع، باب المرابحہ: 166/5، بحوالہ قاسمیہ: ج ۲۱)

❖ دوسری صورت میں صرف چھ لاکھ میراث ہوگی، بشرطیکہ والد نے زندگی میں اس کو محفوظ کیا ہو اور اپنے اوپر خرچ نہ کیا ہو۔

واضح رہے:

والد نے اپنے بیٹوں (حاجی بشیر احمد وغیرہ) سے کہا تھا: کہ میرا آٹھ لاکھ قرضہ تمھارا ذمہ ہوگا، انہوں نے دو لاکھ قرضہ چکا دیا، جب کہ چھ لاکھ قرضہ جائیداد کی شکل میں دے دی۔ اور یہ سارا کا سارا قرضہ ہی شمار ہوگا۔ اور شریعت کے قانون کے مطابق قرض میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

"الاقرض تقضی بامثالها"۔

(مستفاد امدادالفتاوی :ج ۳،ص ۱٦۵،بحوالہ قاسمیہ : باب القرض :ج ۲۱)

وان استقرض دانق فلوس ،أو نصف درهم فلوس ،ثم رخصت أوغلت ،لم يكن عليه الامثل عدد الذى أخذه ۔

(الشامیہ؛کتاب البیوع،باب المرابحہ والتولیہ،فصل فی القرض : 162/5)

(کذافی الفقہ علی المذاہب الاربعہ:344/2)

(ماخوذ ازقاسمیہ:باب القرض :ج ۲۱)

قال فی الشامیہ:

ان الديون تقضى بامثالها على معنى أن المقبوض مضمون على القابض ؛لان قبضه بنفسه على وجه التملك ولرب الدين على المدين مثله،فالتقى الدينان قصاصا،وتمامه فى البحر۔

(کتاب الایمان، باب الیمین فی الضرب والقتل وغیرذلک: 848/3 ط:سعید)

تیسری صورت میں جب حاجی محمد عظیم (مرحوم) نے زندگی میں دوکان کا صرف کرایہ وقف کیا ہے، مرحوم کے انتقال کے بعد دوکان بطور میراث تقسیم ہوگی اور اس میں تمام ورثہ شریک ہو ں گے (باپ کے انتقال کے وقت جو بھی وارث زندہ ہو)۔ والد کے انتقال کے بعد محمد عابد کا یہ حق نہیں تھا کہ دوکان کے کرایہ میں دیگر شرکاء کے بغیر تصرف کرے

اب انہوں نے جو تصرف کیاہے وہ اس کا ذاتی حصہ سے شمار ہو گا،دیگر ورثاء اگر اس کے اس تقسیم کار پر راضی ہیں،تو ٹھیک ہے ورنہ ہر وارث کے حصہ کا ذمہ دار ہو گا۔اور اس کی صورت یوں ہو گی،کہ رقم دوکان کے کرایہ سے وصول کی جائے۔

نوٹ: یہ مسئلہ دارالافتا سے باقاعدہ شائع نہیں ہواہے،صرف افادہ عام کی خاطر نشر کیا جاتاہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- وقت گزرنے پر دعوی کا اخراج
- سماعت دعوی کی تحدید
- کیا سماعت دعوی کی تحدید صرف قانونی ہے؟
- سیلاب سے تباہ شدہ باغات کا نقصان کس پر؟
- خریدار کو دکانوں کی تعمیر کے بعد پتہ چلا کہ زمین کسی اور کی ہے۔
- ایسی دکان میں خرید وفروخت پر منافع جس کی زمین کا حقدار نکل آیا
- بلڈر کا غیر تعمیر شدہ دکان مالک سے کرایہ پر لینا

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

کیافرماتے ہیں علماکرام مسائل ذیل کے بارے میں :

بعض علاقوں میں لوگوں نے غیر آباد زمینیں آباد کی ہیں ، جن کو اسی (80) نوے سال ہو چکے ہیں ، کسی نے زمین پر باغات لگائے ہیں ، کسی نے گھر تعمیر کیے ہیں اور کسی نے دکانیں بنائی ہیں ۔اب اصل مالکان زمینوں کے کاغذات لے کر دعوے کرنے لگے ہیں ،کہ یہ زمینیں ہمارے آباواجداد کی ہیں ۔اسٹامپ پیپر وغیرہ کی شکل میں ان پاس مختلف قسم کے ثبوت ہوتے ہیں،وہ کہتے ہیں : کہ ہماری زمینیں ہمارے حوالے کی جائیں ، کیونکہ ہم ہی اصل مستحقین ہیں۔

اب پوچھنایہ ہے :

- ازروئے شرع ان دعوی کی اتنے عرصے بعد سماعت ہو گی ، یا نہیں ؟
- کتنے عرصے بعد دعوی قابل سماعت نہیں ہوتا؟ شرعااس کی تحدید ہے یا نہیں ؟
- اگر یہ زمینیں اصل مالکان کے حوالہ کی جائیں ،توایسی صورت میں ان پر بنائی گئی دکانیں ، گھر، درخت اور باغ وغیرہ کی اصل قیمت مالکان کوآداکرنی پڑے گی، یا موجودہ قیمت ؟ کیونکہ قبضہ داروں نے بہت محنت کر کے زمینوں کو قابل انتفاع بنایاہے ؟
- درخت کی قیمت نہایت کم ہوتی ہے، لیکن باغ کے اعتبار سے ایک باغ لاکھوں میں فروخت ہوتاہے۔اب اگر زمین کے اصل مالک کادعوی تسلیم کیاجائے ،توایسی صورت میں مالک باغ کو صرف درختوں کی قیمت آداکرنی پڑے گی ؟ یا باغ کی ،جس کی قیمت لاکھوں روپیہ میں ہے ؟

❖ ایک بلڈر (جو مکانات تعمیر کرتاہے) کولوگ (کلائنٹ) ایک گھر (فلیٹ) بنانے کے لیے مخصوص رقم دیتاہے،بلڈرایک یادوسال کی مدت مقرر کر کے کلائنٹ سے رقم سے لیتاہے، کہ دوسال کے عرصے میں آپ کواس کی قیمت میں فلاں جگہ گھر، یافلیٹ تعمیر کر کے دیں گے ۔اس طرح بلڈراور کلائنٹ میں معاہدہ طے ہوتاہے۔پھر عموما اس مدت میں بلڈر مکان تعمیر کر کے کلائنٹ کے حوالہ کرتاہے ، کبھی بلڈر سے تاخیر ہو جاتی ہے،ایسے میں کلائنٹ تاخیر پر بلڈر سے ہر مہینے کے حساب سے مخصوص رقم اس غیر موجود مکان کے کرایہ کے طورپر وصول کرتارہتاہے۔اس میں جتنی تاخیر مکان بنانے میں ہوتی ہے،بلڈر کا نقصان ہوتاہے۔

- اب شریعت کی رو سے ایسامعاملہ جس میں تعمیرنہ ہونے پربلڈر سے غیر تعمیر شدہ مکان کا کرایہ وصول ہونا بھی شامل ہو، جائزہے ، یانہیں؟جب کہ کلائنٹ بعض اوقات قصداایسی جگہ پیسے لگاتاہے،تاکہ وقت پوری ہونے پر الگ بلڈر سے کرایہ بھی ملتارہے۔
- بعض جگہ بلڈر غفلت برتتے ہیں،سدباب کے طورپر کلائنٹ اس سے کرایہ لیتاہے؟

الجواب حامداومصليا

شرعی ضابطہ کے موافق بندے کا حق ضائع نہیں ہوتاہے اگرچہ اس پر زمانہ دراز گزرجائے،بلکہ کسی بھی چیزپر عرصہ درازتک قبضہ کرنے سے اصل مالک ہی کی ملکیت اس چیز سے ختم نہیں ہوتی ہےاور وہ اصل مالک کی ملکیت میں باقی رہتی ہے۔تاہم ایسا کرنے سےلوگ جعل سازی اوردھوکہ سے دوسروں کی املاک پر دعوے کریں گے۔وقت گزرنے پر غلط طریقے اورناجائز بہانے سے دعوے پیش کیے جانے کا قوی اندیشہ ہے۔اس لیے متاخرین فقہانے اس جرم کے انسداد کی خاطر معلوم وقت تک دعوے کی سماعت کو قابل قبول قراردیاہے ،بصورت دیگردعوی مسترد کیاجائے گا۔چنانچہ عام عدالتوں میں بغیر کسی عذرشرعی کے پندرہ سال بعد پیش آنے والے دعوے اور خصوصی عدالتوں میں پیش آنے والے مقدمات تیس سال /تینتیس سال /یاچھتیس سال کے بعدناقابل سماعت قراردیے جائیں گے۔البتہ اگرشرعی عذر کی بناپر مقررہ وقت میں دعوی دائرنہ کیا،توکسی مدت کی تعین کے بغیرحاکم وقت ہر عام وخاص عدالت میں اس مقدمہ کی سماعت کااختیاررکھتاہے۔

وفی جامع الفتاوی :عن فتاوی العتابی ،قال المتاخرون من اهل الفتوی:لاتسمع الدعوی بعد ست وثلاثين سنة ،الاان يكون المدعى غائبا،او صبيا،اومجنونا،وليس لهما ولى اوالمدعى عليه اميراجائرااه،ونقل عن الخلاصة:لاتسمع بعدثلاثين سنة اهثم لايخفى ان هذاليس مبنياعلى المنع السلطانى بل هومنع من الفقها،فلاتسمع الدعوى بعده وان امرالسلطان بسماعها۔

(الشامية،كتاب القضا:ج۵،ص۴۲۰ط:سعيد)

ثم اعلم أن عدم سماعها ليس مبنيا على بطلان الحق، حتى يرد أن هذا قول مهجور،لانه ليس ذلك حكما ببطلان الحق، وإنما هو امتناع من القضاة عن سماعها خوفامن التزوير ولدلالة الحال كما دل عليه التعليل، وإلا فقد قالوا: إن الحق لا يسقط بالتقادم كما في قضاء الاشباه، فلا تسمع الدعوى في هذه المسائل مع بقاء الحق للآخرة،ولذا لو أقر به يلزمه.ثم اعلم أن عدم سماع الدعوى بعد مضي ثلاثين سنة أو بعد الاطلاع على التصرف ليس مبنيا على بطلان الحق في ذلك، وإنما هو مجرد منع للقضاةعن سماع الدعوى مع بقاء الحق لصاحبه، حتى لو أقر به الخصم يلزمه، ولو كان ذلك حكما ببطلانه لم يلزمه ويدل على ما قلناه تعليلهم للمنع بقطع التزوير والحيل كما مر فلا يرد ما في قضاء الاشباه من أن الحق لا يسقط بتقادم الزمان، ثم رأيت التصريح بما نقلناه في البحر قبيل قضاته دفع الدعوى، وليس أيضا مبنيا على المنع السلطاني حيث منع السلطان عز نصره قضاته من سماع الدعوى بعد خمس عشرة سنة في الاملاك وثلاثين سنة في الاوقاف، بل

هو حكم اجتهادي نص عليه الفقهاء كما رأيت، فاغتنم تحرير هذه المسألةفإنه من مفردات هذا الكتاب، والحمد لله المنعم الوهاب إ ه.

(تکملہ ردالمحتار)

صورت مسئولہ میں دوصورتیں ہیں:

1۔۔۔زمین پر قبضہ کرکے باغات لگائے، عرصہ دراز کے بعد اصل مالک نے ثبوت کے ذریعے زمین ثابت کردی، تو زمین اصل مالک کو حوالہ کیاجائے گا اور قبضہ کرنے والے کو درخت اکھاڑنے کا حکم دیاجائے گا اوراکھاڑنے کے دوران زمین کو نقصان پہنچنے کی صورت میں ضمان بھی آدا کرے گا۔یادرختوں کوزمین کے مالک کے حوالہ کرے اوراکھڑے درختوں کی قیمت وصول کرے۔

قوله (ومن غصب أرضا فغرس فيها أو بنى فيها قيل له اقلع البناء والغرس وردها إلى مالكها) لقوله عليه الصلاة والسلام { ليس لعرق ظالم حق } ولأن ملك صاحب الأرض باق فإن الأرض لم تصر مستهلكة والغصب لا يتحقق فيها فيؤمر الغاصب بتفريغها كما إذا أشغل ظرف غيره بطعامه ...قوله (فإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلك فللمالك أن يضمن له قيمة البناء والغرس مقلوعا ويكون المقلوع له) ؛ لأن فيه نظرا لهما ودفع الضرر عنهما ويضمن قيمته مقلوعا ؛ لأنها الحالة التي يجب فيها ردها فتقوم الأرض بدون الشجر والبناء وتقوم وهما بها ولكن لصاحبها أن يأمر بقلعه فيضمن فضل ما بينهما۔

(الجوهره ،کتاب الغصب؛ج۲،ص ۳٦،ط:قدیمی کتب خانہ)

فيؤمر الشاغل بتفريغها كما إذا شغل ظرف غيره بطعامه قال فإن كانت الأرض تنقص بقلع ذلك فللمالك أن يضمن له قيمة البناء وقيمة الغرس مقلوعا ويكونان له لأن فيه نظرا لهما ودفع الضرر عنهما وقوله قيمته مقلوعا معناه قيمة بناء أو شجريؤمر بقلعه لأن حقه فيه إذ لا قرار له فيه فتقوم الأرض بدون الشجر والبناء وتقوم وبها شجر أو بناء لصاحب الأرض أن يأمره بقلعه فيضمن فضل ما بينهما۔

(الهدایہ ،فصل فیمایتغیربفعل الغاصب:ج۳)

مذکورہ بالاعبارت کاخلاصہ یوں ہوا:کہ زمین کی قیمت اور قابض کے لگائے ہوئے باغ،یاتعمیردونوں کی قیمت کااندازہ لگائیں۔اورپھرصرف خالی زمین کی قمیت متعین کرے۔جوفرق آیا،وہ قابض کودے کرچلتاکردے۔ قابض کا ناجائزقبضہ ہے،اس نے غیر کی ملک (زمین) میں تصرف کرکے باغ لگایا،کسی اورکی ملک تصرف کرنااس کی اجازت کے بغیر درست نہیں ہے۔اس لیے بقول طرفینؒ قابض کے لیے باغ کا منافع بھی درست نہیں ہے،بلکہ وہ اپنے لگائے ہوئے پودے،یابیج کی بقدرحصہ لے اورزمین کو اگرنقصان پہنچایاہو،تواسی آمدن سے اس کاازالہ کرکے بقایاساراحاصل شدہ منافع (ملک خبیث ہونے کی وجہ سے) صدقہ کرے۔

تفصیل کے لیے:(ھدایہ،ج۳،کتاب الغصب)

یادرہے:

اگر قابض نے زمین پردکان بنائی اوراس میں چیزیں فروخت کرنے لگا،تو اس کا منافع قابض ہی کی ملک ہوگی،فقہا کرام نے وضاحت کی ہے:کہ باغ یاکھیت میں زیادہ سے زیادہ اس کے درخت یاپیچ استعمال ہوئے ہیں،مزیدترقی اس کے لگائے ہوئے مال کی وجہ سے نہیں ہے،جب کہ دوکان میں مال باہر سے لایا گیاہے،زمین سے حاصل شدہ نہیں ہے۔اس صورت میں صرف قابض پرکرایہ (اجرت مثل) لازم ہوگا۔

غصب حانوتا ،فعمل وربح طاب لہ الربح ؛لانہ حصل بالتجارۃ۔

(تارتارخانیہ:کتاب الغصب)

غصب حانوتا واتجر فیہ ،وربح یطیب الربح۔کذافی الوجیز لکردری۔

(الہندیۃ،کتاب الغصب،الباب الثامن:ج۵،ص۱۶۶،ط:زکریا)

(ماخوذاز فتاوی قاسمیہ:ج۷۴،۲۲)

2۔۔۔دوسری صورت یہ ہے:کہ کسی نے زمین خرید کرآباد کی،یاباغ لگایا،عرصہ دراز کے بعدزمین کا مستحق(اصل مالک)نکلا،تواس وقت خریدار کو قابض کی طرح وہی دواختیار حاصل ہیں۔چاہے تودرخت نکالے اور نکالنے کے دوران زمین کو جو بھی نقصان پہنچے اس کا بھی ضمان آدا کرے گا۔اور چاہے توزمین کے مالک سے اکھڑے درختوں کی قیمت وصول کرے اور بائع پر رجوع کی صورت میں صرف اپنی دی ہوئی رقم وصول کرے گا۔اس کے علاوہ بائع پر کوئی تاوان نہ آئے گا۔

’’رجل اشترى أرضا فغرس فيها شجرا فنبت الشجر ثم استحقت الأرض يقال للمشتري اقلع الشجرفإن كان قلعه يضر بالأرض يقال للمستحق إن شئت تدفع إليه قيمة الشجر مقلوعا ويكون الشجر لك وإن شئت فخله حتى يقلع الشجر ويضمن لك نقصان أرضك فإن أمره بالقلع وقلع المشتري ثم ظفر بالبائع بعد القلع فإن المشتري يرجع على البائع بالثمن ولا يرجع بقيمة الشجر ولا بما ضمن من نقصان الأرض۔۔۔‘‘

(مجمع الضمانات؛القسم الثانی فی الاجیرج ۱،ص ۵۰۵)

وفی ’’الہندیۃ‘‘ :

’’اشتری ارضاوعمرها،فاستحقت هل یرجع علی بائعہ بماانفق فی عمارتها؟لاروایۃلہذہ المسئلۃ ۔قیل :لایرجع۔‘‘

(الہندیۃ،الباب الثامن عشر فی الاستحقاق :ج۳ ، ص۱۶۸)

’’إذا اشترى أرضا فغرس فيها أغراسا أو دارا فبنى فيها بناء ثم جاء مستحق استحقهافإنه يأخذها ويقلع الأشجار وينقض البناء والمشتري يرجع على بائعه بالثمن وهو بالخيار إن شاء سلم النقض إلى البائع ويرجع

بقيمته مغروسا غير مقلوع ومبنيا غير منقوض وإن شاء حبس لنفسه ولا يرجع بالنقصان في ظاهر الرواية إلا إذا كان باتفاقهماوفي الفتاوى وكذا لا يرجع البائع على بائعه بقيمة البناء عندأبي حنيفةخلافا لهما وكذا لا يرجع بنقصان العيب فبائعه لا يرجع۔۔۔۔‘‘

(مجمع الضمانات،القسم الثانی فی الاجیر:ج۱،ص۲ ۵۱)

’’اشترى أرضا وأحياها أي عمرها فاستحقت من يد المشتري فالمشترى هل يرجع على البائع بما أنفق في العمارة لا رواية في هذه المسألة عن أصحابنا وقيل لا يرجع لأن الإحياء حصل بصرف المنافع والمنافع عندنا لا تتقوم إلا بالعقد من مشتمل الأحكام وفي الإسعاف لو اشترى الرجل دارا وطين سطوحها وجصصها ثم استحقت ليس له أن يرجع بقيمة ذلك وإنما يرجع بثمن الدار وبما يمكن هدمه وتسليمه إليه ويرجع بقيمته مبنيا على البائع لكونه مغرورا والحاصل أن ما لا يمكن أخذعينه هو في حكم الهالك لا يرجع بقيمته على البائع انتهى۔۔۔‘‘

(مجمع الضمانات،القسم الثانی فی الاجیر:ج۱،ص۲ ۵۱)

’’رجل اشترى من رجل أرضا بيضاء وبنى فيها بناء ثم استحقت الأرض وقضى القاضي على المشتري بهدم البناء فهدمه ثم استهلكه فلا شيء على البائع من قيمة البناء وهذااختيار منه له وإن لم يستهلكه و لكن المطر أفسده كان البناء صحيحا فصار طينا أو كسره رجل فعلى البائع فضل ما بين النقض و البناء وإن شاء البائع أخذ النقض على تلك الحالة وأعطاه قيمة البناء مبنيا ويدفع عنه ما حدث في النقض من النقصان من كل وجه فإن اختار هذا فالمشتري بالخيار إن شاء فعل وإن شاء لم يفعل وكذلك كل فساد يدخله بجناية أحد فالمشتري بالخيار والبائع بالخيار۔‘‘

(الهندیۃ،الباب الثامن عشر فی الاستحقاق :ج۳ ، ۱٦۹)

یادرہے:

صرف درخت اوریاصرف ملبے کی قیمت وصول کرنے میں قابض یاخریدار کو بہت نقصان ہوگا،اس لیے بقول علامہ کرخیؒ کے باغ کی موجودہ قیمت،یاتعمیر کی قیمت اورزمین کی قیمت کا موازنہ کیاجائے اگرباغ ،یاتعمیر کی قیمت زیادہ ہو،توزمین کے مالک کوزمین کی قیمت دے کرفارغ کرے ،اس میں دونوں کے نقصان کاخیال مدنظرہوگا۔مالک زمین کوزمین کی قیمت ملے گی اور قابض کو اپنی تعمیریادرخت اور محنت کا صلہ ملے گا۔اورفقہ کے مشہور قاعدہ پر عمل بھی ہوگا۔اسی طرح زمین کی قیمت زیادہ ہوتو،باغ اور تعمیر والے کو قیمت دے کرفارغ کیاجائے۔اوراگرقیمت برابر ہوتب بھی اصل مالک کوزمین حوالہ کی جائے۔

یختار اهون الشرین ۔۔۔الضررالاشدیزال بالضررالاخف۔

اوراگرزمین کی قیمت زیادہ ہو،توزمین مالک کے حوالہ ہوگی۔

’’سئلت فیمن غصب ارضا،فبنی فیهااوغرس،وکان البنائ اکثرقیمۃ من الارض باضعاف یومرالغاصب بالقلع بنائہ اوغرسہ فالجواب ان فی المسئلۃ خلافا ،ذهب الکرخی فی هذة الصورة الی ان الغاصب یضمن لصاحب الارض قیمتها قال فی الدرر وکذالوغصب ارضا فبنی علیهااوغرس ،یضمن صاحب الاکثرقیمۃ الاقل ۔والاصل ان الضررالاشدیزال بالاخف۔ اهـ مختصراقال ابن عابدین فی حواشیہ۔فلوقیمۃ البنا اکثریضمن الغاصب قیمۃ الارض ،ولایومر بالقلع

وهذاقول الكرخيؒ۔قال في النهاية:وهواوفق لمسائل الباب،لكن في العمادية:ونحن نفتي بجواب الكتاب اتباعالمشايخنافانهم كانوالايتركونه اى من انه يومربالقلع والردالى المالک مطلقا ،وفي الحامدية:عن الانقروى:انه لايفتى بقول الكرخيؒ ،صرح به المولى ابوالسعود المفتى قال:وبالامربالقلع افتى شيخ الاسلام على افندى مفتى الروم آخذامن فتاوى ابى السعود والقهستانى ،ونعم هذاالجواب فان فيه سدباب الظلم۔والله تعالى اعلم۔''

(الفتاوى الكاملية:ص۶۰۸)

البتہ اگرعلامہ قاضی زادہؒ نے جمہور فقہا کرام سے ہٹ کرالگ فتوی دیاہے،جس میں انہوں نے فرمایا:

باغ نکالنے ،یاتعمیر گرانے میں خریداریا قابض کا کافی نقصان ہوتاہے۔اس لیے ہر حال میں زمین کی قیمت لگاکرمالک کو فارغ کیاجائے،اس قول میں کافی وسعت ہے اور جھگڑے اورآپس کی ناچاقی سے کافی حدتک بچنے کی کوشش ہے۔تاہم اس قول کو علما کرام نے اس لیے رد کیاہیں : کہ اس سے ظلم کا دروازہ چوپٹ کھل جائے گا اور لوگ ناجائز قبضے کرکے لوگوں کے املاک پر قبضے کریں گے۔

''فذهب الحنفية الى من غصب ساجة (خشبة عظيمة تستعمل فى ابواب الدور وبنائها)فبنى عليها اوحولها،وكانت قيمة البنا اكثر من قيمتها،زال ملک مالكهاعنها،ولزم الغاصب قيمتها؛لصيرورتهاشيئا آخر،وفى القلع ضررظاهرلصاحب البنا(الغاصب من غيرفائدة تعودللمالک،وضررالمالک ينجبربالضمان ولاضررفى الاسلام۔وعقب قاضى زاده على هذه التفرقة ،فقال:لافرق فى المعنى بين ان تكون قيمة البنا اكثرمن قيمة الساجة وبين العكس؛لان ضررالمالک مجبوربالقيمة وضررالغاصب ضررمحض،ولاريب ان الضررالمجبور دون الضررالمحض ،فلايرتكب الضررالاعلى عندامكان العمل بالضررالادنى ،فيعمل بقاعدة:الضررالاشديزال بالاخف۔فى مسئلة الساجة اى انه يعوض المالک ،وتزول ملكيته عن الساجة۔''

(الموسوعة الفقهية الكويتية:472/5)

البتہ تطبیق کی یہ صورت ممکن ہے: کہ اگر غلطی سے کسی دوسرے کی زمین آباد کی ہو،یاکسی اورنے دھوکہ دے اس پر زمین فروخت کی ہواوریامیراث میں یہ زمین اس کے حصہ میں آئی ہو،تواس وقت تومالک کوزمین کی موجودہ قیمت دے کرفارغ کیاجائے،چونکہ اس وقت آبادکارقصداغاصب شمارنہ ہوگا،اس لیے باغ سے لیاہوامنافع ملک خبیث شمارنہ ہوگااور آبادکار کے لیے حلال ہوگا۔ اوراگرجاننے کے باوجود ایسا کیاہواوریاناجائز قبضہ کیاہو،تواس کو درخت،ملبہ اوریا تعمیر کی میٹریل کی قیمت ملے گی اور بس۔

لہٰذا:

- صورت مسئولہ میں ازروئے شرع دعوی قابل سماعت نہ ہوگا۔
- اسی (80) یانوے(90)سال بعد دعوی کی سماعت نہیں ہوگی۔

- اگر یہ زمینیں اصل مالکان کے حوالہ کی جائیں، تو ایسی صورت میں ان پر بنائی گئی دکانیں، گھر، درخت اور باغ وغیرہ کی موجودہ قیمت مالکان کو آدا کرنی پڑے گی۔
- پہلے مصالحت کی کوشش کریں، تاکہ قابض اور مالک دونوں کا نقصان ہو اور اگر اتفاق نہ ہو سکا، تو دکانوں، مکانوں کے ملبے اور اکھڑے درختوں کی قیمت ملے گی۔ مزید باغ، دوکانوں اور مکانوں پر جو محنت کی گئی ہے یعنی مارکیٹ ویلیو کا کوئی عوض نہ ملے گا۔ البتہ اگر علامہ کرخیؒ کے قول پر عمل کیا جائے، کہ ہر حال میں دکانیں، مکانات اور یا باغات قابض کو دیے جائیں اور مالک کو زمین کی موجودہ قیمت دی جائے، تو دونوں کو برابر حق مل جائے گا۔ اور ایک حد تک دونوں نقصان سے بچ سکیں گے۔

یاد رہے:

اگر کسی قوم کی مشترکہ زمین ہو، مثلا: مشترکہ کاریز ہو، یا چراگاہ ہو اور کافی عرصہ کے بعد آبادکار کے خلاف دعوی دائر کیا گیا، تو دعوی ہر حال میں قابل سماعت ہوگا۔

تفصیل کے لیے: (المادہ: ۱۶۷۵ اور درالحکام: ج ۴، ص ۳۲۰)

(بلڈر اور کلائنٹ) Builder and Client

خرید و فروخت، یا کرایہ پر چیز دینے کے بارے شرعی ضابطہ یہی ہے، کہ چیز موجود ہو، ورنہ معدوم چیز کی نہ بیع صحیح ہے اور نہ ہی کرایہ پر دینا درست ہے۔

بلڈر نے پیشگی قیمت وصول کی ہے، اب یہ معلوم نہیں ہے، کہ کیا بلڈر (تعمیر کرنے والا) کلائنٹ (گاہک) کو بتائے گئے شرائط کے مطابق دکان بنا کر حوالہ کرے گا، یا نہیں۔ کیونکہ اگر معاہدہ کے مطابق دکان نہ بنائی۔ مثلا: محل وقوع، یا میٹریل اور تعمیری نقص وغیرہ میں اختلاف ہوا، تو کلائنٹ کو بیع مسترد کرنے کا شرعا حق حاصل ہے۔

لہٰذا خرید و فروخت کے بجائے وعدہ بیع کرے، کہ آپ کے لیے مثلا: فلان جگہ، فلاں قسم کی دکان بنا کر بیس لاکھ (20000) میں بنا کر دوں گا۔ اور کلائنٹ لینے کا وعدہ کرے۔ دکان شرائط کے مطابق بنائی گئی، تو خرید لے، ورنہ مسترد کرے۔

قال فی ''البدائع'':

''حکم الاستصناع فھو ثبوت الملک للمستصنع فی العین المبیعۃ فی الذمۃ، وثبوت الملک للصانع فی الثمن ملکا غیر لازم۔''

(فصل، واما صفۃ الاستصناع: 3/5)

تاہم کرایہ پر غیر موجود چیز دینا کسی صورت میں درست نہیں ہے۔

شریعت میں کسی موجود چیز سے ہلاک کیے بغیر نفع وصول کرنے کا نام اجارہ ہے۔اب اگر چیز ہی نہ ہو، تو اجارہ چہ معنی دارد۔۔۔؟

واضح رہے:

فقہاکرام نے یہاں تک لکھاہے: کہ موجود چیز کو صرف خوبصورتی کے لیے اور یالوگوں کو دکھانے کی خاطر کرایہ پر لینادرست نہیں ہے۔

''وشرعا(تملیک نفع مقصود)من العین (بعوض)حتی لواستاجرثیابا اواوانی ؛لیتجمل بھا اودابۃ لیجنبھا بین یدیہ او دارا لالیسکنھا اوعبدا اودراھم اوغیرذلک لالیستعملہ بل ؛لیظن الناس انہ لہ فالاجارۃ فاسدۃ فی الکل ،ولااجر لہ؛ لانھا منفعۃ غیرمقصودۃ من العین۔''

(الشامیۃ ،کتاب الاجارہ)

اور اگر بلڈر سے تعمیراور کرایہ کا عقدومعاہدہ بیک وقت ہورہاہو ،توصفقۃ فی صفقۃ (ایک بیع کے اندر دوسری بیع) کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔اوراس پرمزید یہ ہے کہ اس میں سود بھی ہے، کلائنٹ نے نقدرقم دے کر دکان وصول نہیں کی ہے اوروہ اپنی دی ہوئی رقم کے عوض کرایہ کی مد میں پیسے لیتاہے۔جو **کل قرض جرنفعا فھوربا۔** میں داخل ہونے کی وجہ سے جائز نہیں ہے۔

اسی طرح بلڈر سستی اورغفلت سے کام لیتاہو، توکسی اورذریعہ سے ان پر دباو ڈالیں ، تعزیرمالی (کرایہ وصول کرنے کی صورت میں) درست نہیں ہے۔بلڈر کی غفلت کاازالہ دوطریقوں سے ممکن ہے:

- کلائنٹ بلڈر سے یوں کہے :اگرسال کے اندردکان تعمیر کر کے حوالہ کیا، تومثلا: (2500000) پچیس لاکھ دوں گااوراگرسال کے بعد حوالہ کیا، تو (2000000) بیس لاکھ دوں گا۔اس کی مثال اجرت خیاط ہے۔
- دوران معاہدہ بلڈراپنے اوپرشرط لاگوکرے، اگرسال کے اندردکان تعمیر کر کے نہ دیا، تومثلا: (200000) دولاکھ رقم صدقہ کی مد میں جمع کروں گا۔اس کی مثال شرط جزائی ہے۔مذہب مالکیہ میں اس کی جواز ہے۔

تفصیل کے لیے: (اسلام اورجدید معیشت)

لہٰذا

- شریعت کی رو سے ایسا معاملہ جس میں تعمیر نہ ہونے پر بلڈر سے غیر تعمیر شدہ مکان کا کرایہ وصول ہونا بھی شامل ہو، جائز نہیں۔
- اور نہ بلڈر سے غفلت برتنے کی صورت میں سد باب کے طور پر کلائنٹ اس سے کرایہ لینا درست ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔

- حرام پیسوں سے حاصل شدہ منافع
- حرام پیسوں سے حج آدا کرنا
- غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین
- سود میں دارالحرب اور دارالکفر کا فرق
- دارالاسلام میں غیر مسلم کے ساتھ سودی لین دین
- بہنوں کو میراث نہ دینے والے کی مہمان نوازی وغیرہ قبول کرنا
- بہنوں کو میراث نہ دینے والے کا مسجد کی تعمیر میں چندہ دینا
- موروثی جائیداد سے ایک بھائی کا کاروبار میں نقصان کرنا
- موروثی جائیداد سے ایک بھائی کا سرمایہ کاری کرنا
- دکان مشترکہ میراث سے ہو، جب کہ مال تجارت اپنا ہو
- پیداواری اور طویل المیعاد قرضوں کا زکوۃ اور قربانی پر اثر

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

کیافرماتے ہیں مفتیان کرام مسائل ذیل کے بارے میں :

1 . ...ہمارے علاقے کے لوگ غیر مسلم ممالک میں وہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ سودی لین دین کرتے تھے'سود پر قرضے دیتے اور لیتے تھے'کچھ یہاں پاکستان میں غیر مسلموں سے سودی قرضے لیتے اور دیتے تھے'اب ان کی اولاد نے انہی رقم سے بڑے کاروبار بنائے ہیں'جو اگرچہ سودی کاروبار نہیں ہے'البتہ بنیادی رقم وہی گذشتہ سود کی ہے'اب پوچھنا یہ ہے :

- کیاان کا یہ کاروبار حلال ہے؟
- ان لوگوں کی زکوۃ اور فریضہ حج کا کیا حکم ہے؟
- ان کے لیے یہ رقم مساجد اور مدارس میں استعمال کرنا کیسا ہے؟
- کیااسی صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے مہتمم کے لیے ضروری ہے'کہ ان سے یہ پوچھے : کہ یہ رقم کہاں سے حاصل کی ہے؟

2 . ...یہاں پشت در پشت لوگ موروثی جائیداد سے منافع حاصل کرتے ہیں'بھائی بہنوں کو یکسر مسترد کر کے خاندانی میراث خود تقسیم کر کے مزید سرمایہ حاصل کرتے ہیں۔اب پوچھنا یہ ہے :

- کیاان لوگوں کی مہمان نوازی اور تحفہ وغیرہ قبول کرنا درست ہے؟
- ان لوگوں کے مساجد کی تعمیر'مدارس کے چندہ میں یہ رقم خرچ کرنا'حج اور زکوۃ کا کیا حکم ہے؟
- اگر کوئی بھائی یہ جائیداد بطریقہ میراث تقسیم کرنا چاہے'تو مناسخہ میں کس پشت کو مد نظر رکھ کر تقسیم کریں'کیونکہ یہ جائیداد کئی نسلوں سے اس کے پاس آئی ہے؟

3 . ...زکوۃ اور قربانی میں پیداواری قرضے اوریا وہ قرضے جو ضرورت کے بغیر تجارت کو فروغ دینے کے لیے طویل المیعاد لیے جاتے ہیں'ان کے متعلق شرعی نکتہ نظر کیاہے؟کیا یہ اصل سرمایہ سے منہاہوں گے'یانہیں ؟

الجواب حامداومصلیا

شریعت ہرحلال کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتی ہے،مادی دنیامیں اسباب کے تحت ہی انسان زندگی گزار سکتاہےاور اسے کسی نہ کسی کاروبار سے منسلک ہونا پڑتاہے،لیکن اس کا یہ مطلب ہرگزنہیں کہ انسان ہوس اور خواہشات پوری کرنے کے لیے حلال اورحرام کی تمیز نہ کرے، یہاں رہنے کے لیے آخرت کو سامنے رکھ کرزندگی گزارنے کی ہدایت دی جاتی ہے،آپ ﷺ کے ارشاد کے مطابق : مجھے دنیا سے کیا لینا دینا ہے، میری اوردنیا کی مثال اس راہی کی ہے،جو ستانے کی خاطر سایہ داردرخت کے نیچے بیٹھااور چلتابنا۔شاعرنے خوب کہاہے :

آب زیر کشتی پشت کشتی است

آب اندر کشتی ہلاک کشتی است

پانی کشتی کے نیچے ہو،توکشتی کو سہارا ملتاہے،لیکن اندرداخل ہونے سے کشتی غرق ہوتی ہے۔

اسلام ایک طرف سچے اورامانت دارتاجر کو انبیا علیہم السلام ،شہدااورنیک لوگوں کے ساتھ بروزحشر اٹھنے کی نوید سناتا ہے،نیک ،سچااورپرہیزگار تاجر کی حوصلہ افزائی کرتاہے،تودوسری طرف ناجائز اورحرام کاروبار کرنے والے کا بھرپور مذمت بھی کرتاہے۔حرام کاروبار کسی بھی شکل میں ہو،چاہے جواہو،قمار ہو،سٹہ بازاری ہو اوریا سود۔۔۔۔۔ سود قرآن ،سنت ،اجماع امت اور قیاس یعنی عقل اور نقل ہرلحاظ سے قطعی حرام ہے،دینے والا، لینے والا،لکھنے والا اور گواہ بننے والاسب اس گناہ کبیرہ میں شریک ہیں۔یہ اللہ تعالیٰ اوررسول مقبول ﷺ سے اعلان جنگ ہے،آقا دوعالم ﷺ کے فرمان کے مطابق : لوگوں پرایسازمانہ ضرورآئے گاکہ وہ سود کھائیں گے اوراگرسود نہ بھی کھائیں،تودھواں پہنچ جائے گا۔

زیرنظرمقالہ سودی لین دین اورحرام کاروبار کے متعلق ہے،ذیل میں سود کی قسمیں لکھی جاتی ہیں :

سود کی دوقسمیں ہیں :

نسیئۃ : شرط کے ساتھ قرض پرکچھ اضافہ کیاجائے۔

الفضل : ایک ہی جنس والی چیزوں میں ناپ تول کی کمی اور بیشی کی شرط لگانا۔

اول الذکر کی حرمت قرآن کریم سے،جب دوسری کی حرمت حدیث پاک سے ثابت ہے۔

یادرہے : سود کی حرمت دارالاسلام،دارالکفراوردارالحرب میں یکساں ہے۔

دارالحرب کی تعریف:

- کفراور شرک کے احکام نافذ ہوں۔
- دارالاسلام دارالحرب سے مل جائے۔
- اس میں کوئی مسلمان یا ذمی باقی نہ رہے۔

اور دارالحرب اسلامی احکام نافذ کرنے سے دارالاسلام بن جاتاہے۔ جیسے: نماز عیداور نماز جمعہ وغیرہ۔

''لاتصیردارالاسلام دارالحرب الا بأمورثلاثۃ:باجراالاحکام الشرک ،وباتصالھابدارالحرب،وبأن لایبقی فیھا مسلم اوذمی بالامان الاول علی نفسہ،ودارالحرب تصیردارالاسلام باجرا احکام اھل الاسلام فیھاکجمعۃ وعید۔''

(الدرمع ردالمحتار:ج ۴،ص ۱۷۵،ط:کراچی)

''لواجریت احکام المسلمین واحکام اھل الشرک ،لاتکون دارحرب۔''

(مذکورہ بالاماخذ)

امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نزدیک:

''لایجوز للمسلم فی دارالحرب الامایجوزلہ فی دارالاسلام۔''

(بدائع الصنائع: ج۷،ص ۱۳۲)

''ان حرمۃ الربا ثابتۃ فی حق العاقدین امافی حق المسلم فظاہر،وامافی حق الحربی فلأن الکفار مخاطبون بالحرمات ۔وقال تعالیٰ جل شانہ:واحذہم الربا وقدنھوا عنہ۔''

سود کی حرمت دونوں فریقین کے حق میں ثابت ہے،مسلمان کے حق میں تو واضح ہے،اور کفار کو بھی سود کی حرمت سے مخاطب کیے گئے ہیں۔

اللہ رب العزۃ کافرمان: کہ ان (یہودیوں) کے سود لینے کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی،حالانکہ ان کو سود سے منع کیا گیا تھا۔

(لاربا بین المسلم والحربی فی دارالحرب،اوکماقال ﷺ)

مذکورہ حدیث پرسرسری نظر:

- یہ روایت مجہول ہے،کسی صحیح سند،یا قابل اعتماد کتاب میں اسے روایت نہیں کیا گیاہے۔
- اور یہ احتمال بھی ہے: کہ لاربا کا مطلب: (یعنی سودی لین دین مت کرو) جیسے:

(فمن فرض فیھن الحج فلارفث ولافسوق ولاجدال فی الحج)

جو حج کے دنوں میں حج کی نیت کرے، وہ جماع اور ہم بستری کی باتیں نہ کریں۔۔۔۔

- قرآن میں سود کی حرمت مطلقاً ہے، اس پر کسی بھی خبر واحد سے زیادتی کی قید درست نہیں ہے۔

نوٹ: حضرت مفتی رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے میں توقف کرتا ہے، اور وہ یہاں مسلمان کا کسی مسلم اور یا غیر مسلم کے ساتھ سودی لین دین کو حرام قرار دیتے ہیں۔

(تفصیل کے لیے فتاوی رشیدیہ)

لہٰذا مسلمان خواہ دارالحرب میں ہو، یا دارالاسلام میں، اور وہ سودی معاملہ مسلم سے کرے، یا غیر مسلم سے، اس کی طرف سود کا حکم متوجہ رہے گا۔ اوران تمام صورتوں میں ان کی آمدنی حرام ٹھرے گی۔

(جامعہ علوم اسلامیہ، بنوری ٹاون، فتوی نمبر: 144301200157)

لہٰذا:

- مکمل سرمایہ، اکثر سرمایہ اور یا آدھا سرمایہ سودی رقم پر مشتمل ہونے سے، تو سارا سرمایہ حرام ہوگا۔

مال حرام سے حاصل ہونے والا منافع اور جائیداد کی بڑھوتڑی:

- پہلے بائع کو یہی حرام رقم دیا، بعد میں چیز خریدی۔
- پہلے چیز خریدی، بعد میں بائع کو حرام رقم دی۔
- پہلے چیز خریدی، بعد میں حرام رقم کے علاوہ کوئی اور رقم دی۔
- صراحت کیے بغیر مطلقاً خرید وفروخت کیا اور یہ حرام رقم دی۔
- پہلے کسی اور رقم سے چیز خریدی اور یہ حرام رقم دی۔

علامہ کرخیؒ کے نزدیک آخری تینوں صورتوں میں حاصل ہونے والا منافع حلال ہے، فقہا نے اسی پر فتوی دیا ہے۔

''رجل اکتسب مالامن حرام ثم اشتری ،فھذا علی خمسۃ اوجہ:اما ان دفع تلک الدراھم الی البائع اولا،ثم اشتری منہ بھا،او اشتری قبل الدفع بھاودفعھا،اواشتری قبل الدفع ودفع غیرھا،اواشتری مطلقا ودفع تلک الدراھم،او اشتری بدارھم اخرودفع تلک الدراھم۔قال ابو نصر:یطیب لہ ولایجب علیہ ان یتصدق الا فی الوجہ الاول ،والیہ ذہب ابو اللیثؒ ،لکن ھذا خلاف ظاہرالروایۃ ؛فانہ نص فی الجامع الصغیر:اذا غصب الفا فاشتری بھا جاریۃ وباعھا بالفین تصدق بالربح ۔وقال الکرخیؒ

:فی الوجہ الاول والثانی لایطیب ،وفی الثلاث الاخیرۃ یطیب ،وقال ابوبکرؒ :لایطیب فی الکل ۔لکن الفتوی الآن علی قول الکرخیؒ دفعا للحرج۔''

(ردالمحتار:مطلب:اذااکتسب حراما ثم اشتری علی خمسۃ اوجہ)

خریدار عموما صراحت کیے بغیر چیز خریدتا ہے'تو اس پر حاصل ہونے والا منافع درست ہوگا'البتہ حرام مال دینے سے گناہ گار ضرور ہوگا' بائع چونکہ حلال چیز دیتا ہے'اس کے لیے رقم لینادرست ہوگا'تاہم اگر وہ جانتا ہو'کہ مشتری کا اکثر مال حرام ہےاوریامشتری نے حرام ہونے کی صراحت کی ہو'تو پھر رقم لینادرست نہیں ہے۔

تفصیل کے لیے : (فتاوی قاسمیہ : ج ۱۹)

کاروبار کی ابتدامیں جتناحرام مال لگاہے'اس کے بقدر رقم بغیرنیت ثواب کے صدقہ کردیں'توباقی مال پاک ہوجائے گا۔

(دارالافتااخلاص کراچی'عنوان : حرام کاروبار سے حاصل شدہ آمدنی سے حلال کاروبار کرنا'فتوی نمبر : ۱۵۱۱)

(دارالافتاعثمانیہ 'پشاور'فتوی نمبر : ۴۷۱۸'عنوان : حرام مال سے کمائے ہوئے منافع کا حکم)

(دارالافتاجامعہ بنوریہ 'عنوان : حرام مال سے کاروبار کا حکم)

یادرہے : علامہ کرخی رحمہ اللہ کے قول پر بوقت ضرورت ہے 'ورنہ اصول کے مطابق نہ حرام مال حلاہے اورنہ ہی اس کا منافع حلال ہے۔

- حرام مال میں زکوۃ نہیں ہے'بلکہ اس کو بغیرکسی ثواب کی نیت کے صدقہ کرنا واجب ہے۔جبکہ فریضہ حج آداہوگا'تاہم ثواب سے محروم ہوگا۔

لمافی الشامیۃ:

''ولذا قال فی البحر:ویجتہد فی تحصیل نفقۃ حلال ؛فانہ لایقبل بالنفقۃ الحرام کماوردت فی الحدیث مع انہ یسقط الفرض عنہ معہا،ولاتنافی بین سقوطہ وعدم سقوطہ ،فلایثاب ؛لعدم القبول ،ولایعاقب عقاب تارک الحج۔''

(ج ۳'ص ۵۱۹'مطلب : فیمن حج بمال حرام'ط : رشیدیہ)

(کذافی الحقانیہ : ج ٦'ص ۳۳۰'کتاب الشرکۃ'ط : حقانیہ)

- ان کے لیے یہ رقم مساجد اورمدارس میں استعمال کرناکسی طرح درست نہیں ہے۔
- جہاں سودی لین دین ہو'وہاں مہتمم کے لیے چندہ لینے کے دوران چھان بین ضروری ہے'البتہ صرف توہم اورشک کی بنیادپر تحقیق کرناضروری نہیں ہے۔

صورت مسئولہ کا جزدوم:

واضح رہے:

باپ کے انتقال کے بعد بہن اور بھائیوں کے درمیان عموماشرکت ملک ہوتی ہے،اس شرکت میں ہرایک دوسرے کے حصہ میں اجازت کے بغیر اجنبی ہوتاہے۔تاہم ایک شریک کی رضامندی اوراجازت سے دوسرے شریک کا تصرف کرنادرست ہے۔

اور شرکت ملک کا قانون:

’’وکل منهماأجنبی فی نصیب الآخرحتی لایجوز التصرف فیہ الاباذن الآخر،کغیرالشریک؛لعدم تضمنهما الوکالۃ.....‘‘

(مجمع الأنہر،کتاب الشرکۃ:543/2ط:دارالکتب العلمیۃ،بیروت)

(ماخوذازدارالعلوم دیوبند:شرکت اوربٹوارہ کابیان:52/13)

"وکل مااستدانہ أحدهم،یطالب بہ وحدہ۔"

(الشامیۃ:ج٦،ص ٤٧٢)

"وماشتراہ أحدهم لنفسہ ،یکون لہ ویضمن حصۃ شرکائہ من ثمنہ اذا دفعہ من المال المشترک‘‘

(مذکورہ بالاماخذ:ج ٦،ص ٤٧٢)

"اذابذر بعض الورثۃ الحبوب المشترکۃباذن الکبار أو وصی الصغارفی الارض المورثۃ ،تصیرجملۃ الحاصلات مشترکۃ بینهم،وأما لوبذر أحدهم بغیراذن بقیۃ الورثۃ،فالغلۃللزارع فقط۔۔ولکن لوبذر أحدهم لنفسہ،فالحاصلات لہ خاصۃ،لکنہ یضمن لبقیۃالورثۃ حصتهم ممانقصت الأرض بزراعتۃ۔"

(المجلہ:مادہ ١٠٨٩)

میراث میں چونکہ بہن اور بھائی سب شریک ہیں،قرآن کریم میں بھائی کے ساتھ بہن کی میراث کا بھی ذکر ہے،جہاں تک اصول میں سے جس کے بارے میں یقینی طور معلوم ہو،کہ اس نے بہنوں کو حصہ نہیں دیاہے اور کل ترکہ ،ورثا بھی یقینی طور معلوم ہوں،تووہاں سے اصول مناسخہ کے مطابق تمام زندہ ورثہ کے حصص متعین کرناضروری ہے۔

یبدامن ترکۃ المیت الخالیۃ عن تعلق الغیربعینها

(الدرالمختار،کتاب الفرائض ،ج١٠،ص٤٩٣،ط:دارالکتب)

’’والحاصل :انہ ان علم ارباب الاموال ،وجب ردہ علیهم والا فان علم عین الحرام لایحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ۔‘‘

(ردالمحتار،کتاب البیوع،باب البیع الفاسد،مطلب: فیمن ورث مالا حراما)

تفصیل کے لیے:

(دارالافتا،جامعہ عثمانیہ ،پشاور،فتوی نمبر: ٣٢٣-٢٩٧-٢١٦٢)

کسی بھی وارث کواجازت لیے بغیر دوسرے کے حصہ میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے'اب مثلا: اگر بھائی مشترکہ موروثی جائیداد میں کاروبار کر کے ترقی کرتے ہیں'تواس کی چند صورتیں ہیں:

- بہن اور بھائی سب تجارت پر راضی ہوں'تواس صورت میں منافع سب کے درمیان برابر شریک ہوگا'البتہ محنت کرنے والے دوسروں کی باہمی رضامندی سے اپنے لیے اضافی اجرت اوریا منافع کے فیصد میں اضافہ کرسکتے ہیں۔
- اوراگرسب کی طرف سے اجازت نہ ملی ہوں'توکام کرنے والے بھائی اگرسب بہن اور بھائیوں کی نیت کر کے تجارت کرتے ہوں'تب بھی منافع میں سب شریک ہوں گے۔
- اوراگر بھائیوں نے موروثی جائیداد میں تصرف بہنوں کی اجازت کے بغیر کیاہو اور دوران تجارت بہنوں کی نیت بھی نہ کی ہوں'تومنافع ان کے حصہ کے بقدران کے لیے درست ہوگا۔اور بقایا کاملک خبیث ہونے کی وجہ سے بغیرنیت ثواب کے صدقہ کرناواجب ہوگا۔
- تاہم اگراصل ورثہ کومنافع حوالہ کریں'تودرست رہے گا۔
- اگراپنامال منافع سمیت اور دیگرورثہ کے مجموعی سرمایہ اور منافع سے کم ہواوریابرابر ہو'توورثہ کوہر حال میں اپناحق دینالازمی ہے اورملک خبیث کی وجہ سے اس کا ساراسرمایہ حرام پر مشتمل ہے۔لہٰذااس کا ملک خبیث میں تصرف اپنے حصہ تک درست ہوگا'دیگرورثہ کے حصہ میں کسی طرح درست نہیں ہے۔
- اگرمخلوط مال حلال اور حرام (سود'غصب اور رشوت وغیرہ) پر مشتمل ہو'اوراس میں تمیز ہوسکے'توحرام مال اصل مالکوں کولوٹانالازمی ہے۔
- اگرمالکان معلوم نہ ہوں'توثواب کی نیت کیے بغیر صدقہ کرناضروری ہے۔
- اورمخلو ط مال جدانہ ہوسکے 'تو اس کا صدقہ وغیرہ اپنے حصہ کی حدتک درست ہے'(البتہ اجتناب بہترہے۔)تاہم جن لوگوں کو علم ہو'کہ اس کی آمدن حلال اور حرام مال دونوں پر مشتمل ہے'حرام مال زیادہ یابرابر ہو'تو ان کے لیے ہدیہ قبول کرنااوریاضیافت قبول کرناکسی طرح درست نہیں ہے۔
- اوراگرغالب مال حلال ہو'یالینے والے کو اس کی حرام آمدنی کا علم نہ ہو اوریا وہ صراحت کرے'کی یہ ہدیہ وغیرہ حلال مال سے ہے۔تب اس کے لیے وصول کرنادرست ہے۔

- اوراگر کارخیر میں یہی ملک خبیث خرچ کرے ،لیکن بعد میں ورثہ کو اپنا حق دیدے ،تو ساراصدقہ درست ہوگا۔اوراس کی ملک صدقہ دینے کے دوران سمجھی جائے گی ،گویا کہ اس نے اپنی ہی ملک سے صدقہ اور یا حج وغیرہ آد کیا۔
- اوراگراجازت لیے بغیر نقصان ہوا،تو یہ خسارہ انہی کے حصہ میں شمار ہوگا۔
- نوٹ : حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ العالی نے فقہ البیوع میں لکھاہے :

کہ مخلوط مال والے کی ضیافت یاہدیہ قبول کرنے میں جو تفصیل ہے ،کہ مال حرام غالب ہو ،یابرابر تو ہدیہ وغیرہ قبول نہیں کرناچاہیے۔۔۔۔۔۔یہ اس وقت ہے ،جب مخلوط مال ممیز ہو ،البتہ یہ معلوم نہ ہو ،کہ کونساحلال ہے اور کتناحلال ہے۔اوراگر مخلوط مال ممیّز ہی نہ ہو ،تو پھر مالک کے اپنے حصہ سے ضیافت یاہدیہ وغیرہ قبول کرنادرست ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

تفصیل کے لیے : (فقہ البیوع : ج۲ ،ص ۱۰۳۲)

والحجۃ علی ماقلناہ:

''لانہ اماغاصب اومستودع ،وکل منہما استربح فیمافی یدہ لنفسہ ،یکون ربحہ لہ ،لا للمالک،لکن یملکہ ملکا خبیثا سبیلہ التصدق علی الفقرا۔''

(شرح المجلۃللاتاسی، ج۴ ،ص ۳ ،مادہ: ۱۰۹۰ ،ط: رشیدیہ)

''اذا اخذ احدالورثۃ مبلغا من الدراہم من الترکۃ قبل القسمۃ بدون اذالآخرین ،وعمل فیہ وخسر ،فتکون الخسارۃ عائدۃ الیہ ،کمالوربح فلایسوغ لبقیۃ الورثۃ طلب حصۃ منہ۔''

(المجلۃ،ص ۲۱۰ ،مادہ ۱۰۹ ،ط: قدیمی)

''والحاصل:انہ یجب علی الغاصب ان یتصدق بہذا الربح والغلۃ علی مذہب ابی حنیفۃ ومحمدرحہما اللہ تعالیٰ وھو المختار ویجوز لہ ایضا ان یسلم الربح اوالغلۃ الی المغصوب منہ کمامر عن الزیلعی ،ومثلہ فی الفتاوی الھندیۃ:عن المحیط ان لہ الخیار بین ان یتصدق اویرد الاجرۃ الی المغصوب منہ ''۔

(فقہ البیوع ،ج۲ ،ص ۱۰۴۴ ،المبحث العاشر ،ط : معارف القرآن)

قال فی فقہ البیوع:

''ومذہب الحنفیہ ان الغاصب بعدآدالضمان یملک المغصوب ملکا مستندا الی وقت الغصب۔''

(ج۲ ،ص ۱۰۴۲ ،المبحث العاشر ،ط : معارف القرآن)

''لان المغصوب ان علمت اصحابہ ،او ورثتہم ،وجب ردہ علیہم والا وجب التصدق بہ۔۔۔''

(مطلب:فیمالوصدر السلطان جائرا فتوی بذلک آدالزکاۃ:ج۲ ،ص ۲۹۱ ،ط:دارالفکر)

''وان کان مالامختلطا مجتمعا من الحرام ،ولایعلم اربابہ ولاشیئا منہ بعینہ ،حل لہ حکما،والاحسن دیانۃ التنزہ عنہ۔۔۔''

(الشامية،كتاب البيوع،باب البيع الفاسدمطلب:فيمن ورث مالاحراما)

ففى البزازية:

''ماياخذ من المال ظلما،ويخلطه بماله وبمال مظلوم آخريصيرملكا له،وينقطع حق الاول ،فلايكون اخذه عندنا حراما محضا۔''

(قبيل الزكوة)

(كذا فى الشامية:كتاب الزكوة،ج٣،ص ٢١٧،ط:زكريا)

(کذافی فتاوی عثمانیہ'کتاب الشرکۃ : ج٧'ص ٣٨'٣٧)

(دارالافتا'جامعہ علوم اسلامیہ'بنوری ٹاؤن'فتوی نمبر : ١٤٤٠١٢٢٠١٧٦٤)

(دارالافتا والاخلاص'کراچی)

حرام آمدنی سے خریدا ہوا مکان کو وقف کرنا جائز ہے۔

(فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'وقف کا بیان : ج١٣'ص١٤٠)

تقسیم ترکہ سے قبل مسجد یا مدرسہ کو چندہ دینا اور یا صدقہ وخیرات وغیرہ کرنا وارث کی ذاتی تصرفات کی حد تک درست ہیں'اور اس کے لیے ہر ایسا تصرف کرنا درست نہیں ہے'جس سے دیگر ورثا کو نقصان پہنچے۔ اور نہ ہی اس کو ایسے تصرفات پر اجر ملے گا۔

<u>یاد رہے :</u>

اگر ایک بھائی نے مشترکہ موروثی جائیداد سے اجازت لیے بغیر دوکان بنائی'اس میں ذاتی سرمایہ سے سامان تجارت رکھا'اس سے حاصل ہونے والا منافع اس کے لیے حلال ہے'کیونکہ مشترکہ سرمایہ کی خباثت دکان کی حد تک تو درست ہے'البتہ مال تجارت سے حاصل ہونے والا نفع مشترکہ مال سے حاصل شدہ نہیں ہے۔

''غصب حانوتا واتجر فيه وربح يطيب الربح ،كذافى الوجيز للكردرىؒ ۔''

(الفتاوى الهندية،كتاب الغصب،الباب الثامن:ج٥،ص ١٤٢)

لہٰذا :

- یہ لوگ چونکہ غاصب ہیں'جن کا سرمایہ حرام اور حلال مال دونوں سے مخلوط ہے'اب اگر اصل سرمایہ اور منافع سمیت ملا کر غصب شدہ مال سے کم'یا برابر ہے'تو مال حرام کے غالب ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی مہمان نوازی اور تحفہ وغیرہ قبول کرنا کسی صورت جائز نہیں ہے۔
- ان لوگوں کے مساجد کی تعمیر'مدارس کے چندہ میں یہ رقم خرچ کرنا'حج اور زکوۃ ادا کرنا اپنے سرمایہ کی حد تک درست ہے'دوسرے کے حصہ میں وہ غاصب شمار ہوگا'جس کا ہر حال میں حوالہ کرنا ضروری ہے۔

- اگر کوئی بھائی یہ جائیداد بطریقہ میراث تقسیم کرنا چاہے' تو مناسخہ میں جس اصل کے بارے میں یقینی طور معلوم ہو'کہ اس نے بہنوں کو میراث نہیں دیا ہے اور کل ترکہ بھی یقینی طور معلوم ہو'تو وہاں سے مناسخہ کا حکم ہو گا۔

پیداواری اور تجارتی قرضے :

ویسے تو شرعی اصول کے مطابق اصل سرمایہ سے قرضے نکال کر بقایا سرمایہ پر زکوۃ اور قربانی کا حکم لگتا ہے'لیکن کاروبار کی وسیع تر اقسام اور طویل قرضوں اور لمبے قسطوں کے پیش نظر متاخرین نے فتوی میں ترمیم کی ہے :

کہ ضرورت کی خاطر لینے والے قرضے اصل سرمایہ سے منہا ہوں گے'جب کہ غیر ضروری پیداواری اور طویل المیعاد قرضے 'یا طویل قسطوں میں ایک سال کی مدت کا اعتبار ہو گا'فقہا نے اس کو مہر مؤجل کے درجہ میں رکھ کر غیر مانع قرار دیا ہے۔

لہٰذا ایک سال کی بقدر قرض'یا قسطیں منہا کرنے کے بعد نصاب کے پورا ہونے پر زکوۃ اور قربانی واجب ہو گی۔

''وزاد القہستانی عن الجواہر:والصحیح انہ غیرمانع۔''

(ردالمحتار : ج ۳'ص ۱۷۷'ط : الریاض)

''وقال بعض مشائخنا :ان المؤجل لایمنع؛لانہ غیرمطالب بہ عادۃ۔''

(بدائع الصنائع : ج ۲'ص ۳۸۴'ط : بیروت)

''وذکرالبزدوی فی شرح الجامع الکبیر،قال مشائخنا:فی رجل علیہ مہرمؤجل لامراتہ ،وھو لایرید آدئہ ،لایجعل مانعا من الزکاۃ ؛لعدم المطالبۃ فی العادۃ،وانہ حسن ایضا۔''

(الفتاوی الھندیۃ : ج۱'ص ۱۹۰'ط : بیروت)

نوٹ : معاصر علما کرام نے اسی پر فتوی دیا ہے۔البتہ فتاوی قاسمیہ میں فتوی عام اصول کے مطابق دیا گیا ہے'کہ ہر قرض منہا کیا جائے گا چاہے اس کا فوری مطالبہ کیا جاتا ہو اور یا لمبے قسطوں میں کیا جاتا ہو۔

تفصیل کے لیے : (فتاوی قاسمیہ : ج ۱۰'ص ۳۷۸)

جب کہ بعض فقہا پیداواری اور تجارتی فروغ کے لیے حاصل ہونے والے قرضوں میں یوں تفصیل کرتے ہیں :

اگر ان قرضوں سے اموال تجارت (قابل زکوۃ اموال) خریدے گئے 'تو اصل سرمایہ سے منہا ہوں گے اور اگر اس سے اوزار'مشینریاں وغیرہ خریدی گئیں'تو یہ قرضے اصل سرمایہ سے نہیں نکالے جائیں گے۔

(ماہانہ الابرار ‘اگست ۲۰۱۰)

فتاوی عثمانی میں حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں :

کہ پیداواری قرضوں پر شوافع کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے ‘کہ کسی بھی قسم کا قرض منہانہ ہو گا۔

(قرضوں کا مسئلہ : ج۲‘ص۸۳)

تینوں رائے کو سامنے رکھ کر راقم الحروف کی نظر میں تیسری رائے راجح معلوم ہوتی ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

سید کلیم اللہ حرمزئی۔